مطالعۂ پاکستان

نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے



ار سنز ۱۹-۱ اردو بازار، لاہور

برائے: پنجاب ٹیکسٹ بُک بورڈ، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ○
(المؤمن : ۱۹)

(۲) تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ○ (المائدة : ۲)

(۳) لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَقَاطَعُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَلَا تَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ (متفق علیه)

ترجمہ

(۱) وہ (اللہ) آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو (باتیں) سینوں میں پوشیدہ ہیں (ان کو بھی)۔

(۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دُوسرے کی مدد کیا کرو مگر گناہ اور ظلم کی باتوں میں (کسی سے) تعاون نہ کیا کرو۔

(۳) آپس میں نہ بُغض رکھو۔ نہ باہم حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرو اور نہ باہم قطع تعلّق کرو بلکہ اللہ کے بندے (اور) بھائی بھائی بن جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین (دن سے) زیادہ چھوڑے رکھے

مُطالعۂ پاکستان

(نو ترمیم شدہ ایڈیشن)

نویں دسویں جماعتوں کے لیے

ناشر

اِظہار سنز

۹ - اُردو بازار ، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بُک بورڈ ، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن نمبر	تعداد اشاعت
مارچ ۱۹۷۵ء	دوم	پچاس ہزار

★

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ و منظور شدہ بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن

لاہور ، بموجب سرکلر نمبر 3238—SE/G Dated 8.4.72

ملتان ، بموجب سرکلر نمبر SY (SSC)—3/ASG/72Dated 1.4.72

سرگودھا ، بموجب سرکلر نمبر 1538—2138 Dated 8:4.72

مؤلفین

ڈاکٹر عبدالحمید

سابق صدر شعبہ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

عبدالغفور چوہدری

بی - اے (آرنرز) لندن ، ایم - اے - ایم - ایس سی (علیگ)

سابق پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج ، لائل پور

نگرانِ تدوین و تصحیح

چوہدری محمد سلیم اختر

ماہر مضمون پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

ناشر : سید اظہارالحسن رضوی

اظہار سنز ۱۹ ، اردو بازار ، لاہور

مطبع : مطبع عالیہ ، ۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

باب ۱

پاکستان کی قدیم تہذیب

قائد اعظم مرحوم نے پاکستان کے ماضی ، حال اور مستقبل کو نہایت جامع اور بلیغ انداز میں سمیٹتے ہوئے فرمایا "پاکستان صدیوں سے موجود تھا ، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا" اگرچہ پاکستان بظاہر ۱۹۴۷ء میں بنا ، لیکن ان علاقوں کی تاریخ جو آج پاکستان میں شامل ہیں ، ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے بنتی اور سنورتی چلی آئی ہے - اس کی سب سے پرانی داستان وادیٔ سون کے پتھر کے وہ اوزار سناتے ہیں ، جن کو پتھر کے زمانے کا قدیم انسان ، استعمال کرتا تھا ۔ اس کی قدامت کی کہانی ان مُہروں اور خوبصورت ظروف کی نقاشی میں ملتی ہے - جو موئن‌جوڈرو اور ہڑپہ کے دبے ہوئے شہروں سے ملے ہیں - پتھر کے اتنے قدیم اوزار اور پرانے زمانے کے ایسے عظیم شہر ، پورے برصغیر میں کہیں اور نہیں پائے جاتے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علاقے جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں ، جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے ہمیشہ ہندوستان سے علیحدہ رہے ہیں - ان کے اپنے طبعی حالات ہیں اور اپنی الگ تاریخ ہے جو ہندوستان کی تاریخ سے بہت مختلف ہے -

تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے پاکستان کا رابطہ مسلم ممالک کے اس عظیم سلسلے سے ہے جو پاکستان سے شروع ہو کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک چلا گیا ہے - تہذیب و تمدن کے لحاظ سے پاکستان کا وسط ایشیا کے علاقے سے بھی بہت گہرا رابطہ رہا ہے -

پاکستان ایک الگ ملک رہا ہے

اس طرح زمانہ قدیم ہی سے وہ علاقے جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں، ہندوستان سے علیٰحدہ رہے ہیں۔ ہندوستان کا قدیم نام "آریہ ورت" تھا۔ "آریہ ورت" کے تعلقات دوسرے ملکوں کے ساتھ بہت کم تھے۔ آریہ ورت کا کوئی شخص اگر کسی دوسرے ملک کا سفر کرتا تو مذہبی لحاظ سے گناہ تصور کیا جاتا اور ایسے شخص کو کفارہ کے طور پر قربانی کرنی پڑتی تھی۔ آریہ ورت کے باشندے موجودہ پاکستان کے علاقوں کو ہمیشہ غیر ملک ہی شمار کرتے رہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے ایک عالم بدھیانا نے اپنی کتاب میں آریہ ورت کی حدیں قائم کر دی تھیں۔ یہ ملک ہندوستان کی ریاست بہار سے شروع ہو کر دریائے سرسوتی تک پھیلا ہوا تھا۔ دریائے سرسوتی جس کو بعد میں دریائے گھگر کہا جانے لگا، ہندوستان کی ریاست ہریانہ میں ہے۔ بدھیانا کے کہنے کے مطابق آریہ ورت کی جنوبی سرحد، بندھیا چل تک تھی۔

پاکستان کی قدیم تاریخ

آج سے لاکھوں برس پہلے زمین کا بہت سا حصہ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ برف پگھلتی گئی اور اس کے نیچے کی زمین پر نباتاتی اور حیواناتی زندگی کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے۔ برف کے زمانے کے بعد جب انسانی زندگی کا آغاز ہوا تو انسان کو رہنے سہنے کی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ اس کے پاس کسی قسم کے اوزار بھی نہ تھے۔ بارش اور ہوا کے طوفانوں سے بچنے اور درندوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ غاروں میں پناہ لیتا یا کسی بڑے درخت کی کھوہ میں بسیرا کرتا تھا۔ لیکن صدیوں بعد اسے اشیا کی حقیقت کا کچھ اندازا ہونے لگا تو اس نے روزمرّہ کی ضرورت کے لیے اوزار بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ سب سے پہلے اس نے پتھر کا استعمال کیا۔ پتھر کے یہ اوزار بہت بھدے اور ان گھڑ قسم کے

تھے ، اس دور کو "پتھر کا قدیم زمانہ" کہتے ہیں - یہ زمانہ آج سے تین سے پانچ لاکھ سال پہلے ہو گزرا ہے - پھر انھی پتھر کے اوزاروں میں مزید ترقی ہوئی اور پتھر کے یہ اوزار زیادہ صاف اور سڈول ہوتے گئے ، اس دور کو "پتھر کا جدید زمانہ" کہتے ہیں - اس کے بعد انسان نے تانبے اور کانسی کا استعمال سیکھ لیا ، اس کو "دھات کا زمانہ" کہتے ہیں -

پاکستان میں قدیم زمانے کے پتھر کے اوزار پائے گئے ہیں - ان کا زمانہ آج سے کوئی تین لاکھ سال پہلے کا ہے - ہندوستان میں آثار قدیمہ کی آج تک جتنی کھدائیاں ہوئی ہیں ، ان میں سے سب سے پرانے اوزار جو ملے ہیں وہ پتھر کے جدید زمانے کے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں انسانی زندگی کا آغاز سب سے پہلے ان علاقوں میں ہوا جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں -

صوبہ پنجاب میں یہ اوزار دریائے سون کے آس پاس ملے ہیں - یہ دریا، دریائے سندھ کا معاون ہے اور سطح مرتفع پوٹھوار میں سے بہتا ہوا دریائے سندھ میں جا گرتا ہے - پتھر کے ان اوزاروں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ایک کنارہ اتنا تیز ہے کہ اس سے چیزیں کاٹی جا سکتی ہیں -

اس دور کے انسان کا گزارا اکثر شکار پر تھا - وہ شکار کیے ہوئے جانوروں کے گوشت کو ان پتھروں سے کاٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیا کرتا تھا - اسی طرح اور چیزوں کے کاٹنے میں بھی وہ پتھر کے کلہاڑے سے مدد لیتا تھا - ان اوزاروں میں سے بعض پتھر ایک چھوٹی 'موگری' کی شکل کے ہیں - ان کا ایک سرا کافی چوڑا اور گول ہے اور دوسرا سرا لمبوترا ہوتا چلا گیا ہے - پتھر کا یہ اوزار اس دور کے انسان کے لیے چیزوں کو کوٹنے پیٹنے کا کام دیتا تھا - خیال کیا جاتا ہے کہ شکار کے علاوہ اس زمانے کا انسان ، پودوں کی جڑوں اور جنگلی پھلوں سے بھی پیٹ بھرتا ہوگا

اور اوزار ان کو توڑنے اور باریک کرنے کے کام آتے ہوں گے ۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب

ابتدا میں انسان ایک جگہ قیام کرنے کی بجائے گروہوں کی صورت میں گھومتا پھرتا رہا ، لیکن جب یہی گروہ جگہ جگہ رہنے بسنے لگے تو بستیاں اور گاؤں وجود میں آئے ۔ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ترقی کر کے بڑے بڑے شہر بن گئے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بانی تھے ۔ یہ تہذیب آج سے پانچ ہزار سال پہلے ان علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی ، جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں ۔ اس کے آثار ہڑپہ ضلع ساہیوال اور موئن جوڈرو ضلع لاڑکانہ میں پائے گئے ہیں ۔ ۱۹۲۲ء کے بعد آثار قدیمہ کے ماہروں نے ان شہروں کو اپنی نگرانی میں کھدوایا ۔ ان دونوں شہروں کے درمیان تقریباً چار سو میل کا فاصلہ ہے ، لیکن ان کی بناوٹ اور طرزِ تعمیر میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ ان کے مکان پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں ۔ ہر مکان میں صحن اور پانی کے نکاس کا اچھا انتظام ہے ۔ دشمن کے حملے سے بچنے اور موسمی طغیانی سے شہروں کو محفوظ رکھنے کے معقول انتظامات موجود ہیں ۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس زمانے میں وادیٔ سندھ کے باشندے کون سی زبان بولتے تھے ۔ ان شہروں سے بہت سی مہریں اور برتن ملے ہیں ۔ مہروں پر کچھ تحریریں بھی ثبت ہیں، لیکن ابھی تک ان کا مطلب واضح نہیں ہو سکا ۔ برتن مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر سیاہ نقش و نگار ہیں ۔ وادیٔ سندھ کے باشندوں کے عقائد اور مذہبی رسوم کے متعلق بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں ۔ اس معاشرے میں سرکاری قاعدوں اور ضابطوں کی بھر مار تھی ۔ سرکاری افسر منڈیوں اور بازاروں میں اکثر جا کر باٹ تول اور پیمانوں کی جانچ پڑتال کیا کرتے تھے ۔ لوگ کھیتی باڑی پر گزارا کرتے تھے ۔ روئی ، گندم اور جو یہاں کی خاص پیداوار تھی ۔ اناج

کو سرکاری گوداموں میں جمع کیا جاتا تھا ۔ قبرستان شہر سے کچھ فاصلے پر بنائے جاتے تھے ۔

ہڑپہ اور موئن جوڈرو کی تہذیب کے آثار ان تمام علاقوں کے طول و عرض میں پائے جاتے ہیں جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں ۔ ۱۵۰۰ ق ۔ م کے قریب آریاؤں نے ان علاقوں پر حملہ کر کے اس تہذیب کو تباہ کر دیا اور یہاں کے باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

موئن جوڈرو کی کھدائی میں ایک جگہ مردوں کے بہت سے ڈھانچے ملے ہیں ۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ اس شہر کے باشندوں کا آخری قتلِ عام تھا ۔ اس کے بعد یہ شہر کبھی آباد نہ ہو سکا ۔

آریاؤں کے حملوں کا "رگ وید" میں بھی ذکر ہے ۔ آریاؤں کی اس مذہبی کتاب میں ان شہروں کا نام "پور" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ "پور" کے معنی ایسے قلعے کے ہیں جس کے گرد مضبوط فصیل ہو ۔ ہڑپہ میں قلعہ کی بنیادیں اور شہر کی فصیل کے آثار پائے گئے ہیں ۔ رگ وید میں لکھا ہے کہ آریاؤں کے "اندر دیوتا" نے "دیو داسو" یعنی دیوتا کی پوجا کرنے والوں کی مدد کی اور نوّے قلعے پاش پاش کر دیے ۔

آریاؤں کی آمد

وادیٔ سندھ اور پنجاب کی اس عظیم الشان تہذیب کو تباہ و برباد کرنے والے آریا ، وسط ایشیا سے آئے تھے ۔ ان کے قد لمبے اور رنگ صاف تھے ۔ یہ ایک زمانے میں وسط ایشیا کے وسیع میدانوں میں جانوروں کے گلّے چراتے اور ان کے دودھ اور گوشت پر گزارا کرتے تھے ۔ آریا ، درۂ خیبر کے راستے اس سر زمین میں داخل ہوئے ، جسے آج کل پاکستان کہتے ہیں اور کچھ مدت کے لیے پنجاب اور وادیٔ سندھ میں قیام پذیر ہو گئے ۔ آریاؤں کے لیے اس نئے دیس میں دلکشی تھی ۔ ان کے اپنے وطن میں بہت

سخت سردی پڑتی تھی ، لیکن یہاں کی آب و ہوا اس کے مقابلے میں خوشگوار تھی ۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر وہ 'صبح کی دیوی' کے گیت گاتے تھے ۔ ان کے مذہبی گیتوں کی سب سے اہم کتاب بھی اسی سر زمین میں لکھی گئی ۔ وہ اس کتاب میں صوبہ سرحد ، پنجاب اور سندھ کے دریاؤں میں سے ایک ایک کا نام لے کر ذکر کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ رگ وید میں بھی یہاں کی بعض ندیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ گمان ہوتا ہے کہ انہیں دریاؤں کے کنارے کی زندگی پسند آئی ہو گی ۔ اسی لیے وہ دریائے راوی کو "نشاط انگیز" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں ۔

یہاں آریاؤں کو ایسے تمدن سے سابقہ پڑا جو ان کی اپنی تہذیب سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا ۔ آریا صرف ابتدائی قسم کی کھیتی باڑی جانتے تھے ۔ ان کے ہاں وادیٔ سندھ جیسی اعلیٰ قسم کی صنعتیں بھی نہیں تھیں ۔ انہیں ایسے شہروں کا بھی تصور نہ تھا جو موئن جوڈرو یا ہڑپہ جیسے بڑے ہوں اور جنہیں کسی باقاعدہ نقشے کے مطابق بنایا گیا ہو ۔ البتہ ان میں ایک نئی بات ضرور تھی کہ وادیٔ سندھ کے باشندوں نے ابھی تک گھوڑے کو پالتو جانور کے طور پر نہیں سدھایا تھا ۔ آریا گھوڑے پالتے اور انہیں رتھوں میں جوتتے تھے ۔ انہی رتھوں میں بیٹھ کر وہ دشمنوں سے جنگ کرتے تھے ۔ آریاؤں نے وادیٔ سندھ کے باشندوں کے خلاف جنگ میں اسی حربے کی بدولت کامیابی حاصل کی ۔ وہ اپنے گیتوں میں یہاں کے پہلے باشندوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں ۔ وہ ان کو دیوتاؤں کو نہ ماننے والے ، قانون شکن ، دشمن کی بولی بولنے والے اور نکٹے کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں ۔ نکٹے سے مراد چپٹی ناک والے ہیں ۔ وہ اپنے گیتوں میں بتاتے ہیں کہ ان کے یہ راکشش (دشمن) ایسے قلعوں میں پناہ لیتے تھے جن کے گرد فصیل ہوتی تھی ۔ ویدوں کے زمانے کی سب سے مشہور جنگ ، دس راجاؤں

کی لڑائی، ہے - یہ لڑائی دریائے راوی کے کنارے لڑی گئی - غالباً یہ جنگ ، ہڑپہ کی سلطنت کے خلاف تھی - اس شہر کے پرانے آثار میں سے قلعہ اور فصیل کے نشانات اب تک موجود ہیں -

موئن جوڈرو کی کھدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آور آریاؤں نے دشمنوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا اور جو زندہ رہ گئے ان کو غلام بنا لیا - ویدوں کی تحریر کے مطابق ان کو شودر قرار دیا گیا ، اور ان لوگوں کو آریا نسل کے لوگوں سے بات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی - وہ ان کے جانوروں کا دودھ بھی نہیں دوہ سکتے تھے - آہستہ آہستہ شودروں کی معاشرتی حیثیت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی، ان پر پابندیاں بڑھتی گئیں اور وہ ذلت اور غلامی کے اس درجے تک پہنچا دیے گئے کہ دنیا کی تاریخ میں اس سے بدتر مثال نہیں ملتی -

آریاؤں نے اس علاقے کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ وہ آگے بڑھ کر گنگا ، جمنا کی وادی میں آباد ہو گئے اور وہیں انھوں نے اپنے تہذیب و تمدن کو ترقی دی - انھوں نے اس علاقے کا نام ''آریہ ورت'' رکھا - ان کے قانون بنانے والوں نے ان علاقوں کو جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں اور برصغیر کے کئی ایک اور علاقوں کو غیر ممالک قرار دیا ، اور ان کا ان میں آنا جانا یا رہنا بسنا مذہبی لحاظ سے ممنوع ٹھہرایا گیا -

برصغیر کی تاریخ کا وہ دور جس کی تاریخ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ، چھٹی صدی عیسوی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے - اس صدی کے دوران ایران اور ان علاقوں کے مابین جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں باہمی تعلقات کا آغاز ہوتا ہے -

ان علاقوں کے لوگ جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں ، فوجی خدمات کے لیے ہمیشہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں - ایرانی فوج میں بھی اس علاقے کے لوگوں کے دستے تھے - ان میں پیدل

اور گھڑ سوار دونوں قسم کے جنگ جو ہوتے تھے - جب ایران کے بادشاہ دارا نے یونان پر حملہ کیا تھا تو ان دستوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں - ایرانی اثر کی وجہ سے ان علاقوں میں خروشتی' رسم الخط کا بھی رواج ہوا - ہندوستان کی پرانی زبانیں بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی تھیں مگر خروشتی رسم الخط، اردو کی طرح دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا - اس زبان کا ایک کتبہ آج تک محفوظ ہے -

ان ہی دنوں ٹیکسلا کی شہرت کا آغاز ہوا - یہ شہر جو تین مرتبہ اجڑ کر آباد ہوا ، پرانے زمانے کی شہری زندگی کا بہت اچھا نمونہ تھا - اس کی وسعت کا اندازا اس کے کھنڈرات سے لگایا جا سکتا ہے - جو لوگ یونانی مورخ سکندر اعظم کی فوج کے ہمراہ یہاں آئے ، انہوں نے ٹیکسلا کی معاشرتی زندگی کا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے - یہ شہر کسی باقاعدہ منصوبے کے تحت نہیں بنا تھا - اس لیے ٹیکسلا طرز تعمیر کے لحاظ سے ہڑپہ اور موئن جوڈرو کا مقابلہ نہیں کر سکتا - اس کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی تھیں اور صفائی کا انتظام ناقص تھا ، لیکن اس کی سرکاری عمارتیں رہنے سہنے کے مکانوں کی نسبت کہیں زیادہ شاندار تھیں -

سکندر کا حملہ

ابھی تک ان علاقوں کے تعلقات ایران تک محدود تھے لیکن ۳۲۶ ق - م میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ یونان اور ایشیائے وسطیٰ کے ملکوں سے بھی ہو گیا - یہ سکندر اعظم کا برِّصغیر پر حملہ تھا -

سکندر اعظم کا شمار دنیا کے بڑے فاتحین میں کیا جاتا ہے - اس نے تھوڑے سے عرصے میں مصر اور شام کو فتح کر کے ایران پر حملہ کر دیا اور ایرانی شہنشاہ دارا کو شکست دے کر اس کی عظیم سلطنت پر اپنا تسلط قائم کر لیا - پھر جلد ہی اس نے وسط

ایشیا کے علاقوں کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہاں تک کہ مئی ۳۲۷ ق۔م میں اس کی فوجوں نے کابل کو فتح کرکے برصغیر کا رخ کیا ۔ اب تک اس کے حملوں کی رفتار ایک تیز و تند طوفان کی سی تھی۔ لیکن کابل کی فتح کے بعد یہ رفتار کافی سست ہو گئی اور اسے دریائے سندھ تک پہنچنے میں نو ماہ کے قریب لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی فتوحات کے اس سلسلے میں اسے پہلی مرتبہ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ، جنھوں نے اس کی فوج کا نہایت بے جگری اور بہادری سے مقابلہ کیا ۔ سکندر اعظم ایک محتاط جرنیل تھا ۔ اس نے درّہ خیبر میں داخل ہونے کی بجائے سوات اور باجوڑ کا راستہ اختیار کیا ۔ اس راستے میں اسے کئی ایک قبیلوں کے قلعے فتح کرنے میں کافی عرصہ لگا ۔

سکندر نے اس سفر میں ، جب مساگا (Massaga) کے شہر پر حملہ کیا تو محصورین کی امداد کے لیے پنجاب سے بھی کچھ فوج آئی ۔ اس کے دستوں نے سکندر کی فوج کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا جب شہر فتح ہو گیا تو سکندر نے پنجاب کے ان فوجی دستوں کو بھی اپنی فوج میں شامل کرنے کا ارادہ کیا ۔ وہ اکثر مفتوح ملکوں کے جنگ جو لوگوں کو اپنی فوج میں شامل کر لیا کرتا تھا ۔ لیکن ان فوجیوں کو اس احساس سے شدید کوفت ہوئی کہ انھیں اپنے ہی ملک کے لوگوں کے خلاف جنگ کرنا ہوگی ، اس لیے وہ رات کے اندھیرے میں کیمپ سے بھاگ گئے ۔

آخر کار سکندر دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹیکسلا آ پہنچا اس زمانے میں جہلم اور چناب کا درمیانی علاقہ راجا پورس کے قبضے میں تھا ۔ سکندر نے اپنے پیغامبر کے ذریعے پورس کو پیغام بھیجا کہ وہ ٹیکسلا میں سکندر کی خدمت میں حاضر ہو ۔ پورس نے جواب دیا کہ میں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنی ریاست کی سرحد پر تمھارا انتظار کروں گا ۔ کہا جاتا ہے کہ پورس نے اپنی فوج کے کیمپ کو

دریا کے بائیں کنارے پر قائم کیا ۔

سکندر کو دنیا کا ایک عظیم فاتح ہونے کے باوجود پورس کے کیمپ کے مقابل میں دریا پار کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ وہ ایک رات اپنی فوج کے ایک حصے کو ۱۷ میل شمال میں لے گیا اور وہاں سے اس نے موسلا دھار بارش اور گرج اور چمک کے طوفان میں دریا کو پار کر لیا ۔ ماہرین تاریخ کا کہنا ہے کہ اگر پورس کو وقت پر اس کی اطلاع ہو جاتی تو وہ یقیناً یونانی فوج پر حملہ کر کے اسے شکست دیتا لیکن قسمت نے سکندر کا ساتھ دیا ۔ اس لڑائی میں پورس کے دو بیٹے اور اس کی فوج کے تمام سردار میدان میں کھیت رہے ۔ کامیابی کے بعد سکندر نے پورس کے ساتھ ایک فراخ دل فاتح کا سا سلوک کیا ۔

اس سے آگے بڑھ کر سکندر، بیاس کے کنارے پہنچ گیا جہاں اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ۔ انکار کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں میں جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں اسے ایسے شدید معرکوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ، جن سے یونانیوں کی ہمت جواب دے گئی ۔ سکندر کو اپنی زندگی میں جس سب سے بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑا ، وہ ملھی قوم کے قلعے کے محاصرے میں پیش آیا ۔ یہ قبیلہ راوی اور چناب کے درمیانی علاقے میں آباد تھا ۔ چونکہ یہاں کی لڑائیوں میں اس کے سپاہیوں کے حوصلے پست ہوچکے تھے، اس لیے ان کا دل بڑھانے کے لیے وہ سب سے پہلے خود قلعے کی فصیل پر چڑھا اور اکیلا قلعے میں کود گیا ۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا خطرہ مول نہیں لیا تھا ۔ اس جنگ میں سکندر خود بھی شدید زخمی ہوا ۔

یہ علاقہ اس زمانے میں اپنی صنعتی اور دوسری پیداوار کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا ۔ سکندر نے اس کے بڑے بڑے افسانے سن رکھے تھے ۔ لیکن جب اس نے اس ملک کو اپنی آنکھوں

سے دیکھا تو حقیقت کو ان افسانوں سے بھی کچھ زیادہ ہی پایا۔ سکندر کے حملے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ علاقہ دولت آفرینی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور تھا۔ یہاں کی سونے کی کانیں جن میں سونا، ڈلی کی بجائے ریت کی صورت میں ملتا تھا، دنیا بھر میں مشہور تھیں، لیکن یونانیوں کو زیادہ تعجب گنے اور کپاس کی فصل سے ہوا۔ انھوں نے اب تک کپاس کا پودا نہیں دیکھا تھا۔ ان کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ ''اس ملک میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن پر اون اگتی ہے۔''

سکندر کے حملے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے یورپ کے لوگوں کو اس علاقے کے محل وقوع سے خاصی واقفیت ہو گئی اور اس کے بعد یورپ اور دنیا کے اس حصے کے درمیان تین تجارتی راستے کھل گئے جو کئی صدیوں تک استعمال ہوتے رہے۔ ان علاقوں میں یورپ کے درمیان یہ تجارتی تعلقات تقریباً اڑھائی ہزار سال سے چلے آتے ہیں۔

بہت سے یونانی، جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے، یہیں آباد ہو گئے۔ چند سال کے بعد یونانیوں کی باقاعدہ آمدو رفت شروع ہو گئی۔ ان میں بہت سے چابکدست سنگتراش تھے، جنھوں نے بدھ کی زندگی کے مختلف واقعات کے مجسمے بنائے۔ ان مجسموں کو بدھ مندروں میں جگہ دی گئی اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ ان میں سے اکثر مجسمے لاہور اور پشاور کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ سیاح ان کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔

خاندان موریا اور پاکستان کے علاقے

سکندر اعظم کے رخصت ہونے کے بعد برِّصغیر میں چندر گپت موریا نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اشوک اعظم بھی موریا خاندان کا ہی حکمران ہو گزرا ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کی ریاست بہار میں نندا خاندان کی حکومت تھی۔ ان کا صدر مقام

پاٹلی پتر تھا ۔ چندر گپت موریہ کا بھی اسی خاندان سے تعلق تھا ۔ اس خاندان کے آخری راجا نے چندر گپت موریا کو جلا وطن کر دیا تھا ۔ یہ ان علاقوں میں آ گیا جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں ۔ یہاں اس نے سکندر اعظم سے بھی ملاقات کی ۔ اس زمانے میں اسے اس علاقے کے لوگوں کی بہادری اور میدان جنگ میں ان کی جان فروشی کا اندازا ہوا ہو گا ۔

سکندر یہاں سے رخصت ہوا تو وہ مختلف علاقوں میں اپنے حاکم مقرر کر گیا تھا ۔ چندر گپت موریا نے پنجاب اور سرحد سے فوج اکٹھی کر کے اس علاقے کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ۔ جب اس کا پنجاب اور سرحد پر تسلط قائم ہو گیا تو اس نے ان ہی فوجی دستوں کے ساتھ پاٹلی پتر کا رخ کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں نندا خاندان کو ختم کر کے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈال دی ۔ پنجاب اور سرحد بھی اس سلطنت کا صوبہ تھے ، جس کا صدر مقام ٹیکسلا کا شہر تھا ۔

کشان خاندان

اب تک اس علاقے کے تعلقات ایران اور یونان سے تھے لیکن ہماری تاریخ میں ایک دور ایسا بھی آیا جب ہمارے تعلقات وسط ایشیا سے بھی قائم ہو گئے ۔

ایک زمانے میں یارقند ، ختن اور کاشغر کے علاقے ایک ایسی سلطنت کے صوبے رہے ہیں ، جس کا صدر مقام پشاور تھا ۔ اس سلطنت کی بنیاد کنشک نے ڈالی تھی ۔ درۂ خیبر سینکڑوں سال سے قوموں کی گزرگاہ رہا ہے ۔ اس شاہراہ سے مختلف قوموں کے کارواں آتے رہے اور سرحد اور پنجاب میں آباد ہوتے گئے ۔

جب موریا حکومت کی بنیادیں کمزور ہونے لگیں تو ایک منچلے یونانی حکمران نے برصغیر کے مغربی حصے کو فتح کر کے ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالی ۔ اس خاندان کا سب سے مشہور

حکمران میناندر تھا۔ اس نے بدھ مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس کی سلطنت مشرق میں متھرا اور مالوہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع سلطنت کا صدر مقام سیالکوٹ کا شہر تھا۔ چینی سیاح، ہیون سانگ نے اس شہر کے پارکوں اور تالابوں، چوکوں اور بازاروں کی بہت تعریف کی ہے۔ ان ہندو اور یونانی حکمرانوں کی سلطنت کو کشان قوم نے شکست دی اور انھوں نے پنجاب اور سرحد کو فتح کر کے ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس میں وسط ایشیا کے علاقے بھی شامل تھے۔ اس خاندان کا مشہور بادشاہ کنشک تھا۔

کنشک، بدھ مذہب کا پیرو تھا اور اس کے اثر سے بدھ مذہب میں ایک نئے فرقے کا آغاز ہوا، جسے مہایانی کہتے ہیں۔ اس فرقہ نے بدھ کی مورتی یا بت کی پوجا کو رواج دیا۔ اس فرقے کا اثر چین اور جاپان تک بھی پہنچا اور آج بھی وہاں بدھ کی مورتیوں میں سنگتراشی کی اس طرز کی جھلک نظر آتی ہے جو کنشک کے زمانے میں رائج تھی۔

کنشک کا صدر مقام پشاور تھا۔ اس شہر میں اس نے ایک عظیم الشان سٹوپ یا مندر بنایا، جس میں بدھ کی ہڈیاں محفوظ تھیں۔ اس کے مینار کی بلندی چار سو فٹ تھی۔ اس زیارت گاہ کی وجہ سے یہاں دور دور کے زائرین آنے لگے۔ اس عمارت کے پرانے آثار آج بھی موجود ہیں۔ کنشک نے ٹیکسلا میں سرمکھ کے مقام پر ایک نیا شہر آباد کیا۔ اس کے زمانے میں ٹیکسلا اور پشاور بدھ مذہب کی تعلیم کے بڑے مرکز بن گئے تھے، جہاں دور دور کے ملکوں کے طلبا آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

کنشک اپنے زمانے کا ایک مشہور فاتح ہو گزرا ہے۔ اس نے کشمیر کو فتح کیا اور پامیر کی بلند سطح مرتفع کو عبور کر کے یارقند، ختن اور کاشغر کے علاقے فتح کر لیے۔ اس نے ان لڑائیوں میں بہت سے چینیوں کو جنگی قیدی بنا لیا اور ان کو یرغمال کے

طور پر اپنے ہمراہ لے آیا ۔ ان قیدیوں کو اس نے پشاور کے نواح میں اور راوی کے پار آباد کیا ۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ آڑو اور ناشپاتی کے پودے لائے اور انھوں نے ان علاقوں میں ان پھلوں کو رواج دیا ۔

کنشک کے دربار میں بڑے بڑے عالم رہتے تھے ۔ اس کے طبیب، چرک نے علم طبؑ پر ایک کتاب لکھی جس کا عباسی خلفاء کے زمانے میں عربی میں بھی ترجمہ کیا گیا ۔

پنجاب اور سرحد میں بدھ مذہب :

برصغیر میں بدھ مذہب کی اشاعت کرنے والا پہلا حکمران اشوک تھا ۔ اس نے صرف برصغیر ہی میں نہیں بلکہ اس مذہب کو دوسرے ملکوں میں بھی پھیلانے میں بہت جدو جہد کی ۔ اشوک کو پنجاب اور سرحد کے علاقے سے خاص دلچسپی تھی ۔ وہ جوانی میں ٹیکسلا کا گورنر رہ چکا تھا جو اس وقت اس علاقے کا صدر مقام تھا ۔ اس نے یہاں ایک شاندار سٹوپ یا بدھ مندر بھی تعمیر کرایا تھا ، اس کے آثار آج بھی محفوظ ہیں ۔ اس نے بدھ مذہب کو پھیلانے کا ایک خاص طریقہ یہ اختیار کیا کہ بدھ کے اصولوں کو چٹانوں اور لاٹھوں پر کندہ کرا دیا ۔ ہمارے ہاں اس قسم کے دو کتبے موجود ہیں جو صوبہ سرحد میں شہباز گڑھی اور مانسہرہ کے قریب چٹانوں پر کندہ ہیں ۔ یہ کتبے اس شاہراہ پر واقع تھے جو ان علاقوں کو وسط ایشیا سے ملاتی تھی ۔

فن سنگ تراشی :

اشوک کے زمانے میں اگرچہ سنگ تراشی کافی عروج پر تھی لیکن اس وقت تک بدھ کے بت یا مورتیاں نہیں بنائی گئی تھیں اور نہ ان کی پوجا ہوتی تھی ۔ کشان خاندان کے حکمران کنشک نے اپنے زمانے میں بدھ علماء کی ایک کانفرنس کشمیر میں بلائی ۔ جس کے نتیجے کے طور پر بدھ کے بتوں کی پوجا کا آغاز ہوا ۔ مورتی پوجا کے عام ہونے سے سنگ تراشی کے فن کو بہت ترقی ہوئی اور اس

آرٹ کی ایک نئی طرز کا آغاز ہوا ، جسے ''گندھارا آرٹ'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ لاہور اور پشاور کے عجائب گھروں میں اس طرز کے بہت سے نمونے نظر آتے ہیں ۔ گندھارا آرٹ کے پیروؤں نے محض بدھ کے بت ہی نہیں بنائے بلکہ انھوں نے پنجاب اور سرحد کی عام زندگی کو بھی پتھروں میں نقش کر دیا ہے ۔

کنشک کے بعد برصغیر میں گپت خاندان کا عروج رہا ۔ اس خاندان کو بدھ مذہب سے کوئی دل چسپی نہیں تھی ۔ یہ اس کے انحطاط کا زمانہ تھا ۔ ان کے بعد اس علاقے میں سفید ہنوں کی حکومت قائم ہوئی ۔ ان کے ایک حکمران مہر گل نے بدھ مذہب کو مٹانے میں پوری کوشش کی ۔ اس نے عام حکم دے رکھا تھا کہ ہر بھکشو یا بدھ مذہب کے راہب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ہر بدھ خانقاہ اور عبادت گاہ کو مسمار کر دیا جائے ۔ اس طرح سے اس علاقے میں ہندو مذہب کو ترقی ہوتی گئی اور بدھ مت ایک تاریخی یادگار بن کے رہ گیا ۔

علوم و فنون :

اس زمانے میں برصغیر میں علوم و فنون میں بہت ترقی ہوئی ۔ اس ترقی میں ان عالموں کا بہت حصہ ہے جو پنجاب اور سرحد میں پروان چڑھے ۔ ٹیکسلا علوم و فنون کا ایسا مرکز تھا جو سکندرِ اعظم کے زمانے سے بھی بہت پہلے مشہور رہا ہے ۔ ٹیکسلا کے علاقے کے بعض عالم اپنے میدان میں چوٹی کے لوگ شمار کیے گئے ہیں ۔ سکندرِ اعظم کے زمانے میں ہی ہندوؤں میں علم سیاست کے ماہر چانکیہ نے شہرت پائی ۔ وہ ٹیکسلا کا رہنے والا تھا ۔ ہندوؤں کے انتظام سلطنت پر اس کی کتاب نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے ۔ چانکیہ سیاسی مخالفوں کے خلاف ہر قسم کے دھوکا اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے اور موجودہ ہندوستان کی سیاست پر اس کے خیالات کی گہری چھاپ ہے ۔ موریا سلطنت کو حاصل کرنے میں

چندر گپت موریا نے اس کے مشوروں پر عمل کیا تھا۔ جب اس علاقے میں بدھ مذہب کا زور ہوا تو ٹیکسلا کو اور بھی فروغ حاصل ہوا اور یہاں دوسرے فنون کے بھی بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے۔ دنیا کی تاریخ میں گرامر کی پہلی کتاب کا لکھنے والا پانینی (Panini) بھی ٹیکسلا کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ٹیکسلا میں علم طب کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانے پر دی جاتی تھی۔ برصغیر کے دو سب سے بڑے طبیب اتریہ (Atreya) اور چرک (Charak) دونوں اس علاقے کے رہنے والے تھے۔ چرک، کنشک کا درباری معالج بھی تھا۔

بنگال میں بدھ مذہب:

یہ علاقہ قدیم زمانے سے قدرتی طور پر دو حصوں میں منقسم تھا۔ جنوبی حصے کے رہنے والے باشندے "بنگ" کہلاتے تھے۔ اسی وجہ سے اس علاقے کو بنگال کہنے لگے۔ بنگ بہت بہادر تھے۔ غیر ملکوں سے تجارت کرتے اور کشتی رانی میں ماہر تھے۔ شمالی حصے کے لوگ پندر کہلاتے تھے۔ وہ بہت جنگ جو تھے، لیکن ان کو غیر مہذّب نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کے حالات زیادہ تر ضلع بوگرہ میں مہستان کے کھنڈروں سے معلوم ہوئے ہیں۔ یہاں سے ایک کتبہ ملا تھا جس سے معلوم ہوا کہ یہ علاقہ کسی زمانے میں مگدھ کے موریا خاندان کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس کتبے پر کسی قحط کے حالات بھی کندہ ہیں، جس میں بتایا گیا ہے کہ حکمران خوشحالی کے زمانے میں بہت سا اناج اکٹھا کر لیا کرتے تھے۔ قحط کے زمانے میں یہ اناج، لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور جب فصلیں اچھی ہوتیں۔ تو واپس لے لیا جاتا تھا۔ پندر، ہندوستان اور چین کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔

یہاں بدھ مت کی اشاعت پہلے پہل اشوک کے زمانے میں ہوئی۔ مہستان میں موریا زمانے کے ایک سٹوپ اور خانقاہ کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں۔ موریا سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی یہاں بدھ مذہب

کا اثر برابر قائم رہا ، اس کی وجہ یہ تھی کہ گپتا سلطنت اور دوسری ہندو حکومتوں نے اس کو ختم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی ۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ ساتویں صدی میں اس علاقے میں آیا تھا ۔ اس نے یہاں کے سنگھرام یا بدھ مذہب کی خانقاہوں اور بھکشوؤں کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ملک میں تالابوں ، رفاہ عام کی عمارتوں اور پھولدار درختوں کے جنگلات کا ایک وسیع سلسلہ چلا گیا ہے ۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے ۔ غلے اور پھلوں کی بہت کثرت ہے ۔ یہاں کے لوگ علم کے شوقین ہیں اور اس کے حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کرتے ہیں ۔

بدھ مت کے آثار :

اس علاقے میں بدھ مذہب کو زیادہ فروغ پال خاندان کے زمانے میں ہوا ، اس کی وجہ سے ان کی عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں بہت اضافہ ہوا اور ان کا اثر قریب کے ملکوں میں بھی پھیلنے لگا ۔ اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے لیے بہت شاندار عبادت گاہیں بنوائیں ۔ یہ معبد ملک کے اندرونی حصے میں واقع تھے ، اس لیے زمانے کی دست برد سے محفوظ رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک یہاں بدھ مذہب کے بہت سے پیرو پائے جاتے ہیں ، حالانکہ ہندوستان میں بدھ مذہب کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے ۔ بدھوں کی مذہبی زندگی کے آثار پندرنگر میں پائے گئے ہیں ۔ وہاں کے ایک عظیم الشان عبادت خانے میں بدھ مذہب کے سیکڑوں راہب رہتے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ دلچسپ وہ عبادت خانہ ہے جو راجشاہی کی پہاڑیوں کے نزدیک ۸۰۰ء کے قریب بنایا گیا تھا ۔ یہ دنیا کے بڑے بڑے بدھ راہب خانوں میں شمار ہوتا ہے ۔ اس میں ۱۱۷ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں ۔ ہر کمرے کی لمبائی تیرہ فٹ ہے ۔ یہ تمام کمرے ایک بہت بڑے صحن میں کھلتے ہیں ۔ عبادت گاہ کی بیرونی دیواریں

مخروطی ہیں - اوپر ایک محفوظ کمرہ ہے جس میں بدھ کے تبرکات ہیں - اس کمرے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں - مندر میں بدھ کا ایک بت ہے اس کے دونوں طرف جانوروں ، پرندوں اور گویّوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں -

پال راجاؤں کی سلطنت میں بہار آسام کے علاقے بھی شامل تھے - اس خاندان کے زمانے میں بہار میں نالندہ کی مشہور و معروف بدھ تعلیم گاہ تعمیر کی گئی - جس میں دور دور کے طلبا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے - اس خاندان نے اپنے زمانے میں تبت کے ملک میں بدھ بھکشوؤں کا ایک مشن بھی بھیجا تھا - اس علاقے میں سنگ تراشی کے جو نمونے پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر اسی خاندان کے زمانے کے ہیں - ان کے ہاں اس زمانے کے دو مشہور سنگ تراش کام کرتے تھے - انھوں نے محض بدھ کے مجسمے ہی نہیں بنائے بلکہ روزمرہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو بھی سنگ تراشی کے فن کے ذریعے پیش کیا -

پال خاندان کے بنائے ہوئے سٹوپ اور خانقاہیں دور دور تک مشہور تھیں اور چین تک کے لوگ زیارت کے لیے یہاں آتے تھے - کومیلا کے علاقے میں چندرا اور دیوا خاندانوں کی حکومت رہی ہے - یہ بھی بدھ مذہب کے پیرو تھے - ان کا بنایا ہوا ایک سٹوپ کومیلا کی پہاڑیوں میں ہے - یہ عبادت گاہ گیارھویں یا بارھویں صدی عیسوی میں بنائی گئی تھی - پہاڑی کے شمالی حصے کو میناتی اور جنوبی حصے کو لال مائی کہتے ہیں - دیکھنے میں یہ کھنڈر کسی قلعے کے آثار معلوم ہوتے تھے ، لیکن کھدائی کرنے پر اس کے نیچے ایک مندر کے آثار ملے ہیں -

اس علاقے میں بدھ مذہب کو سین خاندان کے راجاؤں نے ختم کیا - یہ خاندان گیارھویں صدی عیسوی میں برسراقتدار آیا - اس کے حکمران دکن کے برہمن تھے - انھوں نے بدھ مذہب کے

معبدوں کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ سین خاندان نے ذات پات کے بندھنوں کو مضبوط کرنے کے لیے قنوج سے برہمن اور کائستھ لوگوں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج چاٹگام کے پہاڑی علاقے کے سوا اور کسی جگہ بدھ مذہب کے پیروؤں کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے ۔

سوالات

۱ ۔ اس امر کی وضاحت کیجیے کہ وہ علاقے جو پاکستان میں شامل ہیں ، ایک الگ علاقہ رہے ہیں ۔
۲ ۔ پاکستان کی قدیم تہذیب کے متعلق آپ نے جو کچھ پڑھا ہے اپنے الفاظ میں لکھیے ۔
۳ ۔ آریا کہاں سے آئے اور کیوں ، نیز یہ بھی بتائیے کہ انھوں نے ان علاقوں میں جو پاکستان میں شامل ہیں ، رہنا کیوں پسند نہ کیا ۔
۴ ۔ بدھ مذہب کے فروغ پانے کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیے ۔
۵ ۔ بدھ مذہب کی وجہ سے فنِ سنگ تراشی میں کیا ترقی ہوئی ؟
۶ ۔ ہندوؤں نے بدھ مذہب کو مٹانے کے لیے جو کوششیں کیں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالیے ۔

باب ۲

سندھ میں مسلمانوں کی آمد

عرب تاجر بہت مدت سے برصغیر کے ساحل پر آتے اور یہاں کی قیمتی پیداوار کو مصر اور شام کے راستے یورپ تک پہنچاتے تھے۔ ہندوستان کی پیداوار کو ملکوں ملکوں پہنچا کر عرب تاجروں نے ہندوستان کی دولت اور شہرت کو بڑھایا۔ ورنہ یہ کام یہاں کے لوگوں کے بس کا نہ تھا کیونکہ ان میں جہاز رانی کا شعور نہ تھا بلکہ ان کے مذہب میں تو سمندر کا سفر کرنا بھی منع تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کی حدیں تیزی سے بڑھیں اور مسلمانوں نے مکران تک اپنی حکومت قائم کر لی۔ مکران کی حد سندھ کے ساتھ ملتی تھی۔ اس زمانے میں سندھ کے علاقے میں راجا داہر کی حکومت تھی۔ اسلامی سلطنت کے اکثر باغی سندھ میں پناہ لیتے تھے، لیکن ایک خاص واقعہ نے حالات کا رخ بدل دیا۔

محمد بن قاسم کی آمد

ایک مرتبہ سری لنکا کے راجا نے خلیفۂ اسلام کی خدمت میں تحفے بھیجے۔ آٹھ جہازوں کے اس قافلے میں کچھ مسلمان حج کی نیت سے بھی سوار تھے، ساتھ ہی چند ایسے عرب سوداگروں کی بیوائیں اور یتیم بچے بھی تھے جو لنکا میں فوت ہو گئے تھے۔ ان جہازوں کو دیبل کے قریب بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ اس خبر سے بصرے کے حاکم حجاج بن یوسف کو

بہت رنج پہنچا ، اُس نے راجا داہر سے مطالبہ کیا کہ وہ مجرموں کو سزا دے اور قیدیوں کو آزاد کرا کے لوٹے ہوئے سامان کے ساتھ بصرے پہنچا دے ۔

راجا داہر نے اپنی معذوری کا بہانہ کیا اور کہا کہ یہ بات اس کے بس میں نہیں ۔ اس پر حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو جس کی عمر صرف سترہ سال تھی ، بارہ ہزار سپاہیوں اور تین ہزار بار بردار اونٹوں کے ساتھ سندھ کی مہم پر روانہ کیا ۔ اس فوج کے ساتھ منجنیقیں بھی تھیں ، جن سے قلعوں کی دیواروں پر بھاری پتھر پھینکے جاتے تھے ۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں دیبل اور نیروان کو فتح کیا ۔ اس کے بعد راجا داہر سے مقابلہ ہوا ۔ راجا میدان جنگ میں مارا گیا ۔

اس کے بعد اس نے برہمن آباد ، الور اور ملتان کو فتح کر لیا ۔ اس کو مختلف شہر فتح کرنے میں یہ بھی آسانی ہوئی کہ اس کے خلوص ، عدل و انصاف اور پابندیٔ عہد کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی ۔ جب اس نے الور کے شہر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے باشندوں نے یہ کہہ کر شہر کے دروازے کھول دیے کہ محمد بن قاسم جو عہد و پیمان کرتا ہے اسے بہت پابندی اور اہتمام سے پورا کرتا ہے ۔ اس طرح برہمن آباد کے لوگوں نے بھی قلعے کے دروازے کسی لڑائی کے بغیر ہی کھول دیے تھے ۔

محمد بن قاسم اگرچہ عمر کا زیادہ نہیں تھا مگر وہ سندھ کی مہم میں نہایت کامیاب رہا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے مہم شروع کرنے سے پہلے اس کی پوری تیاری کی تھی ۔ اس نے اپنے ساتھ ایسا سامان جنگ لیا ، جس کا استعمال یہاں کے لوگ نہیں جانتے تھے ۔ مثلاً منجنیق یا قلعوں کی دیواروں کو توڑنے والی مشینیں ہندوستان میں کبھی استعمال نہیں کی گئیں ۔ مسلمان حملہ آور نفت کا استعمال بھی جانتے تھے ۔ نفت کو تیر کے سرے پر لگا کر

پھینکا جاتا تھا تو جہاں تیر لگتا تھا وہاں آگ لگ جاتی تھی۔ راجا داہر میدان جنگ میں ہاتھی پر سوار تھا اس کی عماری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں تیر لگا تو اس میں آگ لگ گئی اور راجا کو مجبوراً ہاتھی سے اترنا پڑا۔ جب فوج کو راجا نظر نہ آیا تو اس میں سخت کھلبلی پڑ گئی۔ راجا داہر مارا گیا اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اس زمانے میں مسلم فوج کے ساتھ علاج و معالجے کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سندھ کے علاقے میں ملیریا بخار بہت ہوتا تھا۔

محمد بن قاسم نے بہت سی روئی کو سرکے میں بھگو کر خشک کرایا اور اسے اونٹوں پر بار کر کے ساتھ لے آیا تاکہ اسے ضرورت کے وقت استعمال کیا جا سکے۔

محمد بن قاسم نے تھوڑے سے عرصے میں ایک بہت بڑے علاقے کو فتح کر لیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی جہاد کے جذبے سے سرشار تھے۔ ایمان کی پختگی کی وجہ سے ان کے حوصلے نہایت بلند تھے۔ ان کے دلوں میں بلا کا جوش اور ولولہ تھا۔ اس کی فوج کو نہ تو ہاتھیوں کے حملے روک سکے اور نہ ہی دریائے سندھ کا تیز بہاؤ اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سندھ سے مشرق کی طرف بڑھ کر قنوج کی سلطنت پر حملہ کرے۔ اس وقت ہندوستان پر قنوج کے راجا کی ہی حکومت تھی؛ یہ کام اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مگر سندھ میں اس کا قیام اتنا مختصر رہا کہ وہ اپنے بلند ارادوں کو عملی شکل نہ دے سکا۔ ورنہ اس کے لیے قنوج کا فتح کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس طرح مسلمانوں کی حکومت شمالی ہندوستان میں پانچ صدی پہلے قائم ہو جاتی۔

محمد بن قاسم نے سندھ کے باشندوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ ہندوؤں کے مندروں کا تمام خرچ اور پروہتوں کی تنخواہیں


محمد بن قاسم کی فتوحات
۷۱۰-۷۱۳ء
میل ۶۰۰ ۴۰۰ ۲۰۰
بحیرۂ خذر
بحیرۂ روم
دمشق
شام
عراق
ایران
بصرہ
شیراز
کرمان
ہرمز
خلیج فارس
خشکی کا راستہ
مکران
نیروان
سیہوان
راوڑ
برہمن آباد
ٹھٹھہ
دیبل
سمندر کا راستہ
ملتان
پاکستان
دریائے سندھ
دریائے جہلم
دریائے چناب
دریائے راوی
دریائے ستلج
ہندوستان
عرب
مدینۂ منورہ
مکۂ معظمہ
جدہ
بحیرۂ احمر
بحیرۂ عرب
خشکی کا راستہ
سمندری راستہ

سرکاری خزانے سے ادا کی جانے لگیں۔ برہمنوں کی سرداری کو قائم رکھا۔ اس نے یہاں کے باشندوں کو پوری پوری مذہبی آزادی دے دی۔ جو لوگ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جاتے تھے اُن کو جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کی زمینیں اور جائدادیں اُن کے قبضے میں رہیں۔ محمد بن قاسم نے ساڑھے تین برس تک سندھ پر نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی۔ جب اسے واپس بلا لیا گیا تو سندھ کے باشندوں کو اس کا بہت رنج ہوا۔ اس کی یاد میں انھوں نے اس کے مجسمے بنا کر مندروں میں رکھے۔

اگرچہ محمد بن قاسم کا سندھ میں قیام نہایت مختصر تھا، لیکن اس دوران میں اس نے انتظام حکومت کے چند ایسے اصول وضع کر دیے، جو بعد کے حکمرانوں کے لیے ضابطۂ عمل بن گئے۔ اس نے ہندوؤں اور بدھوں کو قانونی لحاظ سے وہی حیثیت دی جو اسلامی مملکت میں عیسائیوں اور یہودیوں کو حاصل تھی۔ اس نے ملکی انتظام میں برہمنوں اور داہر کے وزیروں پر پورا پورا اعتماد کیا۔ ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے حقوق بحال کر دیے اور لگان کے جمع کرنے کا کام مقامی کارکنوں کے حوالے کر دیا۔ اس نے کسانوں، دستکاروں اور تاجروں کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے بھی خاص کوشش کی اور جزیہ لگانے میں بہت رواداری سے کام لیا۔ اس نے بہت سے ضرورت مند گروہوں کو جزیہ معاف بھی کر دیا۔

سندھ کی فتح سے اس علاقے کا تعلق اسلامی دنیا سے ہو گیا۔ سندھ کے جاٹ (زط) مسلم فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ بصرے کی منڈیوں میں سندھ کے منشی اور محاسب کام کرتے نظر آتے تھے۔ وہاں کی مجلسوں میں سندھی شعرا اپنے کلام کی داد پاتے تھے، بلکہ بعض شعرا نے تو عربی ادب میں اپنا مقام بھی بنایا۔

اس طرح یہاں کے کچھ عالم بغداد کے 'بیت الحکمت' میں کام کرنے لگے اور انھوں نے سنسکرت کی کئی ایک کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ۔ عرب جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے ملک کے جغرافیائی حالات لکھے اور اس طرح سے سندھ اور اس کے علوم کو ایک دنیا سے روشناس کرا دیا ۔

غزنوی حکمران :

وہ علاقے جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں محمود غزنوی کی سلطنت میں تھے ۔ محمود غزنوی ایک بے باک سپہ سالار ، عدل و انصاف کا پیکر ، عالموں کا قدر دان اور سختی سے مذہب کا پابند تھا ۔ جب وہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھا تو ایک چھوٹے سے ملک کا حکمران تھا لیکن جب وہ مرا تو غزنی کا شہر ایک عظیم الشان سلطنت کا پایۂ تخت بن چکا تھا ۔

اس زمانے میں پنجاب کے علاقے میں ہندو شاہیہ خاندان کی حکومت تھی ۔ اس خاندان کے راجا جے پال نے محمود کے باپ ناصرالدین سبکتگین کے زمانے ہی میں سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی ۔ جے پال اور اس کے بیٹے انند پال نے سبکتگین اور محمود کے ساتھ کئی جنگیں کیں ، مگر ہمیشہ شکست کھائی ۔ وہ ہر مرتبہ جنگ نہ کرنے کا عہد کرتے ، لیکن ہر بار اپنے عہد سے پھر جاتے تھے ۔ ہندوستان کے راجاؤں سے مذہب کے نام پر مدد مانگتے اور لڑائی کرتے تھے ، لیکن ہر مرتبہ شکست کھا جاتے تھے ۔ باپ بیٹا دونوں سندھ اور ملتان میں رہنے والے قرامطہ کی حمایت بھی کرتے تھے ۔

قرامطہ، مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ تھا جو اکثر اسلامی اصولوں سے منحرف ہو چکا تھا ۔ قرامطہ خلافتِ اسلامیہ کے سخت مخالف تھے ، مگر محمود خلافت کا بہت بڑا حامی تھا ۔ جب

کبھی وہ قرامطہ کے فتنے کو دبانا چاہتا تو جے پال اور انند پال دونوں ان کی مدد پر اتر آتے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پنجاب کے ہندو شاہیہ خاندان نے جو لڑائیاں محمود کے خلاف لڑیں، اُن کا میدان جنگ اکثر دریائے سندھ کے پار ہوتا تھا، جس سے ظاہر ہے کہ ہندو راجے ہمیشہ لڑائی میں پہل کرتے تھے۔

جب جے پال یا انند پال کو سبکتگین یا سلطان محمود کے خلاف کوئی مہم پیش آتی تو وہ ہندو راجاؤں سے روپیہ اور فوجی مدد کی درخواست کرتے تھے۔ اس کے جواب میں ہندو راجے ہی نہیں بلکہ دور دور کے علاقوں سے مائیں اپنے بیٹوں اور بیویاں اپنے شوہروں کو لڑائی کے لیے بھیجتی تھیں۔ دولت مند گھرانوں کی عورتیں اپنے زیور تک امداد کے طور پر پیش کرتی تھیں۔ لیکن غزنی کے حکمران ان جوشیلی تیاریوں کے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے۔ محمود نے برصغیر پر دور دور تک حملے کیے۔ لیکن اس نے صرف صوبہ پنجاب اور سرحد کو اپنی سلطنت کا ایک مستقل صوبہ بنایا۔

محمود کے حملوں کے اثرات

سلطنت غزنویہ کے ساتھ ان علاقوں کے تعلقات کا بہت گہرا اثر ہوا اور یہ صحیح معنوں میں مسلم دنیا کا حصہ بن گئے۔ جو مسلمان پاکستان کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے، انھیں اس سرزمین سے بے انتہا محبت تھی۔ سندھ کے مسلمان اپنے ملک کی تعریف میں عربی میں قصیدے لکھتے تھے۔ غزنوی عہد میں مسعود سعد سلمان ایک فارسی شاعر ہوا ہے۔ اس نے اپنے اشعار میں لاہور کی بہت تعریف کی ہے۔ اس دور میں حضرت داتا گنج بخش ایسے بزرگوں نے اپنی پاکیزہ زندگی اور اسلامی تعلیمات کی ایک ایسی مثال پیش کی، جس نے ہندو عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اُن کے بعد آنے والے بزرگوں نے بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اسلام

کی اشاعت کی ۔ اس زمانے میں البیرونی جیسے عالموں نے ہندوؤں کے علوم اور زندگی کا بے لاگ انداز میں مطالعہ کیا ۔ البیرونی نے سنسکرت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور ہندوؤں کی تہذیب و تمدن پر "کتاب الہند" کے نام سے ایسی کتاب لکھی ، جس کو ہندو عالم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اس نے پنجاب کے کئی شہروں کے عرض بلد اور طول بلد بھی معلوم کیے ۔

سلطان محمود نے مذہب کے معاملے میں ہمیشہ رواداری سے کام لیا اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کبھی کوشش نہ کی ۔

سلطان محمود کی فوج میں ہندوؤں کی تعداد دس ہزار تھی ۔ ان کے علیٰحدہ دستے تھے اور ان کا افسر اعلیٰ بھی ہندو ہوتا تھا ، جسے سالارِ ہندوواں کہتے تھے ۔ سلطان کی فوج میں ہاتھی بھی ہوتے تھے ۔ ان کا انتظام بھی ایک ہندو افسر کے سپرد تھا ۔ غزنویوں کے دورِحکومت میں بعض مشہور ہندو جرنیل ہوگزرے ہیں ۔ ان میں سب سے مشہور تلک تھا ، جس کو فارسی زبان اور ادب کا اچھا ملکہ تھا ۔ جب سلطان محمود کے بیٹے مسعود کے زمانے میں لاہور میں بغاوت ہوئی تو اسے فرو کرنے کے لیے سلطان مسعود نے تلک کو ہی بھیجا تھا اور اسے لاہور کا گورنر مقرر کیا تھا ۔

سلطان محمود کا شمار دنیا کے مشہور فاتحوں میں ہوتا ہے ۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور اسے کسی حملے میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا ۔ سلطان محمود کی پہلی ٹکر ہندو شاہیہ خاندان کے راجا جے پال سے ہوئی ۔ جے پال اس سے پہلے سلطان کے والد سبکتگین سے دو بار ذلت آمیز شکست کھا چکا تھا جب سلطان محمود تخت نشین ہوا تو جے پال نے دوبارہ لشکر کشی کی ۔ اس مرتبہ اس کی امداد کے لیے دور دور کے ہندو راجے آئے تھے ۔ اس کی فوج تعداد میں بے شمار تھی اس لیے سلطان کو بھی خاص حفاظتی تدابیر کرنی پڑیں ۔ اس مرتبہ بھی جے پال کو

میدان جنگ میں شکست فاش ہوئی اور اسے اس ذلت کا اتنا شدید احساس ہوا کہ وہ آگ میں جل کر مر گیا۔ اس کے بعد ۱۰۰۸ء میں اس کے لڑکے انند پال نے بھی ہندوستان کے تمام راجاؤں سے امداد حاصل کر کے بہت بڑی فوج تیار کی لیکن اسے بھی سلطان کے مقابلے میں منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے بعد ہندو شاہیہ ریاست کی طاقت ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ ہو گئی۔ سلطان نے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اپنی طرف سے لاہور میں حاکم مقرر کر دیا۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ایک ایک کر کے دوسرے ہندو راجاؤں پر حملے شروع کر دیے ان حملوں میں اس نے تھانیسر برن، متھرا، قنوج اور گوالیار کی ریاستیں فتح کر لیں۔ ہندو راجاؤں کو سلطان کے خلاف کھلے میدان میں آنے کی بہت کم جرأت ہوتی تھی ان کی فوجیں اس کے لشکر کی آمد آمد کا سن کر پہلے سے ہی تتر بتر ہو جاتی تھی اور راجے اور ان کے سالار میدان جنگ سے بھاگنے ہی میں اپنی جان کی سلامتی سمجھتے تھے۔ اہل ہند کے نزدیک سلطان ایسا سالار تھا جسے کبھی شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ سلطان محمود نے ہندوستان پر کل سترہ حملے کیے۔ اس کا آخری حملہ سومنات پر تھا یہ مندر کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے پر واقع تھا اور یہاں کی بندرگاہ تجارت کے لیے بھی دوسرے ملکوں میں مشہور تھی۔ یہاں تمام ہندوستان کے زائرین آتے تھے۔ اس مندر کی حفاظت کے لیے ہندو راجاؤں نے دور دور سے فوجیں بھیجیں۔ مندر کے پجاریوں نے مشہور کر دیا تھا کہ سومنات کا بت دوسرے مندروں کے بتوں سے ناراض ہے اس لیے سلطان محمود نے ان کے علاقوں کو فتح کر لیا ہے۔ لیکن اگر اس نے سومنات کا رخ کیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ سلطان محمود نے تین دن کی سخت لڑائی کے بعد اس کو فتح کر لیا اور اس طرح ان کے زعم باطل کو توڑ دیا۔

سلطان کی کامیابی کا راز اس کی بے پناہ دلیری اور فوجی نظم و ضبط میں تھا ۔ اسے فنونِ جنگ پر بھی پورا عبور حاصل تھا اس کے ساتھ وہ ہر قسم کی جنگی اور حفاظتی تدبیروں سے بھی کام لیتا تھا ۔ سلطان کی سلطنت میں خراسان ، طہران اور اصفہان تک کے علاقے شامل تھے اور اس کی فوج میں ان تمام علاقوں کے فوجی دستے ہوتے تھے اس لیے وہ ہر قسم کے طرز جنگ اور ہتھیاروں کا استعمال جانتے تھے اور اگر کسی نئے طرز جنگ سے سابقہ پڑتا تھا تو اس کے لیے بھی تیار رہتے تھے ۔

مثلاً ہندو راجاؤں کے لشکر میں ہاتھیوں کے دستے ہوتے تھے سلطان نے اپنے خاص ملازمین کو ہاتھیوں کے ساتھ جنگ کرنے کی تربیت دی تھی، اس نے ہاتھیوں کی ایک فوج بھی تیار کر لی تھی جس کے لیے اس نے ہندوؤں کو ملازم رکھا تھا ۔ سلطان علم و ادب کا بہت دلدادہ تھا ۔ اس کے دربار میں فارسی زبان کے بڑے بڑے شاعر تھے ۔ فردوسی جس نے فارسی زبان کی مشہور کتاب شاہنامہ لکھی ہے اس کا تعلق بھی محمود کے دربار سے رہا ہے سلطان بزرگوں اور صوفیا کا بھی بہت احترام کرتا تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوتا تھا ۔ تاریخ میں سلطان کا نام عدل و انصاف کے لیے کہاوت بن گیا ہے ۔ اس کی سلطنت میں ہر جگہ امن و امان رہا اور سلطان کے دبدبے کی وجہ سے فتنہ و فساد کرنے والوں اور ڈاکوؤں کی روح فنا ہوتی تھی ۔

برصغیر میں آزاد مسلم سلطنت کا قیام

غوری خاندان :

غزنوی خاندان کو زوال آیا تو غزنی میں غوریوں کی حکومت قائم ہو گئی ۔ ان کا صدر مقام فیروز کوہ تھا ۔ غور کا علاقہ افغانستان کی پہاڑیوں میں واقع ہے ۔ جب غوری خاندان کے حکمران نے غزنی

فتح کر لیا تو غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک نے لاہور میں پناہ لی۔ غیاث الدین،غور کا حکمران تھا اور اپنے بھائی شہاب الدین محمد کے ساتھ مل کر حکومت کرتا تھا۔ شہاب الدین غوری نے سب سے پہلے اُچھ اور ملتان پر حملے کرکے انھیں فتح کر لیا۔ ملتان میں اس زمانے میں قرامطہ کی حکومت تھی۔ یہ مسلمانوں کا ہی ایک بد عقیدہ فرقہ تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ اسلامی حکومت کے خلاف سازش کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد اس نے پشاور کو فتح کرکے لاہور پر فوج کشی کی۔ خسرو ملک نے جو غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا، مصلحت کے طور پر محمد غوری کے ساتھ صلح کرلی، لیکن ہندو گکھڑوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرکے جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ آخر خسرو ملک گرفتار ہو کر فیروز کوہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ پانچ سال کے بعد وفات پا گیا۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان نے آگے بڑھ کر سر ہند کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ قلعہ پرتھوی راج کی حکومت میں تھا۔ اس مرتبہ شہاب الدین کی فوج لڑائی بھڑائی میں کافی وقت گزار چکی تھی اور وہ غزنی کو واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا مگر پرتھوی راج کی آمد کی خبر سن کر لڑائی کے لیے مجبور ہو گیا۔ پرتھوی راج ایک زبردست فوج لے کر بڑھا اور دونوں فوجوں کا ۱۱۹۱ء میں تراوڑی کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں سلطان کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود زخمی ہو گیا۔ ایک جان نثار غلام اسے میدان جنگ سے باہر لے آیا۔ سلطان،غزنی پہنچا تو اس نے میدان جنگ سے بھاگنے والوں کو عبرت ناک سزا دی اور اگلے سال زبردست جنگی تیاری کے بعد دوبارہ حملہ آور ہوا۔ دوسری جنگ بھی تراوڑی کے مقام پر لڑی گئی اور اس مرتبہ سلطان کی فوجیں فتح یاب ہوئیں۔ اس فتح کے بعد غوریوں کی سلطنت دہلی اور اجمیر تک پھیل گئی۔ ۱۲۰۶ء میں جب شہاب الدین محمد غوری واپس جا رہا تھا تو اس نے راستے میں

جہلم کے کنارے قیام کیا ، وہاں رات کے وقت اسے ایک باطنی نے قتل کر دیا ۔ اس کے بعد اس کے غلام قطب الدین ایبک نے برصغیر میں ایک آزاد مسلم حکومت کی بنیاد رکھی ۔

شہاب الدین غوری اپنے زمانے کا زبردست مجاہد اور سپہ سالار تھا ۔ اس کے سرداروں اور سپاہ میں جہاد کا بے پناہ جذبہ تھا ۔ اس کے دربار میں پشتو زبان کے کئی شاعر تھے ۔ یہ لوگ جہاد میں سلطان کے ساتھ ہوتے تھے اور جنگی شعر پڑھ پڑھ کر فوج کا دل بڑھاتے تھے ۔ ہندوؤں کی فوج ، تعداد میں ٹڈی دل ہوتی تھی ۔ ان کے مقابل میں سلطان کے لشکر کی تعداد کم ہوتی تھی ، اس لیے اسے میدان جنگ میں اکثر نئی جنگی ترکیبوں سے کام لینا پڑتا تھا ۔ وہ فوج کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیتا تھا ۔ ہر ایک گروہ ایک گھیرا بنا لیتا تھا ۔ اس کی فوج کا ایک مجاہد اپنی رجز میں کہتا ہے ''اسلام کے مجاہدو ! گھیرے بنا لو دشمنوں پر ٹوٹ پڑو ۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے'' ۔ اس کے مجاہدوں نے دشمنوں پر اپنی جرأت اور مردانگی کی دھاک بٹھا دی تھی اسی لیے اس کے بعض سپہ سالاروں نے چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں سے پوری ریاستوں کو فتح کر لیا ۔ اسی زمانے میں اجمیر میں حضرت معین الدین چشتی نے اپنا روحانی مرکز قائم کیا ۔ ترائن کی جنگ کے تین سال بعد سلطان نے قنوج کے راجہ جے چند کو شکست دے کر سلطنت کی حدوں کو مونگیر اور بنارس تک پہنچا دیا ۔

سلطان کے دو جرنیلوں نے سلطنت کو اور بھی وسیع کر دیا ۔ قطب الدین ایبک نے راجپوتانے میں بیانہ ، گوالیار اور کالنجر کے قلعے فتح کر لیے اور اس طرح راجپوت راجاؤں پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ مدت تک دوبارہ نہ اٹھ سکے ۔ اس نے گجرات کے راجا کو بھی شکست فاش دی ۔ محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال کو ایک مختصر سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا اور اس طرح سلطنت کی

سرحدیں آسام اور مشرق بنگال تک جا پہنچیں ۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں میں صوفیائے کرام اور دوسرے بزرگ بھی پہنچ گئے ، جن کی وجہ سے اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچ گیا ۔

فتح بھارت کی پہلی منزل

یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزنوی اور غوری دونوں خاندانوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے ان علاقوں میں اپنی حکومت قائم کی جو آج کل پاکستان میں شامل ہیں اور یہاں پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد مشرق کا رخ کیا ۔ بعد کے مسلمان حملہ آوروں نے بھی اسی منصوبے پر عمل کیا ، مثلاً بابر نے دہلی پر قبضہ کرنے سے پہلے پنجاب کو فتح کیا ۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی مرہٹوں سے جنگ کرنے سے پہلے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی ۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان حملہ آور ان علاقوں کو جو پاکستان میں شامل ہیں،ہندوستان کی فتح کے لیے اپنی پہلی منزل سمجھتے تھے اور یہاں کے فوجی دستے ان کی فتوحات میں دست راست کا کام دیتے تھے ۔ مسلمان فاتحوں کی تعداد ، مخالف فوج سے ہمیشہ بہت کم ہوتی تھی ، لیکن وہ ہر مرتبہ اپنے اعلیٰ مقاصد ، مناسب موقعہ اور محل ، طریق جنگ اور بہادری کی وجہ سے کامیاب ہوتے تھے ۔ اس طرح ان کی فتوحات کا سیلاب جلد ہی برصغیر کی سرحدوں کو چھونے لگا ۔

عرب تاجروں کے جہاز برصغیر میں ظہور اسلام سے پہلے سے آتے جاتے تھے۔یہ جہاز بصرے سے روانہ ہو کر برصغیر کی ساحلی بندرگاہوں پر رکتے ہوئے چاٹگام تک پہنچ جاتے تھے، وہاں سے کچھ تاجر چھوٹی کشتیوں میں دریاؤں کے راستے سے سفر کرتے اور سلہٹ تک پہنچتے ۔ اس زمانے میں یہ علاقہ ریشم ، چینی اور ناریل کے لیے مشہور تھا ۔ اس علاقے میں مسلمان پہلے پہل شمال مغرب سے بارھویں صدی عیسوی میں وارد ہوئے ۔

محمد بن بختیار خلجی کی جرأت :

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بنگال کے ہندو راجا سین خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ انھوں نے بدھ مذہب کے پال حکمرانوں کی سلطنت کے مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا تھا ۔ سین حکمران در حقیقت متعصب ہندو تھے ۔ انھوں نے بدھ مذہب کے معبدوں کو برباد کر دیا اور ہندو مذہب کو پھیلانے کے لیے برصغیر کے دوسرے علاقوں سے پنڈت منگوائے ۔ جب قطب‌الدین ایبک نے دہلی پر قبضہ کیا تو اس کے جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال کی طرف پیش قدمی کی ۔ سب سے پہلے اس نے دو سو آدمیوں کے ایک دستے کے ساتھ بہار پر قبضہ کر لیا ۔ یہ علاقہ ابھی تک پال خاندان کے قبضے میں تھا ۔ اس کے بعد اس نے سین خاندان کے صدر مقام ندیا کا رخ کیا ۔ اس کی فوج پیچھے رہ گئی تھی ۔ جب وہ شہر میں داخل ہوا تو شام کا وقت تھا اور اس کے ہمراہ صرف اٹھارہ سپاہی تھے ۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ نووارد کوئی اجنبی سوداگر ہیں ۔ کسی نے مزاحمت نہ کی ۔ محمد بن بختیار خلجی اور اس کے ہمراہی شاہی محل میں داخل ہو گئے ۔ محل کے محافظ اور سین خاندان کا آخری راجا ، لکشمن سین ، سراسیمہ ہو کر راج محل کی پچھلی جانب سے بھاگ نکلا اس طرح بنگال پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی اور دہلی کی سلطنت کا صوبہ قرار پایا ۔

فیروز تغلق کے زمانے تک بنگال دہلی کی سلطنت میں شامل رہا ۔ بعد میں یہ صوبہ آزاد ہو گیا اور یہاں دو سو سال تک ایک آزاد مسلم سلطنت قائم رہی ۔ بالآخر اکبر کے زمانے میں بنگال پھر فتح ہو کر مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا ۔

اسلام کی اشاعت سے بنگال کے عوام کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آ گئی ۔ یہاں کے عوام زیادہ تر غیر آریائی نسل سے تھے ۔ برہمن اور حکمران طبقہ، آریائی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور یہ دونوں

اونچے طبقے میں شمار ہوتے تھے ، جس کے بوجھ تلے ، نچلے طبقے کے عوام پسے جا رہے تھے ۔ نچلے طبقوں کو ہندو برادری سے خارج سمجھا جاتا تھا ۔ اسلام نے ان کو انسانی عظمت اور مساوات کا سبق دیا ۔ اس سے ان کی زندگی میں تبدیلی آنے لگی ۔ مسلم حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمان صوفیوں اور بزرگوں کی بھی آمد شروع ہو گئی ۔ حضرت جلال‌الدین تبریزی تو ابتدا ہی میں بنگال میں آ گئے تھے ۔ انھوں نے اپنی پاکیزہ زندگی میں محبت اور ہمدردی سے اسلام کا پیغام عوام تک پہنچایا ، اس کا جتنا اثر اس علاقے میں ہوا ، برصغیر میں اور کہیں نہیں ہوا ۔

بنگال کے آزاد سلاطین کے پہلے خاندان کا بانی حاجی شمس‌الدین الیاس تھا ۔ وہ پورے بنگال کا خود مختار حکمران تھا ۔ اس کے خاندان نے ایک سو سال کے لگ بھگ حکومت کی ۔ اس خاندان کے بعد سلطان علاؤالدین حسین کا خاندان برسراقتدار آیا ۔ یہ نسل کے لحاظ سے عرب اور سادات میں سے تھے ۔ ان کی حکومت بابر کے زمانے تک رہی ۔ ان کا عہدِ حکومت بنگال کی تاریخ کا سنہری دور کہلانے کے قابل ہے ۔ ان کے زمانے میں سلطنت کے مختلف حصوں میں مسجدیں اور شفا خانے تعمیر کیے گئے ۔ چھوٹا سونا مسجد ، بڑا سونا مسجد اور قدم رسول کی مسجد اسی عہد کی یادگاریں ہیں ۔ اس خاندان نے بنگالی زبان کی ترقی میں بھی نمایاں حصہ لیا ۔ اس دور میں بہت سی سنسکرت اور فارسی کی کتابیں بنگالی زبان میں ترجمہ ہوئیں ۔

اشاعت اسلام میں صوفیا کا کردار :

بعض مغربی مؤرخین کا کہنا ہے کہ برصغیر میں مسلمان بادشاہوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا ۔ یہ درست نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آگرہ اور دہلی جیسے شہروں میں ، جہاں سیکڑوں سال مسلمانوں کی حکومت رہی ، مسلمانوں کی تعداد اتنی کم نہ ہوتی ۔ برصغیر میں اسلام، مسلمان صوفیوں اور عرب تاجروں کے ذریعے

پھیلا ۔ اس کی اشاعت میں صرف ان حکمرانوں نے امداد دی ، جنھوں نے لوگوں کے سامنے عدل و انصاف اور اسلام کے اصولوں کا اچھا نمونہ پیش کیا ۔ سندھ میں محمد بن قاسم کی حکومت نے لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی حکومت کے زمانے میں یہاں کے حکمران طبقے کو دعوتِ اسلام دی تو ان میں سے ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا ۔

برصغیر میں ساحلی بندرگاہوں پر اسلام کا پیغام عرب تاجروں نے پہنچایا ۔ یہاں کی بحری تجارت ایک عرصے سے عرب تاجروں کے ہاتھ میں تھی ۔ ان بندر گاہوں کے ہندو راجا ، عرب تاجروں کو اپنی ریاست کی خوشحالی اور فارغ البالی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ اس لیے وہ ان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتے تھے ۔

ان بندر گاہوں پر عرب تاجروں کی نو آبادیاں تھیں اور بحری بیڑے اور ملکی تجارت میں عربوں کی خاص اہمیت تھی ۔ جب کرانگانور بندرگاہ کا راجا ایک عرب بزرگ شیخ شریف اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ پر ایمان لے آیا تو مسلمانوں کو ریاست میں مسجدیں بنانے کی اجازت دے دی گئی ۔ شیخ شریف نے اپنا مرکز کرانگانور میں قائم کیا ۔ ان کے ساتھی ریاست کا دورہ کرتے، جہاں پہنچتے وہاں مسجد تعمیر کرواتے تھے ۔ اس طرح اس زمین میں اسلام کا پیغام قصبے قصبے میں پہنچ گیا ۔ یہاں ایک قوم "موپلا" آباد تھی وہ بھی چند ایسے بزرگوں کے ہاتھ پر اسلام لائی جو عراق سے آئے تھے ۔

شمالی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت محمود غزنوی کے زمانے سے شروع ہوئی ۔ ۱۰۰۵ء میں شیخ اسماعیل بخاریؒ لاہور آئے ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے وعظ میں روزانہ سننے والوں کا بڑا ہجوم ہوتا تھا ، جسے سننے کے بعد سیکڑوں لوگ روزانہ اسلام قبول کرتے ۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے فیضان کے اس سلسلے کو جاری رکھا ۔ آپ کے اثر سے لاہور کے گوالے اور دوسرے عوام دائرۂ اسلام میں

داخل ہوئے ۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری نے پنجاب سے گزر کر اپنا مرکز ایسی جگہ قائم کیا، جو پرتھوی راج کی عمل داری میں واقع تھا ۔ اس وقت تک دہلی میں اسلامی حکومت کا قیام نہیں ہوا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی سے اجمیر کے سفر کے دوران آپ کے ہاتھ پر سات سو آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ آپ کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ آپ کے ذریعے ایک ایسا ہندو جوگی بھی ایمان لایا جو راجا پرتھوی راج کا گورو تھا ۔ اس کا عوام پر بڑا اچھا اثر ہوا اور وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ حضرت بابا فرید نے اپنے اصلی وطن کو ترک کر کے اپنا مرکز اجودھن (پاک پتن) میں بنایا جو پنجاب کے سرکش اور جنگ جو قبائل کی سرزمین میں تھا ۔ آپ کے زیر اثر ان قبائل کی سولہ قوموں نے اسلام قبول کیا ۔ اس طرح آپ کے مرید حضرت علاءالدین صابر نے اپنا مرکز کلیر میں قائم کیا ، جو ہندوؤں کے مقدس مقامات کے قرب و جوار میں تھا اور جہاں دور دور تک کسی مسلم آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ اس طرح یہ بزرگ اپنے مشن کو برصغیر کے دور دراز گوشوں تک پھیلاتے اور اپنا پیغام عوام کے سینوں میں اتارتے چلے گئے ۔

محمد تغلق نے دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تو اس کو دکن کی سرزمین میں بھی اشاعت اسلام کا موقعہ ملا ۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک خلیفہ حضرت خواجہ گیسو دراز نے پونا میں ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان کیا ۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے بلگام کے شہر میں پورے بیس برس قیام کیا ۔ اسی طرح سید علی ہمدانی سات سو سادات کے ساتھ ہمدان سے کشمیر آئے ۔ ان کے ہاتھوں پر کشمیر کے حکمران خاندان نے اسلام قبول کیا اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے کشمیر کے گوشے گوشے میں اسلام کا پیغام پہنچ گیا ۔

کامیابی کے اسباب :

مسلم صوفیا کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دعوت اسلام پر زور دینے کی بجائے عوام کے سامنے پاکیزہ زندگی کا ایسا نمونہ پیش کرتے تھے ، جس سے ان کے دل خود بخود ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے ۔ وہ عوام کی زبان بولتے تھے اور اسی زبان میں شعر کہتے تھے ۔ اس طرح انھوں نے مقامی بولیوں کے ادب میں بھی گراں بہا اضافہ کیا ۔ عوام پر اس سے زیادہ اثر اسی گروہی زندگی کا ہوا جو یہ بزرگ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے مرکزوں میں گزارتے تھے ۔ یہ لوگ مل جل کر رہتے تھے ۔ اکٹھے عبادت کرتے اور ایک ساتھ ہی اپنی روزی کا انتظام کرتے تھے ۔ خانقاہ کے بزرگ کو جو نذرانہ ملتا تھا وہ شام تک غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ اس طرح سے وہ عوام کی اقتصادی مشکلات کو بھی حل کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔

اسلام قبول کرنے سے غریب طبقے کے افراد کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جاتی تھی ۔ ایک انگریز مصنف کے قول کے مطابق جب اودھ میں نیچ ذات کے کاشتکاروں پر ان کے ہندو زمیندار زیادتی کرتے تھے تو وہ مسلمان ہو کر مسلم زمینداروں کی پناہ میں چلے جاتے تھے ۔ مسلمان ہو کر ان کے سامنے اقتصادی لحاظ سے کئی ایک ایسی راہیں بھی کھل جاتی تھیں جن کو ذات پات کی غیر انسانی قیود نے مسدود کر رکھا تھا ۔

پاکستان اور اسلام :

بنگال میں اسلام کی بے پناہ اشاعت اور مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے نچلے طبقوں کے مذہبی اور معاشی حالات پست تھے ۔ یہاں کی آبادی کا زیادہ حصہ غیر آریائی نسل کے لوگوں کا تھا ، جس پر آریا نسل کے حکمران مسلط تھے ۔ ان حکمرانوں کے مشیر برہمن تھے ، جن کی نظر میں یہ علاقہ آریا ورت کا حصہ نہیں

تھا ، بلکہ ملیچھوں یا ناپاک لوگوں کا علاقہ تھا - سین خاندان کے پہلے راجا نے قنوج کے برہمنوں اور کائستھوں کو بھی بڑی تعداد میں بنگال آنے کی دعوت دی اور اس کے ایک جانشین نے حکم دے دیا تھا کہ یہ لوگ مقامی باشندوں کے ساتھ رشتے ناطے نہ کریں - یہ لوگ یہاں کے ہندوؤں اور اصل باشندوں کو ہندو مذہب سے خارج سمجھتے تھے اور دستکاروں مثلاً جولاہوں وغیرہ کو نہایت نیچ سمجھتے تھے۔ وہ سنسکرت کے مقابلے میں بنگالی زبان کو ملیچھوں کی زبان کہتے تھے - جب مسلمان بنگال میں پہنچے تو انھوں نے مذہب اور معاشرے کو بالکل بدل کر رکھ دیا - حضرت جلال الدین تبریزی جو شہاب الدین سہروردی کے خاص خلفا میں سے تھے ، یہاں التتمش کے زمانے میں آئے۔ ان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگ مسلمان ہوئے -

یہ بزرگ محض نیکی اور اخوت کا پیغام ہی نہیں پھیلاتے تھے بلکہ عدل و انصاف کے نام پر کبھی کبھی تلوار بھی اٹھاتے تھے - شاہ جلال سلہٹی ایک مجاہد صوفی تھے اور جب سلہٹ کے راجا نے گئو کشی کے الزام میں ایک مسلمان کے اکلوتے بیٹے کو قتل کرا دیا تو انھوں نے سلطان کی فوج کے ساتھ مل اس کے خلاف جہاد کیا اور اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا -

سوالات

۱ - برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے اسباب پر وضاحت سے روشنی ڈالیے -

۲ - محمد بن قاسم نے سندھ پر قابض ہونے کے بعد سندھی لوگوں سے کیا سلوک کیا ؟

۳ - مسلمانوں کی آمد سے برصغیر کے باشندوں کی معاشرتی زندگی میں کیا انقلاب آیا ؟

۴ - برصغیر میں اسلام کی اشاعت میں صوفیائے اکرام نے جو کردار ادا کیا ، اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیے -

باب ۳

سلاطین دہلی کے زمانے میں سلطنت کے اصول

ہندوؤں کے زمانے میں لوگ حکمران کو دیوتا ، سروپ یا خدا کا اوتار مانتے تھے اور اقتدار اعلیٰ اسی کو حاصل تھا ۔ وہ ایسا خود مختار حکمران ہوتا تھا جو ملکی قانون سے بالا تر سمجھا جاتا تھا ۔ ہندوؤں کا قانون کسی الہامی کتاب پر مبنی نہیں تھا ۔ قانون سازی برہمنوں کے ہاتھ میں تھی ۔ خود ان کے لیے جرموں کی سزائیں عوام کے مقابلے میں بہت نرم تھیں ۔

مسلم دور میں عام طور پر شریعت کو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا ، جس کے سامنے حکمران اور رعایا دونوں برابر تھے ۔ اس لیے حکمران طبقے کے افراد کو بھی موقع پر قاضی کی عدالت میں عوام کے برابر کھڑا ہونا پڑتا تھا اور شریعت کے اقتدار اعلیٰ کو بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا تھا ۔

سلاطین دہلی اور خلافت :

محمد بن قاسم کی فتح کے بعد ، سندھ مسلم سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا ۔ اس کے سربراہ بنوامیہ کے خلیفہ تھے ۔ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد اسلامی سلطنت کا حاکم اعلیٰ خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا اور وہ پوری اسلامی دنیا کا سربراہ ہوتا تھا ۔ وہ اسلامی دنیا کے اتحاد اور اتفاق کا نشان تھا ۔ جب خلافت کمزور

ہو گئی تو صوبے خود مختار ہوتے گئے اور ان کے حکمران سلطان کہلانے لگے ، لیکن وہ اب بھی اصولی لحاظ سے خلیفہ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے تھے - ہر نیا سلطان، خلیفہ کی بیعت اور اطاعت کا دم بھرتا اور خلیفہ سے اپنی حکومت کی سند اور خلعت حاصل کرتا تھا - جمعہ اور عیدین کے خطبے ، خلیفہ کے نام پر پڑھے جاتے اور اس کا نام سکّوں پر بھی کندہ کیا جاتا تھا -

برصغیر کے مسلمان حکمران بھی خلیفہ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے تھے ۔ سلطان محمود نے بغداد کے خلیفہ قادر باللہ سے سلطنت کی سند حاصل کی - خلیفہ کی طرف سے اسے ''امین السلطنة'' اور ''یمین الدولہ'' کے خطاب بھی عطا کیے گئے ۔ سلطان جب کوئی بڑی فتح حاصل کرتا تو فتح نامے کے ذریعے اس کی اطلاع خلیفہ کو دی جاتی تھی - خلیفہ ان موقعوں پر ایک خاص دربار منعقد کرکے سفیر کے ہاتھ سلطان کو خلعت ارسال کرتا - سومنات کی فتح کے بعد بھی سلطان کو خلعت بھیجا گیا -

سلطان التتمش نے بھی سند حاصل کرنے کے لیے خلیفہ بغداد کے پاس سفیر بھیجے اور جب وہ سند لے کر واپس آئے تو اس کی خوشی میں جشن منایا گیا - محمد غوری کے غلاموں میں سے دو غلام ایک دوسرے کے مقابل سلطنت کے دعوے دار تھے ، لیکن اس سند کے جاری ہونے کے بعد التتمش کا حق تسلیم کر لیا گیا - اس طرح محمد بن تغلق نے بھی خلیفہ کی خدمت میں سفیر بھیجے اور جب تک وہ واپس نہیں آئے ، سلطنت میں جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں پڑھائی گئی - فیروز تغلق کو بھی خلیفہ کی طرف سے تین بار خلعت عطا ہوا - اسی طرح اس دور میں برصغیر کے مسلمانوں نے خلافت اور پوری مسلم دنیا کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھا - پاکستان آج بھی مسلم دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کیے ہوئے ہے اور اسے زیادہ استوار بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے -

حکمران کا انتخاب:

مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں تخت نشینی کا کوئی مسلّمہ اصول نہ تھا۔ یہ بات ضروری نہیں تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہی تخت پر بیٹھے۔ دارالسلطنت کے امرا بادشاہ کے انتخاب میں حصہ لیتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے انتخاب میں تو اس زمانے کے علماء اور صوفیا نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ اگر انتخاب نہیں بھی ہوتا تھا پھر بھی تخت نشینی کے لیے امرا کی علانیہ یا پوشیدہ رضامندی حاصل کرنا ضروری ہوتی تھی۔ بعض حکمران اس وقت کے خلیفہ اسلام سے اپنے لیے سند اور خلعت حاصل کرتے اور اس کے بعد عوام سے بیعت لیتے تھے۔ اس رسم کا مقصد یہی تھا کہ ان کی تخت نشینی کی تصدیق عوام کی طرف سے بھی ہو جائے۔

صلاح مشورہ:

حکمران کو عام طور پر حکومت کی پالیسی مرتب کرنے کے لیے بعض گروہوں سے مشورہ کرنا پڑتا تھا، ان میں سب سے پہلے تو اس کے اپنے وزراء کی کونسل ہوتی تھی، اس کے علاوہ اہم امور میں امراء سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں امرا کے بعض گروہ بڑے با اثر تھے۔ ان میں زیادہ مشہور امرائے چہل گانی اور امرائے صدہ تھے۔ ان کو امرائے چہل گانی اور امرائے صدہ اس لیے کہتے تھے کہ ان گروہوں میں چہل یا چالیس یا صد یعنی سو بڑے امیر شامل تھے۔ ملکی مصلحت کے لیے ان کا تعاون نہایت ضروری ہوتا تھا۔ ملکی پالیسی کے شرعی پہلو میں علماء کی رائے لینا ضروری تھا۔

عدل و مساوات:

نظام حکومت میں عدل و انصاف کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، جس کے سامنے بادشاہ اور رعایا میں کوئی تمیز

روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ عدل و انصاف کے اصول پر برصغیر میں شروع سے ہی نہایت سختی سے عمل کیا گیا۔ سلطان محمود غزنوی کے عدل و انصاف کے قصے تو درباری حلقوں سے نکل کر کہاوتوں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، لیکن سلاطین دہلی نے بھی اس اصول کی پابندی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ التتمش نے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگوا دی تھی۔ اس کا عام فرمان تھا کہ مظلوم کے سوا کوئی اور شخص سرخ لباس نہ پہنے تاکہ بادشاہ کسی کی وساطت کے بغیر مظلوم کو پہچان لے اور اس کی داد رسی کرے۔ بلبن نے تو عدل و انصاف کی خاطر صوبوں کے گورنروں اور ان کے معمولی ملازمین کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ بعض مسلمان حکمرانوں نے انصاف کے معاملے میں ایک عام آدمی کے مقابلے میں اپنے عزیزوں کو بھی سزائے موت دینے سے دریغ نہیں کیا۔ اگر بادشاہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو بادشاہ کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ محمد تغلق نے بھی ایک مرتبہ خود ایک مقدمے میں عدالت میں حاضری دی تھی۔ مغلیہ حکومت کے زمانے میں جو یورپی سیاح برصغیر میں آتے رہے وہ یہاں کے قاضیوں کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قاضی فیصلہ جلد کرتے تھے اور عدل و انصاف کا حق ادا کرتے تھے۔

مضبوط مرکزی حکومت:

انتظام مملکت کے لیے ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے سیکڑوں سال کے بعد برصغیر میں حکومت کو مرکزیت بخشی، جس سے ملک میں امن و امان قائم ہوا اور ملک بیرونی حملہ آوروں سے بھی محفوظ ہو گیا۔ برصغیر میں جب خاندان غلاماں کی حکومت کا آغاز ہوا تو اس کے ساتھ ہی منگولوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے

حملوں سے ایشیا اور یورپ کے ملکوں پر تباہی آئی ۔ لیکن ایک مضبوط مرکزی حکومت کی وجہ سے مسلمان سلاطین ، برصغیر کو ان کے حملوں سے بچانے میں کامیاب ہوگئے ۔ اس کے لیے انھوں نے شمال مغربی سرحدوں پر حفاظت کا زبردست انتظام کیا اور ملک کے بہترین جرنیلوں اور شاہی خاندان کے افراد کو مقابلے کے لیے بھیجا ۔

فلاحی مملکت :

مسلمان حکومتیں اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی تھیں ۔ سلاطین دہلی معاشرتی اور اخلاق زندگی کو بہتر بنانے کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ اسلامی روایت کے مطابق ہر بڑے شہر میں ایک محتسب مقرر ہوتا تھا جس کا عملہ لوگوں کے اخلاق کی نگرانی کرتا تھا ۔ منڈی میں باٹ اور نرخوں کی نگرانی بھی محتسب کے سپرد ہوتی تھی ۔ سلاطین دہلی نے شراب خوری اور جوئے بازی کو بند کرنے کی بھی کوشش کی ۔ انھوں نے ستی کی رسم پر بھی پابندی عائد کر دی تھی ۔

مسلمان حکمران اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ عوام کو ضروریات زندگی سستی اور آسانی سے مہیا ہو سکیں ۔ اس کے لیے محتسب کا محکمہ نرخوں کی نگرانی کرتا تھا ۔ اس ملک میں نرخوں پر کنٹرول ، سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی نافذ کیا ۔ علاؤالدین خلجی نے بہت سی چیزوں کے نرخ مقرر کر دیے تھے ، جس سے اشیائے خوردنی ارزاں ہو گئیں ۔ شاہی گوداموں میں غلہ محفوظ رکھا جاتا ، جو قحط کے دنوں میں کام آتا ۔ خاندان غلاماں کا پہلا بادشاہ اپنی سخاوت کی وجہ سے "لکھ بخش" کہلاتا تھا ۔ اس کے زمانے میں علما اور فقہا کو سرکاری خزانے سے تنخواہیں ملتی تھیں ۔ بادشاہ درویشوں ، بیواؤں اور یتیموں کی امداد کرتا تھا ۔ فیروز شاہ تغلق نے اس بات کا انتظام کیا تھا کہ بیروزگاروں کو روزگار مہیا کیا

جائے ۔ شیر شاہ کے زمانے میں مسافروں کے لیے سرائیں بنوائی گئیں، جہاں ان کو سرکار کی طرف سے کھانا ملتا تھا ۔ سکندر لودھی کھانا پکوا کر غریبوں اور مستحقوں میں تقسیم کرتا تھا ۔ اس نے خیرات کے لیے جمعے کا دن مقرر کر رکھا تھا ۔ سلاطین کے زمانے میں کوئی امیر تنہا کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ اس کے دسترخوان پر سیکڑوں ضرورت مند آ کر بیٹھتے تھے ۔ بعض امیر تو غریب پروری میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے ۔

فیروز شاہ تغلق کو معلوم ہوا کہ دہلی کے اندر بہت سی سرکاری زمینوں اور مکانوں کا کرایہ غریبوں اور بیواؤں سے وصول کیا جاتا ہے تو اس نے منادی کر کے حکم دے دیا کہ ان سے کوئی کرایہ وصول نہ کیا جائے ۔ اسی طرح فیروز تغلق، جہانگیر اور اورنگ زیب نے بہت سے غیر شرعی ٹیکس منسوخ کر دیے ۔ فیروز شاہ نے غریب اور نادار والدین کی بچیوں کو جہیز مہیا کرنے کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا ۔

مغل بادشاہوں نے بھی فیاضی اور غریب پروری کی بہت روشن مثالیں قائم کیں ۔ خیرات و حسنات کے محکمہ سے عالموں اور طالب علموں کو وظیفے ملتے تھے ۔ اس محکمے کا افسر اعلیٰ ''صدر حسنات'' کہلاتا تھا ۔ قحط زدہ علاقوں میں روپیہ، پکا ہوا کھانا اور کچی رسد بھی اسی محکمے کی طرف سے دی جاتی تھی ۔ مددِ معاش کے لیے بے انداز عطیے دیے جاتے تھے ۔ جہانگیر کے زمانے میں صدر الصدور نے پانچ سال کے عرصے میں غریبوں، محتاجوں اور دوسرے مستحق طبقوں کو اس قدر امداد دی کہ سرکاری خزانے پر بہت بوجھ پڑا ۔ آخر جہانگیر نے اس محکمے کا انتظام خود سنبھال لیا ۔

بقر عید کے موقعوں پر بادشاہ بہت داد و دہش کرتے تھے اور ہزاروں افراد کو اپنے دستر خوان پر کھانا کھلاتے تھے ۔

مسلم حکمران کسانوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے - ان کو زمینیں آباد کرنے کے لیے آسان شرطوں پر قرضہ دیا جاتا تھا اور قحط سالی کے زمانے میں لگان معاف کر دیا جاتا تھا -

اسلام کی خوبیاں اور ہندو معاشرے پر ان کا اثر :

اسلام ، انسانی مساوات ، اخوت اور ہمدردی کا مذہب ہے - اس میں ذات پات اور چھوت چھات کے لیے کوئی جگہ نہیں - مسلمانوں میں انسان کی عظمت اور شرف کا خیال گھر کر چکا تھا - اس کا عملی ثبوت خاندان غلاماں کی تاریخ سے ملتا ہے - اگر کسی غلام میں قابلیت کا جوہر موجود ہوتا تو وہ معاشرے میں سب سے اونچا مقام حاصل کر سکتا تھا - سلطان ، حکومت کا سربراہ ہوتا تھا - جمعہ اور عیدین کے موقعہ پر عام لوگوں کے ساتھ شریک ہو کر نماز ادا کرتا تھا - تغلق خاندان کے حکمران عید کا کھانا عوام کے ساتھ مل کر کھاتے تھے - غیاث‌الدین تغلق اور فیروز تغلق کا تو یہ اصول تھا کہ وہ ہر طبقے کے افراد سے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے - ہندوؤں میں برہمنوں کا ایک ایسا طبقہ تھا ، جس کی مذہب ، علم ، قانون اور انتظام حکومت میں مکمل اجارہ داری تھی - لیکن اس کے برعکس ہر مسلمان رنگ و نسل سے بے نیاز اپنی محنت ، ہمت اور کوشش سے بڑے سے بڑے مرتبے اور اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا تھا -

ہندوؤں کے شودروں پر مظالم :

جس زمانے میں مسلمان شمالی ہندوستان میں آئے ، اس وقت تک ہندوؤں میں ذات پات کی پابندیاں بڑی سخت ہو چکی تھیں - ویسے تو آریاؤں کے زمانے ہی سے شودروں کو وید سننے کی سخت ممانعت تھی، لیکن بعد کے قانون بنانے والوں نے تو ان پر اور زیادہ پابندیاں عائد کر دی تھیں - بلکہ ایک ہندو قانون دان نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی شودر کسی برہمن کے پاس بیٹھنے کی جرأت کرے تو اس کے جسم کو گرم لوہے سے داغ دیا جائے - اگر وید کے الفاظ

اس کے کان میں پڑ جائیں تو اُن میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے تا کہ وہ باقی عمر کے لیے بہرا ہو جائے۔ شودر کو اونچی ذات کے ہندوؤں سے کم از کم ۳۰ قدم دور رہنا ضروری تھا۔ شودروں کو بستی سے باہر رہنے کے لیے جگہ دی جاتی تھی۔

قانون کی نظر میں بھی ہندوؤں کے سب طبقے آپس میں برابر نہیں تھے۔ کھشتری یا برہمن سے خواہ کتنا ہی بڑا جرم سرزد ہو، انھیں موت کی سزا نہ دی جاتی تھی۔ البتہ ان کی جائداد کو ضبط کر لیا جاتا تھا یا انھیں جلا وطن کر دیا جاتا تھا۔ ملزم پر الزام کو ثابت کرنے کے لیے کبھی تو اسے دریا میں پھینک دیا جاتا یا تیل کو جوش دے کر ملزم سے کہا جاتا کہ وہ اپنا ہاتھ اُبلتے ہوئے تیل میں ڈال دے۔ اگر اسے ان آزمائشوں میں کوئی گزند نہ پہنچتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔

ہندو معاشرے میں ذات پات کی یہ پابندیاں صدیوں سے چلی آ رہی تھیں اور اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں کبھی کسی دوسرے معاشرے کو دیکھنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ ہندو مذہب میں غیر ملکوں میں جانے کی سخت ممانعت تھی اور انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ برصغیر کے باہر بھی ایک ایسی دنیا آباد ہے، جس کا اپنا معاشرہ اور اپنے علوم وفنون ہیں۔ البیرونی جب برہمنوں کے ساتھ علمی بحث کرتا تھا اور انھیں اسلامی علوم کے بارے میں بتاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ اس شخص کو یہ باتیں رات کو کوئی بھوت پریت سکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندوؤں کو ایک نئے معاشرے کے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔

برصغیر پر اسلامی اثرات:

مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے برصغیر پر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی جس سے کسی حد تک بیرونی حملہ آوروں کا سدباب ہو گیا اور اندرون ملک، امن و امان کو استحکام ملا۔ کسانوں پر

مالیے کا بوجھ بھی بہت ہلکا ہو گیا - غیر شرعی ٹیکس ختم کر دیے گئے - اس طرح سے کسانوں اور شہری آبادی کے حالات بہتر ہو گئے

مسلمانوں کے آداب معاشرت ، ان کے لباس اور رہنے سہنے کے انداز کا ہندوؤں کے اونچے طبقے پر خاصا اثر ہوا - پہلے وہ تنگ و تاریک مکانوں میں رہتے تھے - اب کھلی اور ہوا دار عمارتیں بنانے لگے - ان کے لباس اور معاشرت میں بھی تبدیلی آنے لگی - ان کی عورتوں میں پردے کا رواج ہو گیا اور ستی کی رسم پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئیں - لیکن ہندو معاشرے پر سب سے گہرا اثر اس بات کا ہوا کہ علم اور مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری کم ہو گئی - اب تک تمام علوم سنسکرت زبان میں تھے اور اونچے طبقے کو اس زبان کے سیکھنے کی ممانعت تھی ، مسلم صوفیا اور بزرگوں نے اپنا پیغام عوام کو ان کی مقامی بولیوں میں دینا شروع کیا - اس سے ان کے علم و ادب میں بہت اضافہ ہوا - آخر کار خود ہندو معاشرے میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے ، جنھوں نے ہندو مذہب کو نئی راہوں پر لگا دیا - یہی لوگ بھگتی تحریک کے علم بردار تھے -

ہندوؤں میں اصلاحی تحریکیں :

ہندو مذہب کی اصلاح کی یہ تحریک جسے "بھگتی تحریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، آٹھویں صدی میں جنوبی ہند سے شروع ہوئی - اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام پہلے پہل جنوب کے ساحلی بندرگاہوں سے برصغیر میں داخل ہوا تھا - بھگتی تحریک کا رہنما شنکر اچاریہ ملیبار کا رہنے والا تھا - اس نے مسلمانوں کی توحید کے اصولوں پر بہت زور دیا - اس کے بعد تحریک کے دوسرے رہنماؤں نے دیکھا دیکھی انسانی مساوات اور اخوت کے اصولوں کی اشاعت شروع کی ، جس کا عملی نمونہ مسلمان صوفیا نے پیش کیا تھا - اس طرح بھگتی تحریک نے ذات پات کے بندھنوں اور برہمنوں کی اجارہ داری پر کاری ضرب لگائی - رامانج جو مدراس کے قریب وجوار

کا رہنے والا تھا ، اپنی مجلسوں میں شودروں کو بھی شامل ہونے کا موقعہ دیتا تھا ۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شودروں کو مندروں میں داخل ہونے اور عبادت کرنے کی آزادی ہونی چاہیے ۔

الہ آباد کے رامانند کے تو مسلم صوفیا سے گہرے مراسم تھے۔ اس تحریک کے دو مشہور رہنما بھگت کبیر اور دادو، مسلمان گھرانوں میں پروان چڑھے ۔ کبیر کے ہندو سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کے خاندان میں عید بقر کو گائے کی قربانی دی جاتی تھی ۔ کبیر کے لڑکے کا نام کمال تھا ۔ اسی طرح دادو کا اصلی نام داؤد تھا جو عُرفِ عام میں دادو ہو گیا ۔ ان کے گیتوں میں مسلمانوں کے صوفی شاعروں کا رنگ صاف طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ پنجاب میں اس تحریک کے سب سے مشہور رہنما گورو نانک ہوئے ہیں ۔

نانک ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں تلونڈی میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے ۔ آج کل یہ جگہ ننکانہ صاحب کے نام سے مشہور ہے ۔ انھیں بچپن ہی سے غور و فکر کی عادت تھی اور دنیاوی کاموں سے دلچسپی نہیں تھی ۔ وہ تیس برس کی عمر میں فقیر ہو گئے اور دور دور کے علاقوں کی سیاحت پر روانہ ہو گئے ۔ سادھوؤں اور مسلمان صوفیوں کی صحبت کا فیض اٹھایا اور اس کے بعد خدا کی وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی ۔ وہ بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھتے تھے ۔ انھیں ذات پات سے سخت نفرت تھی ۔

وہ خود غرضی ، دنیاداری اور جھوٹ کے خلاف وعظ کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ نانک کے خیالات میں واضع طور پر اسلامی تعلیم کی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسلمان آج بھی نانک کو مسلمان سمجھتے ہیں ، تاہم جس فرقے نے نانک کی تعلیم کو خاص طور پر اپنایا ، وہ سکھ تھے ۔

بنگال میں آبادی کا زیادہ حصہ چونکہ غیر آریائی نسل کا تھا ،

اس لیے وہ برہمنوں اور حکمران طبقے کی زیادتیوں کا بری طرح شکار رہا ۔ ان کو ہندو مذہب کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا ۔ بھگتی تحریک کی آواز پر یہاں کے عوام نے بہت جوش سے لبیک کہا اور ان علاقوں میں اس تحریک کا بہت گہرا اور دیرپا اثر ہوا ۔ بنگال میں اس تحریک کا سب سے بڑا رہنما چیتنیہ ہو گزرا ہے ، اس پر مسلمانوں کے مل جل کر عبادت کرنے کے طریقے کا بڑا گہرا اثر ہوا ۔ ہندوؤں کے مندروں کی تعمیر اس طرز پر کی جاتی تھی کہ عبادت کرنے والے ایک ایک کر کے اس کمرے میں جہاں مورتی رکھی ہوتی تھی ، داخل ہوتے تھے ۔ چیتنیہ نے اسلام سے اجتماعی عبادت کے طریق کو اپنایا اور کیرتن یا مل جل کر مذہبی گیت گانے کے طریق کو رواج دیا ۔

مسلم دور میں ہندو :

مسلم حکومت میں ہندوؤں کی قانونی حیثیت کو محمد بن قاسم نے متعین کیا اور انھیں وہ تمام رعایتیں دیں جو اسلامی حکومت میں اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو حاصل تھیں ۔ برائے نام جزیے کے عوض ان کو ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی تھی ۔ ان کے لیے تجارت اور صنعت و حرفت کی راہیں کھلی تھیں ۔ لگان کی فراہمی کا کام برہمنوں کے سپرد تھا ۔ بعد کی مسلم حکومتوں میں بھی یہ کام ہندو عملے کے سپرد رہا ، بلکہ جنوبی ہند کی مسلم ریاستوں مثلاً بیجاپور اور احمد نگر میں تو ان کو یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ اپنے حسابات مرہٹی زبان میں رکھیں ۔

پیادہ فوج کے زیادہ سپاہی ہندو ہوتے تھے ۔ ہندوؤں کو فوج میں ملازم رکھنے کی روایت محمد بن قاسم اور اس کے بعد محمود غزنوی نے ڈالی تھی ۔ محمد بن قاسم کے زمانے میں زط (جاٹ) قوم کے افراد مسلم فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور مسلم مملکت میں دور دور کی سرحدوں پر فوجی خدمات انجام دیتے تھے ۔ سلطان محمود غزنوی کے

ہاں تو ہندوؤں کے علیحدہ دستے ہوتے تھے - جن کا افسر بھی ہندو ہوتا تھا اور "سالار ہندوؤاں" کہلاتا تھا - اس طرح اس کے ہاتھیوں کے دستے کا انتظام بھی ہندو ملازمین کے سپرد تھا -

کسان زیادہ تر ہندو ہوتے تھے اور حکومت ان کا بہت خیال رکھتی تھی - مسلمان سلاطین کے زمانے میں مالیہ کی مقدار پیداوار کا ½ یا زیادہ سے زیادہ ⅓ ہوتی تھی - ہندو حکومتیں مالیے کے علاوہ کسانوں سے کئی قسم کے ٹیکس وصول کرتی تھیں - فیروز تغلق نے بے شمار ٹیکس منسوخ کر دیے، جس سے کسانوں کی حالت بہت سدھر گئی - اس نے جنوبی پنجاب میں نہریں بنوا کر بہت بڑے رقبے کو کاشت کے قابل بنا دیا - یہاں کے کسانوں کو اس سے پہلے گندم میسر نہ آتی تھی - نہروں کے کھل جانے سے کسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اس پیداوار کو دہلی کی منڈیوں میں بھی بھیجنے لگے -

مسلم حکومت میں دستکاروں کی فلاح کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا - فیروز تغلق کے زمانے میں صنعت و حرفت کو اتنی ترقی ہوئی کہ صرف دہلی میں چار ہزار دستکار ریشم کا کپڑا بنانے کا کام کرتے تھے - ہندوؤں کو صرف ایک ٹیکس ایسا دینا پڑتا تھا، جس سے مسلم آبادی مستثنیٰ تھی اور وہ تھا جزیہ - مسلمانوں کو اس کے مقابلے میں زکوٰۃ دینا لازم تھی - زکوٰۃ کی مقدار جزیے سے اکثر زیادہ ہوتی تھیں - اکثر حکومتوں نے برہمنوں کو جزیہ معاف کر دیا تھا - اصولی طور پر کسانوں، حکومت کے ملازموں اور ناداروں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا -

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات :

مسلم حکومت میں ہندو کسانوں، دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی حالت بہتر ہو گئی تھی - اس لیے ہندو عوام کی جانب سے حکومت کے خلاف کبھی کوئی تحریک نہیں اٹھی - البتہ ہندوؤں کا وہ طبقہ، جس کے ہاتھوں میں پہلے اقتدار تھا، وہ اسے دوبارہ

حاصل کرنے کی کبھی کبھار کوشش کرتا تھا ۔ لیکن اسے کم ہی کامیابی نصیب ہوئی ۔ بڑی بڑی راجپوت ریاستوں نے محمد غوری کے زمانے میں ہی اطاعت قبول کر لی تھی ۔ لیکن اس کی وفات کے بعد بعض حکمرانوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار بحال کر لیا ۔ ان ریاستوں کو دوبارہ فتح کرنے میں التتمش کو دس سال لگے ۔

علاؤالدین خلجی کو بھی چتوڑ اور رنتھمبور کے قلعے دوبارہ فتح کرنے پڑے تھے ۔ راجپوتوں نے اپنی قوت بحال کرنے کے لیے سب سے منظم کوشش رانا سانگا کی قیادت میں کی ۔ اس کے لشکر میں ایک لاکھ بیس ہزار گھڑ سوار اور پانچ سو ہاتھی تھے اور ان کی تعداد بابر کی فوج سے کئی گنا زیادہ تھی ۔ اس کے باوجود رانا سانگا نے کنواہہ کے میدان میں مسلمانوں سے شکست کھائی ۔

ہندو زمینداروں کی طرف سے مسلم حکومت کے امن و امان کو ہمیشہ خطرہ رہا ہے ۔ جب کبھی مرکزی حکومت کمزور ہوتی تو یہ مقامی طور پر طاقت پکڑ جاتے اور راہزنی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے تھے ۔ بلبن کے زمانے میں گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے کے ہندو زمینداروں نے حکومت کے خلاف سرکشی کی ، لیکن سلطان نے ذاتی طور پر ان کے فتنے کو ایسا دبایا کہ انھیں مدتوں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی ۔ دیہات میں مالیہ کو جمع کرنے کا کام ہندو مقدموں اور چودھریوں کے سپرد تھا ۔ انھیں اس کام کا معقول معاوضہ ملتا تھا ۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں دیہی علاقوں میں ان کی بڑی حیثیت تھی ۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے تک ان کے مالی اور دوسرے حالات اتنے اچھے ہو گئے تھے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور کسانوں پر ہر قسم کی زیادتیاں کرتے تھے ۔ وہ سرکاری احکام کی بھی پروا نہیں کرتے تھے ۔ سلطان نے ان کی زمینوں کا لگان بڑھا دیا اور حکومت کی دی ہوئی کئی رعایتیں واپس لے لیں ۔ اس مالی دباؤ سے دیہی علاقوں کے حالات بہتر ہو گئے ۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چند سو سال اکٹھے رہنے ، ایک ہی زبان بولنے اور ایک ہی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے ، مختلف طبقے ایک قومی وحدت بن جاتے ہیں ، لیکن بر صغیر اس کلیہ سے مستثنیٰ رہا ۔ کئی سو سال تک ایک ساتھ رہنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں وحدتِ فکر پیدا نہ ہو سکی ۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے اختلافات اس قدر بنیادی تھے کہ ان کا ایک ہونا ممکن نہ تھا ۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ بہت فراخدلی کا سلوک کیا ۔ کوئی مسلمان امیر یا بادشاہ ایسا نہیں تھا جو ہندو اہل کاروں کو ملازم نہ رکھتا تھا ۔ سرکاری دفتروں میں بے شمار چھوٹے بڑے عہدوں پر ہندو مقرر تھے ۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے منصب داروں میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ ہندو عوام، مسلمانوں کی آمد سے پہلے علم کی دولت سے بے بہرہ تھے ۔ مسلمانوں کے آنے سے ہندوؤں میں تعلیم عام ہوئی ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندو دلی طور پر اسلامی حکومت کے مخالف رہے ۔ مسلمان بادشاہوں کے ہندو امرا بھی عام طور پر اسلام کے مخالف اور مسلمانوں کے بد خواہ ثابت ہوتے تھے ۔

جس زمانے میں منگول، شمال مغربی علاقوں پر بار بار حملے کرتے تھے ، ہندوؤں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر مسلم حکومت کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں ۔ گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ جس کو دوآبہ کہا جاتا ہے ہندو باغیوں کا خاص مرکز تھا ۔ بلبن اور محمد تغلق نے ان بغاوتوں کو سختی سے فرو کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲۲۶ء میں اودھ کے ایک ہندو زمیندار نے ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اعلان کیا کہ میں ملک کو ملیچھوں یا ناپاک لوگوں سے پاک کرنا اور دوبارہ 'آریہ ورت" بنانا چاہتا ہوں ۔ سلاطین دہلی کے ماتحت جو ہندو امرا اسلام قبول کر لیتے تھے وہ کبھی کبھی اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جاتے تھے ۔

اکبر نے ہندوؤں کی دلجوئی کی - ان کو بڑے بڑے عہدے دیے - بعض راجپوت راجاؤں کو بہت اونچے منصب عطا کیے - ان کے خاندانوں کے ساتھ رشتے ناطے بھی کیے - ہندوؤں کو مذہبی لحاظ سے بے شمار رعایتیں دیں - اس نے خود ہندوؤں کا لباس اور ان کے طور طریقے اختیار کیے - لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نہ مٹنی تھی نہ مٹ سکی - اس کا الٹا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو راجے شاہی خاندان کے معاملوں میں دخیل ہو گئے اور مغل شہزادوں کی نااتفاقی کو ہوا دینے لگے - جب اٹھارھویں صدی کے آخر میں جاٹوں نے زور پکڑا تو انھوں نے اکبر کی قبر جو فتح پور سیکری کے نزدیک تھی کھود ڈالی اور اس کی ہڈیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا ، اس لیے کہ اس نے اپنے حرم میں ہندو عورتوں کو داخل کیا تھا - سیواجی کی سرکردگی میں مرہٹوں نے ہندو راج کا نعرہ بلند کیا اور مغلیہ سلطنت کے تمام حصوں میں لوٹ مار کی مہم شروع کر دی - دہلی پر کئی بار حملے کیے اور شہر کی پرانی عمارتوں کو تباہ کیا - ۱۷۶۰ء میں ان کا ایک سردار سدا شوبھاؤ، دہلی کی عمارتوں سے دس لاکھ روپے کے قیمتی پتھر اکھاڑ کر مہاراشٹر لے گیا - اسی طرح سکھوں نے پنجاب میں تباہی مچائی - جب ان کی سرکوبی کے لیے مغلیہ فوج بھیجی جاتی تھی تو وہ پہاڑی علاقوں کی طرف بھاگ جاتے تھے - ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو قوم اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ رکھنا چاہتی تھی -

سوالات

۱ - سلاطین دہلی کے دور میں حکمران کے انتخاب کا کیا طریقہ تھا؟

۲ - سلاطین دہلی نے عوام کی بہتری اور بہبودی کے لیے جو کچھ کیا اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے -

۳ - جس وقت مسلمان برصغیر پر قابض ہوئے اس وقت عوام کی کیا حالت تھی ؟ اسلام نے ان پر کیا اثرات کیے ؟

۴ - بھگتی تحریک سے کیا مراد ہے ؟ اور یہ کس طرح وجود میں آئی ؟

۵ مسلمان حکمرانوں نے اگرچہ ہندوؤں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا اور یہ صدیوں تک اکٹھے رہے لیکن اس کے باوجود ان میں کیوں وحدت فکر پیدا نہ ہو سکی ؟

باب ۴

مغلیہ خاندان کے حکمران

مغلیہ خاندان کی حکومت کا زمانہ ، بر صغیر کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے - ان کی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ اس میں برصغیر کے علاوہ کابل اور غزنی کے علاقے بھی شامل تھے - ان کے زمانے میں زراعت ، صنعت و حرفت اور تجارت کو بہت ترقی ہوئی - اس خاندان کے حکمران کسانوں کی فلاح و بہبود میں بڑی دلچسپی لیتے رہے - انھوں نے کارخانے قائم کر کے صنعت کو فروغ دیا جس سے بیرونی تجارت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا - ملک کی شاہراہیں سفر کے لیے محفوظ تھیں اور ضرورت کی چیزیں بےحد سستی اور فراوان تھیں - اس عہد میں دوسرے علوم و فنون کے علاوہ فن تعمیر اور موسیقی نے بھی بڑی ترقی کی - اس دور کی عمارات اپنی نفاست اور خوبصورتی میں بے مثال تھیں -

مغل حکمرانوں کی شخصیت اور کردار :

مغل بادشاہوں کو نہ صرف مسلم دنیا میں بلند مقام حاصل تھا بلکہ بعض یورپی ملکوں میں بھی ان کی عظمت اور دولت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی - جہانگیر کے زمانے میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے سر ٹامس رو سفیر بن کر آیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بعض تجارتی رعایتوں کا طلب گار ہوا - ایک انگریز ڈاکٹر نے شاہ جہان کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا کامیاب علاج کر کے ان رعایتوں میں توسیع کرائی - اسی طرح اورنگ زیب کے زمانے میں فرانسیسی

سیّاح برنیر ، ٹیورنیر اور اطالوی سیاح منوکی یہاں آئے ۔ ان کے علاوہ مغلیہ دور میں یورپ سے عیسائی پادری بھی بڑی تعداد میں آتے رہے ۔ ان میں سے بعض نے مغلیہ سلطنت کے حالات بھی لکھے ہیں ۔ باہر کی دنیا میں مغلیہ حکمرانوں کی اس قدر شہرت تھی کہ یورپ کے لوگ ان کو "مغل اعظم" کے نام سے یاد کرتے تھے ۔

اس عظیم الشان ترقی کا آغاز اس خاندان کے بانی، بابر سے ہوا ۔ جس وقت وہ برصغیر میں آیا تو یہاں کی طرز زندگی اور معاشرت کا معیار بہت پست تھا ۔ وہ اپنی توزک یا خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے ۔ "ہندوستان میں گھوڑے اچھے نہیں ہوتے ۔ یہاں اعلیٰ قسم کے خربوزے اور انگور بھی نہیں ملتے ۔ ان کے علاوہ دوسرے اچھے پھل بھی دستیاب نہیں ہوتے ۔ یہاں برف نہیں ملتی ۔ ٹھنڈا پانی ناپید ہے ۔ حماموں کا رواج نہیں ۔ شمع ، مشعل نام کو نہیں ۔ باغوں اور عمارتوں میں نہریں نہیں ۔ عمارتیں ہوا دار نہیں ہیں ، ان کی وضع قطع بھی بے ڈھنگی ہے ۔"

بابر کو ہندوستان میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا ، لیکن اس قلیل مدت میں بھی اس نے ان کمیوں کے پورا کرنے کی کوشش کی ۔ اس نے اپنی نگرانی میں جمنا اور دھول پور وغیرہ میں بہت سے باغات لگوائے ۔ ان میں اعلیٰ قسم کے سردے اور انگور کاشت کرائے ، ان باغات میں نہریں ، آبشاریں ، روشیں اور چمن بنائے ۔ نہانے کے لیے حمام اور کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے خس کا استعمال شروع کیا ۔ بابر علم و ادب کا بڑا قدر دان تھا اور خود بھی ترکی اور فارسی زبان کا اچھا شاعر تھا ۔ اس کی خود نوشت سوانح حیات آج بھی دنیا کی مشہور سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے ۔ اس کو خطاطی کا بہت شوق تھا ۔ "خط بابری" کے نام سے اس نے خطاطی کی ایک نئی طرز ایجاد کی تھی اور اسی انداز میں قرآن شریف کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا ۔ ایک انسان کی

حیثیت سے وہ بے حد فراخ دل ، عالی حوصلہ اور روادار تھا ۔ اس نے اپنی وصیت میں اپنے جانشین ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ ہر مذہب کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق عدل و انصاف کرے تاکہ وہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر سکے ۔ بابر اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں بھی بہت دلچسپی لیتا تھا ۔

بابر کے جانشین ہمایوں کو ادب کی بجائے علم ہیئت اور ریاضی سے زیادہ دلچسپی تھی ۔ اس کی وجہ سے برصغیر میں ان علوم کی ترویج ہوئی ۔ اس نے ستاروں کی بلندی ناپنے کے لیے ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا جسے ''اصطرلاب ہمایونی'' کہتے تھے ۔ ہمایوں کی وجہ سے برصغیر میں مصوری کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوا ۔ وہ ایران سے اپنے ہمراہ اس فن کے دو ماہر عبدالصمد شیرازی اور میر علی تبریزی لایا تھا ۔ انھوں نے برصغیر میں کتابوں کی تصویریں بنانے کا آغاز ، ہمایوں کی ہدایت کے مطابق داستان امیر حمزہ کو مصور کرنے سے کیا ۔ آگے چل کر جب اکبر نے ہندوستانی فن کاروں کو تربیت دینے کے لیے تصویر خانہ قائم کیا تو ان دونوں ماہرین کو اس میں استاد مقرر کیا گیا ۔

اکبر :

بابر اور ہمایوں کو ملکی انتظام کو بہتر بنانے کا وقت نہیں ملا تھا ۔ اس کا سہرا ہمایوں کے جانشین اکبر کے سر ہے جس نے انتظام سلطنت کے ہر پہلو پر پوری توجہ صرف کی اور مغلیہ سلطنت کو کمال پر پہنچا دیا ۔ اسی لیے اسے تاریخ میں 'اکبر اعظم' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اکبر کو اگرچہ صرف چودہ سال کی عمر میں حکومت کی ذمہ داری اٹھانا پڑی تھی ، لیکن اس نے چند سالوں میں ایک ایسی عظیم سلطنت کی بنیاد رکھ دی ، جو کابل سے لے کر بنگال تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اکبر نے کسانوں کی فلاح اور بہبود پر خاص توجہ دی ۔

اکبر نے بھی اپنے آباو اجداد کی طرح برّصغیر میں اچھی قسم کے پھلدار پودوں کی کاشت کو ترقی دی - جہاں آم نہیں ہوتا تھا وہاں اس کے باغات لگوائے - پنجاب میں آم کی کاشت کا رواج اسی زمانے میں شروع ہوا - اسی طرح اکبر نے گھوڑوں اور اونٹوں وغیرہ کی نسل کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کی - مغلیہ فوج میں توپ اور بندوق کا استعمال تو بابر کے زمانے ہی سے ہو رہا تھا - اکبر نے ان کے بنانے میں جدّتیں پیدا کیں -

بعض مؤرخوں کے کہنے کے مطابق وہ خود ناخواندہ تھا ، لیکن اس نے بچوں کو فارسی زبان پڑھانے کا ایک نیا طریق ایجاد کیا اور ایک فرمان کے ذریعے اسے لوگوں میں مقبول بنانے کی کوشش بھی کی - وہ نظم و نثر کی خوبیوں اور خامیوں کو اچھی طرح سے پرکھ سکتا تھا اور ملک کے نامور علماء اور پنڈتوں سے مباحثے کیا کرتا تھا - روزانہ ایک عالم کا فرض ہوتا تھا کہ وہ رات کے وقت بادشاہ کو کتابیں پڑھ کر سنائے -

اکبر کے عہد میں سنسکرت ، عربی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے گئے - فیضی نے "مہا بھارت" کے بعض حصوں کو فارسی کا جامہ پہنایا - ملّا عبدالقادر بدایونی نے "رامائن" کا فارسی میں ترجمہ کیا - بابر کی سوانح حیات "تزک بابری" کا ترجمہ ترکی سے فارسی زبان میں کیا گیا - اسی طرح عربی سے جغرافیے کی کتابوں اور سنسکرت سے ہئیت کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے - سنسکرت کی بعض مشہور داستانوں کو بھی فارسی زبان میں منتقل کیا گیا - اکبر کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا - اکبر کے زمانے کے علما اور شعرا میں ابوالفضل ، فیضی ، شیخ مبارک ، عبدالرحیم خانخاناں ، عرفی اور نظیری بہت مشہور ہیں -

اکبر نے راجپوت راجاؤں کو بڑے بڑے منصب دیے - ان سے رشتے ناطے کیے - ان کا لباس بھی اختیار کر لیا - دربار میں ہندو

تہوار منائے جانے لگے اور دربار کے آداب میں بھی بہت سی ہندووانہ رسمیں شامل کر دی گئیں ۔ جزیہ اور ہندو تیرتھوں کی زیارت کرنے والوں پر ٹیکس معاف کر دیا گیا ۔ یہاں تک کہ اس نے ایک نیا مذہب رائج کرنے کی کوشش بھی کی ، جس کے طریقوں میں بہت سی ہندووانہ رسمیں شامل کر لی گئیں ۔ اکبر کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کم ہو جائیں گے اور ایک متحدہ قومیت کی بنیاد رکھی جائے گی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا ۔ ان باتوں سے ہندو منصب داروں اور خاص طور پر راجپوتوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ہندوؤں میں ایسی تحریکوں کو ہوا ملنے لگی جو مسلمانوں اور حکومت کے خلاف تھیں ۔

حضرت مجدّد الف ثانی :

اسلام کے خلاف ان رجحانات کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی نے قدم اٹھایا ۔ آپ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے آپ نے سیالکوٹ اور دہلی جیسے علمی مراکز میں اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور اس کے بعد غیر اسلامی عقیدوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے تحریک شروع کی اور مغلیہ دربار میں جو غیر اسلامی طریقے رائج ہو گئے تھے ان کی اصلاح کی آپ نے زبردست کوشش کی ۔ اس کام میں سلطنت کے بعض بڑے امراء اور سالار بھی آپ کے ہم خیال ہو گئے ۔ اکبر کے بعد آپ کے مخالفوں نے جہانگیر کے روبرو آپ کے خیالات کو غلط رنگ میں پیش کیا اور بادشاہ نے انھیں ایک سال کے لیے گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا ۔ لیکن جب اسے آپ کے خلوص کا یقین ہو گیا تو اس نے آپ کی رہائی کا حکم دے دیا اور بعد میں ہمیشہ آپ کا احترام کرتا رہا ۔ آپ نے مسلمانوں میں دین کی نئی روح پھونک دی اور اسلام کو برصغیر میں نئی زندگی بخشی ۔ اسی لیے آپ کو مجدّد یا دین کو نئے سرے سے زندہ کرنے والا کہتے ہیں ۔ آپ کی وفات ۱۶۲۴ء میں ہوئی ۔

جہانگیر :

اکبر کی بیماری کے زمانے میں اس کی جانشینی کا جھگڑا پیدا ہوا تو امرا نے جہانگیر سے پہلے ہی یہ وعدہ لے لیا کہ وہ اسلام کے اصولوں پر کاربند ہو گا اور غیر اسلامی رجحانات کا سدباب کرے گا۔

جہانگیر تخت نشین ہونے کے بعد راسخ عقیدے کا مسلمان ثابت ہوا۔ اس کے برسر حکومت آنے کے بعد غیر اسِلامی رجحانات میں کمی ہو گئی، تاہم وہ دوسرے مذہبوں کے پیشواؤں اور ہندو جوگیوں سے بھی عزت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جہانگیر فارسی نثر بہت اچھی لکھ سکتا تھا۔ اس نے فارسی زبان میں اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے، جس میں وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کے واقعات ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر پھرنے لگتی ہے۔ جہانگیر کو سیر و شکار کا بہت شوق تھا۔ اس نے ضلع شیخوپورہ میں ''ہرن مینار'' تعمیر کیا جو شکار کے لیے اس کی قیام گاہ تھی۔

جہانگیر کو پھولوں، پودوں اور چرند پرند سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے ایامِ حکومت میں سلطنت کے مختلف صوبوں کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کشمیر اور کابل کے بھی کئی سفر کیے۔ وہ راستے کے نباتات اور حیوانات کا گہری نظر سے مشاہدہ کرتا تھا اور جو مصور اس کے ہمراہ ہوتے تھے، ان سے ان پھولوں، پودوں یا جانوروں کی تصویریں بھی بنواتا تھا۔ اس نے جب ایران کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تو اس کے ہمراہ ایک ہندو مصور بھی تھا، جو ایران کے بادشاہ اور اس کے دربار کی تصویریں بنا کر لایا تھا۔ اس کی ملکہ نورجہاں نے بھی نظام حکومت میں دلچسپی لی اور معاشرتی زندگی کے لیے بعض دلچسپ چیزیں ایجاد کیں۔ اس نے بعض زیورات اور نئی طرز کے کپڑوں کو بھی رواج دیا۔ ملکہ نے زندگی کا آخری حصہ، غریب بیواؤں اور ان کی بچیوں

کی امداد میں صرف کیا اور ان کے لیے ایک نئی قسم کا کپڑا بھی تیار کرایا جس سے غریب بچیوں کا جہیز بہت کم خرچ میں تیار ہو جاتا تھا ۔ اس نے پرتکلف فرشوں کی جگہ چاندنی یا سفید چادر کے فرش کو رواج دیا ۔

شاہجہان :

شاہجہان کو شہزادگی کے زمانے ہی سے مذہب سے وابستگی رہی تھی اور اسے کلچر اور ثقافت سے خاص دل چسپی تھی اس کے زمانے میں مغلیہ دربار میں اسلامی روایات میں جان پڑ گئی اور فنون اور تعمیرات میں بھی ایسے شاہکار تعمیر کیے گئے ، جو ہمیشہ یادگار رہیں گے ۔ ان کی شہرت سے آج بھی دنیا بھر کے سیاح کھچے چلے آتے ہیں اور ان حسین اور شاندار عمارتوں کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں ۔

اکبر کے زمانے میں مغلیہ دربار میں غیر اسلامی رسم و آداب کی فضا پیدا ہو گئی تھی ۔ شاہجہان کے زمانے میں دربار میں صحیح اسلامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ پہلے دربار میں سجدے کی رسم کا رواج تھا ، شاہجہان نے اسے ممنوع قرار دیا اور اس کی جگہ چہار تسلیم کے طریقے کو رائج کیا ۔ اس کے زمانے میں دربار میں اسلامی تہواروں کے منانے کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ رمضان ، محرم اور شعبان کے موقعوں پر انعامات اور رقوم تقسیم کی جاتی تھیں ، نیز مکّہ شریف اور مدینہ منورہ کے حاکم ، شریف مکہ ، کو بادشاہ کی طرف سے گراں تحائف اور غربا میں تقسیم کے لیے بھاری رقمیں بھیجی جاتی تھیں ۔

اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے بعض جگہ مسجدوں کی جگہ مندر تعمیر کر لیے گئے تھے ۔ شاہجہان نے اسلامی روایات کی حفاظت میں گہری دل چسپی کا اظہار کیا ۔ اس نے اسلام سے ارتداد کو جرم قرار دیا اور ہر قسم کے الحاد

اور بد عقیدہ خیالات کو روکنے کی کوشش کی ۔ شاہجہان، نو مسلموں میں بہت دل چسپی لیتا تھا اور اس نے ان کی دل دہی کے لیے ایک افسر بھی مقرر کیا ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ پوری روا داری کا برتاؤ کیا ۔ اس کے بعض بڑے بڑے جرنیل ہندو تھے اور اس کے زمانے میں رائے رایاں ایک ہندو امیر وزیر اعظم کے عہدے پر بھی رہا ہے ۔

شاہجہان کو علوم و فنون میں بڑا ذوق حاصل تھا۔اس کے دربار میں فارسی اور ہندی زبان کے مشہور شاعر تھے اس کے زمانے میں اچھے خطّاط اور مصور بھی ہو گزرے ہیں لیکن فن تعمیر میں اس کی یادگاریں لاثانی شہرت اختیار کر گئی ہیں ۔ آگرے میں تاج محل کا مقبرہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اس نے دہلی میں لال قلعے کی بنیاد رکھی اور اس میں دیوان عام اور دیوان خاص کی عمارتیں بنوائیں ۔ لاہور میں شالامار باغ آج بھی اس کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ لاہور کے قلعے میں شیش محل اور دوسری عمارتیں بھی اسی کے زمانے میں تیار ہوئیں ۔ ٹھٹھہ کی شاہجہانی مسجد آج بھی اس کے حسن ذوق کی یاد کو تازہ کر رہی ہے ۔ اس کے زمانے میں زراعت اور تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوا ، علوم و فنون نے بھی ترقی کی ۔ سیالکوٹ ، لاہور ، دہلی اور جون پور علم کے مرکز بن گئے ۔ بادشاہ ذاتی طور پر علما کی بہت توقیر کرتا تھا ۔ اس نے سیالکوٹ کے ملّا عبدالحکیم کو دو مرتبہ چاندی میں تلوایا اور یہ رقم ان کو انعام کے طور پر دی ۔

اورنگ زیب :

اورنگ زیب عالمگیر ١٦١٩ء میں پیدا ہوا ۔ وہ شہزادگی کے ہی زمانے سے قوت ، عزم اور شجاعت ، عقل ، فہم و ادراک اور اصول پرستی کا نمونہ تھا ۔ ابھی اس کی عمر چودہ سال کی تھی جب اس نے ایک مست ہاتھی کا مقابلہ کیا تھا جس پر خوش ہو کر

شاہجہان نے اسے بہادر کا خطاب دیا تھا ۔ بلخ کی جنگ میں اس نے عین لڑائی کے درمیان میدان جنگ میں جانماز بچھا کر نماز پڑھی اور جب دشمن نے اس کا یہ عزم اور حوصلہ دیکھا تو پکار اٹھا کہ ایسے شخص کے مقابلے میں جنگ کرنا اپنی تباہی خود مول لینا ہے ۔

عالمگیر ذاتی زندگی میں سادگی کا نمونہ تھا وہ نہایت سادہ لباس پہنتا تھا جس کی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی ۔ رات کو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا تھا اور سرکاری خزانے کو خدا کی امانت سمجھتا تھا اور اس سے اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کرتا تھا ۔ اپنے ذاتی مصارف کے لیے وہ ہاتھ سے ٹوپیاں کاڑھتا اور قرآن مجید کی کتابت کرتا تھا ۔ یہ رقم شاہی محل کی خزانچی عورت کے پاس جمع رہتی تھی ۔ اس نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ وہ قلیل رقم جو ٹوپیوں کی کمائی سے بچی ہے اس سے بادشاہ کا کفن خریدا جائے اور وہ رقم جو کتابت سے کمائی گئی تھی اسے غربا میں تقسیم کر دیا جائے ۔

اس کے نزدیک بادشاہی کے فرائض کا تصور بہت بلند تھا وہ روزانہ دربار میں تمام عرضیوں اور شکایتوں کا مطالعہ عینک کے بغیر کرتا اور ان کے اوپر اپنے ہاتھ سے احکام لکھتا تھا ۔ وہ انتظامی امور میں شاہی خاندان کے افراد بلکہ اپنے بیٹوں سے بھی اسی سختی سے باز پرس کرتا تھا جتنی دوسروں سے ۔ جو خطوط اس نے اپنے لڑکوں کو لکھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی پر کتنا زور دیتا تھا ۔ بادشاہ کی طرف سے ہر شہزادے کے دربار اور دوسری جگہوں میں وقائع نویس ، ہوتے تھے ۔ یہ ہر جگہ کی خبریں بادشاہ کو بھیجتے تھے ۔ وقائع نویس، بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اور انہیں کوئی اور افسر خواہ وہ شاہزادہ ہی کیوں نہ ہو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا ۔ ایک بار ایک وقائع نویس نے شہزادہ عالی جاہ کے خلاف رپورٹ کی تو بادشاہ نے شہزادے کی آدھی جائداد ضبط

کر لی - جہاں کہیں کسی شہزادے یا امیر سے بدعنوانی ہوتی تھی تو وہ وقائع نویس کی رپورٹ اور ذاتی تحقیقات کے بعد بڑی سخت سزا دیتا تھا -

مغلیہ دربار میں اسلامی آداب اور رسم و رواج پر شاہجہان نے خاص زور دیا تھا - اورنگ زیب نے غیر اسلامی رسموں کا پورا پورا انسداد کیا - اس نے اپنی حکمرانی کے شروع ہی میں تمام غیر اسلامی رسمیں ختم کر دیں - جشن نو روز کی رسم ایران سے لی گئی تھی، بادشاہ نے اسے موقوف کر دیا - مغلیہ دربار میں سال میں دو مرتبہ بادشاہ کے تُلنے کی رسم تھی - اسے بھی بند کر دیا گیا - بادشاہ کا جھرکہ درشن میں بیٹھنا بند ہو گیا - قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی کا خاتمہ ہو گیا - مسلم معاشرے میں بہت سے رسم و رواج ہندوؤں کے اثر سے رائج ہو گئے تھے ان کو سختی سے روک دیا گیا -

اکبر کی نرم پالیسی سے ایسے رجحانات پیدا ہو گئے تھے جو سلطنت کے تحفّظ اور ملک کے امن و امان کے لیے نقصان دہ تھے - ملک کے لیے اس وقت مرہٹوں کی بغاوت خطرے کا باعث بن چکی تھی - مرہٹوں کو دکن کی مسلمان ریاستوں کی غفلت اور نرمی نے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا دیا تھا اور سیواجی نے اس تحریک کو منظم شکل دے دی تھی - اورنگ زیب ایک مدت تک ان کے استیصال کے لیے دکن میں رہا - اس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے دوہری ہو گئی تھی لیکن وہ اس حالت میں بھی ان کے خلاف فوج کی کمان خود کرتا رہا - سیواجی کو اس نے سر اٹھانے کا موقعہ نہ دیا اور وہ اورنگ زیب کی زندگی ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا - اس کے بعد بادشاہ نے اس کے بیٹے سنبھاجی کے خلاف فوج بھیجی - اس کا ایک جرنیل دشوار گزار راستوں میں سے ہوتا ہوا سنبھاجی کے پہاڑی صدر مقام پر پہنچ گیا اور اسے گرفتار کر

لیا ۔ سنبھاجی کو ایک جرم کی پاداش میں موت کی سزا دے دی گئی اورنگ زیب نے مرہٹوں کی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا اور اگر اس کے جانشین قابل ہوتے تو مرہٹوں کو کبھی دوبارہ سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملتا ۔ اسی طرح اس نے سکھوں کی بغاوت اور دوسرے فتنوں کا بھی استیصال کیا ۔

اورنگ زیب ہندو مسلم عوام اور خاص طور پر کسانوں کا بہت بڑا بہی خواہ تھا ۔ ایک یورپی سیّاح کے مطابق اس کی خواہش تھی کہ اس کی سلطنت کا ہر شہری ہر روز اچھی خوراک پیٹ بھر کر کھائے ۔ وہ اپنے خطوط میں شہزادوں اور دوسرے امرا کو بار بار تاکید کرتا ہے کہ وہ کسانوں کی خیر خواہی اور ان کی بہتری کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں ، کیونکہ بادشاہ اور امراء قیامت کے روز ان کے بارے میں خدائے تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوں گے ۔ اس نے ہندو کسانوں پر جزیہ معاف کر دیا تھا ۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازموں ، عورتوں ، بچوں اور اپاہجوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا ۔

وہ کہا کرتا تھا کہ اچھے امرا کے انتخاب کا فیصلہ ہمیشہ مذہبی عقائد سے بالا تر ہو کر کرنا چاہیے ۔ اس کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو امرا میں کارگزار لوگوں کی بہت قدر کرتا تھا ۔ وہ صوبہ داری دکن کے زمانے میں شاہ جہاں کو ہندو افسروں کے بارے میں زبر دست سفارشیں کرتا رہا ۔ اس کے زمانے میں ہندو منصب داروں کی تعداد اکبر کے زمانے سے بہت بڑھ گئی تھی ۔ اکبر کے زمانے میں بڑے منصب داروں میں صرف چودہ ہندو تھے لیکن اورنگ زیب کے دور میں ان کی تعداد بڑھ کر ۱۰۸ ہو گئی تھی ۔ اس کے زمانے میں راجا جے سنگھ اور راجا جسونت سنگھ کی حیثیت کسی مسلمان امیر سے کم نہ تھی ۔ سیواجی کے خلاف مہم، راجا جے سنگھ نے ہی کامیابی سے تشکیل دی تھی ۔

علمی حیثیت سے اورنگ زیب بہت ممتاز بادشاہ تھا۔ اسے تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے لکھنؤ میں ولندیزی یا ہالینڈ کے تاجروں کی ایک عمارت کو دارالعلوم قائم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا، وہ دارالعلوم اب تک لکھنؤ میں قائم ہے اور "فرنگی محل" کے نام سے مشہور ہے۔

عالمگیر کو فارسی زبان پر بے نظیر قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنا مطلب بہت مختصر الفاظ اور دل نشین پیرایے میں بیان کر دیتا تھا۔ اسے فقۂ اسلامی سے بہت شغف تھا۔ اس کے زمانے میں علما کی ایک جماعت فقہ کی تدوین پر مامور ہوئی۔ بادشاہ اس کتاب کے مسودے کو ہر روز سنتا اور علما کو مشورے بھی دیتا تھا۔ یہ کتاب "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کے زمانے میں دہلی میں دو نئے مدرسے قائم ہوئے۔ محمد شاہ کا زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ بادشاہ خود بھی سہل کوش اور عشرت پسند تھا، تاہم اس کے زمانے میں متھرا، بنارس اور دہلی میں ستاروں کی حرکت کا مشاہدہ کرنے کے لیے رسد گاہیں تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے دہلی کی رسد گاہ اب بھی موجود ہے جو "جنتر منتر" کہلاتی ہے۔

علم و ادب:

مسلمانوں نے برصغیر کی ثقافت میں جن چیزوں کا اضافہ کیا ان میں علم و ادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلم دور میں حکومت اور علمی طبقے کی زبان فارسی تھی۔ یہاں کے مصنفین نے اس زبان کے ادب میں ایسی گراں قدر تصانیف مرتب کیں کہ پاک و ہند کے فارسی ادب کی تاریخ، فارسی زبان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب بن گئی۔ برصغیر میں فارسی ادب کے پہلے بڑے شاعر امیر خسرو ہوئے ہیں جن کی ادبی حیثیت اہل ایران کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ ان کے بعد ہمارے ہاں فارسی زبان کے شعرا کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو

انیسویں صدی میں غالب پر ختم ہوا۔ برصغیر میں فارسی زبان کا ایک شاعر ایسا بھی ہو گزرا ہے، جس کا ایرانی اور ترکی ادب پر گہرا اثر ہوا۔ یہ مغلیہ دور کے آخری زمانے کا شاعر "بیدل" ہے۔ بہت سے ایرانی اور ترکی شعرا نے اس کی طرز کی پیروی کی۔

مذہبی علوم میں برصغیر کے مسلمانوں نے علمِ حدیث پر جو کام کیا ہے اس کی مثال دوسرے مسلم ملکوں میں بھی کم ملتی ہے۔ دہلی کے ایک مصنّف نے سلاطین دہلی کے زمانے میں حدیث پر "مشارق الانوار" لکھی، جو سیکڑوں سال تک مسلم دنیا کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ حدیث کا سب سے بڑا مجموعہ "متقی الہندی" نے مرتب کیا تھا۔ یہ بزرگ بھی برصغیر کے ہی رہنے والے تھے۔ فقہ میں ملاّ عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ ولی اللہ کی کتابیں مصر اور ترکی کے مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں اور اورنگ زیب کے زیر نگرانی مرتب کی ہوئی کتاب "فتاویٰ عالمگیری" بھی بہت سے مسلم ملکوں میں فقہ پر مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

مسلم عہد میں، سنسکرت اور عربی زبانوں سے بھی فارسی میں ترجمے کیے گئے۔ اس سے بھی فارسی ادب میں گراں بہا اضافہ ہوا یہ ترجمے زیادہ تر فیروز تغلق، سکندر سور اور اکبر کے زمانے میں ہوئے۔

علم و ادب میں مسلمانوں کا گراں قدر اضافہ یہ ہے کہ ان کے حکمرانوں اور امراء نے مقامی بولیوں کو ادبی زبان کی حیثیت دی اور یوں بنگالی، ہندی، پنجابی، دکنی زبانوں کو سنسکرت کے مقابل میں کھڑا کر دیا، زبان و ادب میں ان کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے اردو زبان کو رواج دیا۔

دسویں صدی عیسوی کے بعد جو حملہ آور یہاں آئے، ان میں سے اکثر نسل کے اعتبار سے ترک تھے۔ وہ اپنے گھروں میں ترکی زبان بولتے تھے، لیکن سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی، اس لیے مکتبوں

اور مدرسوں میں اسی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی - عربی، مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی - ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے جو نئی زبان وجود میں آئی ، اس کو اردو کہا جاتا ہے - "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'لشکر' کے ہیں۔ "اردو" زبان کے آغاز کے متعلق بہت سے دلچسپ نظریے پیش کیے گئے ہیں - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان پنجابی ، ملتانی ، فارسی اور عربی زبانوں کے ملاپ سے بنی ، کیونکہ مسلمان سب سے پہلے پنجاب اور ملتان کے علاقوں میں آباد ہوئے - علاؤالدین خلجی کے حملوں اور محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کی وجہ سے اردو، دکن میں بھی پہنچی - اس طرح آہستہ آہستہ یہ زبان پورے ملک کی بین الصوبائی زبان بن گئی اور آج تو اس کی بین الاقوامی حیثیت ہے - یہ زبان عرب اور مشرق افریقہ سے لے کر سنگاپور اور ہانگ کانگ تک بولی اور سمجھی جاتی ہے - مسلمانوں کی وساطت سے مقامی زبانوں میں عربی اور فارسی کے بہت سے لفظ داخل ہو گئے - چنانچہ پنجابی ، سندھی ، بلوچی ، پشتو اور بنگالی زبانوں میں ایک مشترکہ عنصر شامل ہو گیا - آج بھی پاکستان میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے گروہوں کو آپس میں ملانے والی سب سے مضبوط کڑی ان ہی الفاظ کا ذخیرہ ہے ، جو مشترکہ ادبی ورثے کا اہم جزو ہے -

تاریخ نگاری :

مسلمانوں کی آمد سے پہلے برصغیر میں تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا اور تاریخ پر کوئی قابل ذکر تحریر بھی موجود نہ تھی - ہندو طرح طرح کے اوہام میں مبتلا تھے - بتوں کو پوجتے اور دنیا کو بے حقیقت سمجھتے تھے ، اس لیے وہ تاریخ کے علم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے - ہندوؤں کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کی مذہبی کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے - یہ کتابیں وید ، پران اور اپنشد کہلاتی ہیں - وید اور پران مذہب اور اپنشد فلسفے کی کتابیں ہیں - ان کے گہرے

مطالعہ سے پرانے زمانے کے ہندوؤں کی اقتصادی اور معاشرتی حالت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے، لیکن ان کی کتابوں کو سامنے رکھ کر کوئی باقاعدہ تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں میں ابتدا ہی سے تاریخ نگاری کا ذوق تھا۔ انھوں نے نہ صرف مختلف براعظموں کی تاریخ بنائی، بلکہ ان کی تاریخیں بھی لکھیں۔

برّصغیر کے متعلق عرب مؤرخوں، جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے بہت کچھ لکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عرب علما ہی نے دنیا کو ہندوستان کے وجود کا پتا دیا۔ البیرونی سلطان محمود کے زمانے میں یہاں ٹھہرا۔ اس نے سنسکرت زبان کا گہرا مطالعہ کیا اور اس زبان کے علما سے تبادلہ خیال کیا۔ وہ غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کا مالک تھا۔ اس نے ہندوؤں کے رسم و رواج، ان کے توہمات اور علوم و فنون کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "کتاب الہند" کو ہندو مؤرّخ آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مسلمان مؤرخوں نے برصغیر کی تاریخ پر کئی ایک کتابیں مرتب کیں۔ وہ عام طور پر ابتدائے آفرینش سے لے کر اپنے زمانے تک کے حالات کو قلمبند کرتے ہیں۔ اس قسم کی عالمی تاریخیں پہلے پہل عربوں نے لکھیں، بعد میں ایرانیوں نے اور ان کے بعد برّصغیر کے مؤرخوں نے بھی ان میں گراں بہا اضافے کیے۔ کچھ کتابیں کسی ایک خاندان یا عہد کی تاریخ پر مشتمل ہیں اور بعض کتابیں محض ایک ہی حکمران کے عہد حکومت کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔ خود نوشت سوانح عمریاں بھی ہیں، جن کو تاریخ کی اس صنف میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ سوانح عمریاں اور تذکرے ہیں جن میں حکمرانوں، وزراء، امرا، علما یا شعرا کے حالات درج ہیں۔ اس ضمن میں صوفیائے اکرام کے تذکرے اور ان کے ملفوظات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مغلیہ زمانے سے پہلے کی تاریخوں میں ضیاءالدین برنی کی "تاریخ

فیروز شاہی" ، "طبقاتِ ناصری" اور امیر خسرو کی "خزائن الفتوح" زیادہ مشہور ہیں ۔ مغل بادشاہوں نے تاریخ کے مطالعے کی بہت حوصلہ افزائی کی اور تاریخ کی بہت سی کتابیں لکھوائیں ۔ اکبر کے زمانے کی "منتخب التواریخ" اور ابوالفضل کا "اکبر نامہ" اس سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ ابوالفضل کی ایک اور کتاب "آئین اکبری" اس زمانے کے برصغیر کے انتظام حکومت ، اقتصادی اور معاشرتی حالات ، لوگوں کے پیشے ، رسم و رواج ، ملکی جغرافیہ اور صوبائی تقسیم وغیرہ کی ایک مکمل اور مستند تاریخ ہے ۔

شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں بھی علم تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں اور بعض ہندو مصنفین نے بھی فارسی زبان میں کتابیں مرتب کیں ، ان میں سے منشی سبحان رائے بٹالوی کی "خلاصۃ التواریخ" بہت مشہور ہے ۔

"تزک بابری" دنیا کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں بابر نے اپنی زندگی کے رنگارنگ حالات درج کیے ہیں ۔ بابر مناظر قدرت کا دلدادہ ، پھلوں اور پھولوں کا رسیا اور بزم آرائی کا شوقین تھا ۔ اس کی تحریر سے اس کی غیر معمولی فطانت اور قوتِ مشاہدہ کا ثبوت ملتا ہے ۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق بھی بہت سی معلومات قلمبند کیں ۔ اصل کتاب ترکی زبان میں تھی ، لیکن اکبر کے زمانے میں عبدالرحیم خانخاناں نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ۔ خود نوشت سوانح عمریوں میں "توزک جہانگیری" کا درجہ بھی بہت بلند ہے ۔ بابر اور جہانگیر دونوں نے ایک جیسا دل و دماغ پایا تھا ۔ اس کی جھلک ان دونوں کی خود نوشت سوانح عمریوں میں دکھائی دیتی ہے ۔ جہانگیر اپنی خامیوں کا صاف صاف اعتراف کرتا ہے اور کسی بات پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے اکبر کی فرمائش پر "ہمایوں نامہ" لکھا ۔ دارا شکوہ

اور اس کی بہن جہاں آرا بیگم نے صوفیائے کرام کے تذکرے لکھے۔

مصوّری :

مسلمانوں کے آنے سے پہلے برّصغیر میں مصوّری کا فن تھوڑا بہت رائج تھا، لیکن اس کو صرف مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ مصوّری کی خاص طرز لائے اور انھوں نے اس کو کئی ایک مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مسلمانوں کے زمانے میں اس فن سے کچھ اس قسم کا کام لیا گیا جو ہم آج کل کیمرے سے لیتے ہیں۔ کتابوں میں مصوّری کا فن ہمارے ہاں ایران سے آیا۔ ایرانیوں نے اس فن میں بہت کمال پیدا کیا اور بے شمار ایسی کتابیں تیار کیں جن کے ہر صفحے پر نقّاشی اور مصوّری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ایران کا بہترین مصوّر بہزاد تھا۔ اس کے ہم عصر مصوّر اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا شبیہ کشی کا فن معجزے سے کم نہ تھا۔ انھوں نے امیروں اور بادشاہوں کی ایسی تصویریں تیار کیں جو اصل سے ہو بہو ملتی تھیں۔

بابر کے پاس بہزاد کے ہاتھ کی بنی ہوئی کئی تصویریں تھیں۔ ہمایوں نے اپنی جلا وطنی کے پندرہ سال ایران میں گزارے تھے۔ واپسی پر وہ بہزاد کے دو مشہور شاگرد خواجہ عبدالصمد شیرازی اور سید علی تبریزی کو اپنے ساتھ لے آیا اور اُن کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ "داستان امیر حمزہ" کا بارہ سو صفحے کا ایک مصوّر نسخہ تیار کریں۔ یہ کام ابھی ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ ہمایوں فوت ہو گیا اور ان مصوّروں نے اسے اکبر کے زمانے میں تکمیل تک پہنچایا۔ اکبر خود ان دونوں فن کاروں کی بہت قدر کرتا تھا اور جب اس نے ہندوستانی مصوّروں کی ترتیب کے لیے تصویر خانہ یا آرٹ گیلری بنائی تو اُس نے ان دونوں کو اس میں استاد مقرر کیا۔ اکبر کے عہد میں مغلوں کے زمانے کا فن مصوّری بہت چمکا۔

اکبر نے آرٹ گیلری کے ذریعے ہندو مصوّروں کو ایرانی مصوّری

کے اصولوں سے روشناس کرایا۔ ایرانی مصوّر، شاہی دربار، امیروں اور حاکموں کی شان و شوکت کے مناظر دکھاتے تھے۔ اکبر کی آرٹ گیلری کے اثر سے راجپوتانے میں راجپوت طرز کی مصوّری کا آغاز ہوا۔ یہ مصوّر زیادہ تر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بناتے تھے۔ اکبر نے دیواروں پر تصویریں بنانے کے فن کو بھی رواج دیا اور فتح پور سیکری کے محلات میں اندرونی دیواروں پر بہت سی تصویریں بنوائیں، جن میں مختلف قسم کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ اکبر نے بہت سی کتابوں کے مصوّر نسخے تیار کرائے اور ان کے حاشیوں پر پرتکلّف نقاشی کرائی۔ اس کے دربار کے مصوّروں کی فہرست خاصی طویل ہے۔

جہانگیر کے دور میں اس فن کو اور بھی ترقی ہوئی۔ اس نے ایک ہندو مصوّر، بشن داس کو شاہ ایران کے دربار کی تصویر بنانے کے لیے ایران بھیجا۔ جب تصویر تیار ہوگئی تو دیکھنے والوں نے بتایا کہ اس میں شاہ طہماسپ کی تصویر اس کی شکل سے بالکل مشابہ تھی۔ جہانگیر، فن مصوّری کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ اگر چند مصوّر مل کر تصویر بناتے تھے تو جہانگیر دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ اس کا کون سا حصہ کس مصوّر نے تیار کیا ہے۔

اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی مصوّری کا فن مقبول رہا۔ جب اورنگ زیب کا لڑکا بیمار ہوا تو اس نے مصوّروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً شہزادے کی تصویریں بنا کر اسے بھیجتے رہیں تاکہ بادشاہ کو اس کی صحت کا اندازا ہوتا رہے۔

خطّاطی :

مسلمانوں میں خطّاطی کی اہمیت بھی مصوّری سے کم نہ تھی۔ عربی کا پرانا رسم الخط جس میں نقطے نہیں ہوتے تھے، کوفی خط کہلاتا تھا۔ رسول اکرمؐ نے جو خطوط اپنے ہم عصر بادشاہوں کو بھیجے وہ اسی خط میں لکھے گئے۔ اس خط کو عمارتوں، برتنوں اور کپڑوں

کے کناروں کو مزیّن کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی میں ایران میں خط نستعلیق ایجاد ہوا اور ایران میں اس خط کے بڑے بڑے استاد پیدا ہوئے۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں برّصغیر میں بھی فن خطّاطی نے بہت ترقی کی، کیونکہ بہت سے امرا اور سلاطین فرصت کے اوقات میں اس کی مشق کیا کرتے تھے۔ سلطان ناصرالدین محمود اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھتا تھا بابر خطّاطی کا ماہر تھا۔ اس نے ایک نیا خطِ ایجاد کیا جس کو "خط بابَری" کہتے تھے۔ ہمایوں ایران سے واپس آتے ہوئے سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی کو اپنے ساتھ لیتا آیا۔ یہ دونوں مصوّر خطّاط بھی تھے۔ اکبر کے دربار میں بھی کئی ایک مشّاق خطّاط تھے اور بادشاہ نستعلیق کے ساتھ ساتھ طغرا اور نسخ کے ماہرین کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ شاہجہان نے اورنگ زیب کو خطّاطی سکھانے کے لیے ایک ایرانی ماہر فن کے سپرد کیا تھا، جس کی تربیت سے اورنگ زیب نے نستعلیق خط میں بہت کمال پیدا کیا۔

فن تعمیر:

مسلمانوں کے آنے سے پہلے زیادہ تر عمارتیں عبادت گاہوں کی صورت میں تھیں۔ ان کا اندازِ تعمیر ایک جیسا ہوتا تھا۔ عمارت کے درمیان ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں دیوی یا دیوتا کا بت رکھا ہوتا تھا، جہاں پوجا کرنے والے، ایک ایک کرکے داخل ہوتے تھے۔ رہائشی مکانوں اور محلات کے کمرے بھی تنگ و تاریک ہوتے تھے، جن میں ہوا کا گزر بھی کم ہوتا تھا۔ ان میں کھلے کھلے برآمدے یا ایوان بھی نہیں ہوتے تھے۔ بابر جب گوالیار میں راجا مان سنگھ کے پرانے محل میں داخل ہوا تو لکھتا ہے کہ کمروں میں تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی مسجدیں ہوا دار اور فراخ ہوتی تھیں اور ان کی رہائشی عمارتیں بھی کھلی اور ہوادار ہوتی تھیں۔ ہندو، مُردوں کو جلاتے ہیں۔

ان کے ہاں مقبرے بنانے کا رواج نہیں تھا ۔ برصغیر میں بہت سے مقبرے اور مسجدیں اسی مسلم دور ہی کی یادگار ہیں ۔

مسلمانوں نے فن تعمیر میں بہت ترقی کی تھی ۔ وہ اینٹوں کو جوڑنے کے لیے چونے کا استعمال بھی کرتے تھے، لیکن ہندو معمار اس سے بے خبر تھے ۔ اسی طرح انھوں نے فن تعمیر میں محراب، گنبد ، مینار پچی کاری اور عمارتوں پر خطّاطی کا اضافہ بھی کیا ۔ برصغیر میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا آغاز دہلی کے قطب مینار سے ہوا ۔ یہ مینار جو برصغیر کی عمارتوں میں سب سے زیادہ بلند ہے، مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرق گوشے میں واقع ہے اور دو سو بیالیس فٹ بلند ہے ۔ اس کی تعمیر قطب الدین ایبک کے عہد میں شروع ہوئی اور التتمش کے زمانے میں ختم ہوئی ۔ اس کی نقّاشی اور خطّاطی کو دیکھ کر مسلمانوں کے فن تعمیر کی دلکشی اور عظمت کا احساس ہوتا ہے ۔

دہلی کا علائی دروازہ بھی اسی دور کی مسلم طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے ۔ مغل دور کی سب سے پہلی عمارت ہمایوں کا مقبرہ تھی جسے اکبر نے تعمیر کروایا ۔ اس کے بعد اس نے آگرہ ، فتح پور سیکری اور سکندرہ میں بھی بہت سی عمارتیں بنوائیں ۔ فتح پور سیکری کی مسجد بے نظیر ہے ۔ غالباً دنیا میں کسی مسجد کا دروازہ فتح پور سیکری کی مسجد کے بلند دروازے کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ اکبر کے زمانے میں عمارتیں بنانے کے لیے زیادہ تر سرخ پتھر استعمال کیا جاتا تھا ۔ اکبر نے لاہور کا قلعہ بھی نئے سرے سے بنوایا تھا ۔ قلعے کے اس حصے میں بھی سرخ پتھر کا کام زیادہ ہے ۔

لاہور میں مغلیہ حکمرانوں نے کئی ایک عمارتیں تعمیر کیں ۔ جہانگیر نے انارکلی کا مقبرہ بنوایا اور قلعہ میں خواب گاہ اور مسجد کا اضافہ کیا ۔ خود جہانگیر کا مقبرہ لاہور کے نزدیک شاہدرہ میں بنا ۔ اسے شاہجہان نے تعمیر کرایا تھا ۔ دوسری عمارتوں کی طرح سکھ اپنے زمانے میں اس مقبرے سے بھی بہت سا سنگ مرمر اور

آرائشی ساز و سامان اکھاڑ کر لے گئے ۔

شاہجہان کے دور میں لاہور کے شہر میں شالا مارباغ اور قلعے کے کچھ حصے تعمیر کیے گئے ۔ اسی زمانے میں بادشاہ کے ایک امیر نے وزیر خاں کی مسجد بنائی جو ٹائلوں کے کام کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ اس دور میں ٹھٹھہ کی شاہجہانی مسجد بھی تعمیر کی گئی ۔ لیکن شاہجہان کے زمانے کی بہت سی عمارتیں دہلی یا آگرہ میں ہیں ۔ ان میں لال قلعہ ، دہلی کی جامع مسجد اور تاج محل دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ ان عمارتوں کے نقشوں اور ان کی تعمیر میں لاہور کے ایک معمار خاندان کے افراد نے نمایاں خدمات انجام دیں ۔

اورنگ زیب نے لاہور کی بادشاہی مسجد بنائی جو سرخ پتھر اور سنگ مرمر کی عظیم الشان عمارت ہے ۔ اس مسجد کا شمار دنیا کی سب سے وسیع مسجدوں میں ہوتا ہے ۔ مسجد کے مقابل میں قلعہ کا دروازہ بھی اورنگ زیب کے زمانے ہی میں تعمیر کیا گیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی جاتے تھے، مقامی آب و ہوا اور دوسری ضروریات کے پیشِ نظر اپنے فن تعمیر میں مناسب تبدیلیاں کر لیتے تھے ۔

بنگال کی مسجدوں میں گنبدوں کی کثرت اور نیچے کی چھپر نما چھت وہاں کے موسم برسات کے لیے زیادہ موزوں تھی ۔ مغلوں کے دور میں ان کا سب سے بڑا تعمیری منصوبہ ڈھاکہ کا شہر تھا جسے جہانگیر کے زمانے میں آباد کیا گیا تھا ۔ اس کا پرانا نام "جہانگیر نگر" تھا ۔ اورنگ زیب کے عہد میں یہاں کے صوبے دار شائستہ خاں نے اس شہر میں قلعہ ، پری بی بی کی مسجد اور دوسری عمارتیں بنوائیں ۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں صرف مسجدیں اور محلات ہی نہیں بنائے بلکہ رفاہ عام کے لیے بھی بہت سی عمارتیں تعمیر کیں ۔ ان میں مدرسے ، خانقاہیں ، سرائے اور پُل شامل ہیں ۔

باغات :

تعمیرات کے ضمن میں ان باغات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنھیں مغل حکمرانوں نے اپنی سلطنت کے ہر صوبے اور بڑے شہر میں بنوایا۔ باغات کی تعمیر کا آغاز اس خاندان کے بانی، بابر سے ہوا تھا۔ اس کے بعد آنے والے حکمرانوں نے اس شوق کو اور بھی ترقی دی۔ انھوں نے باغوں کو سرو کے درختوں ، فواروں ، آبشاروں ، روشوں اور بارہ دریوں سے آراستہ کیا ۔ بابر نے کابل اور ہندوستان میں کئی ایک باغات لگائے۔ اس کے بیٹے کامران نے لاہور میں راوی کے کنارے ایک باغ لگایا تھا ۔ یہ باغ تو ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی ٹوٹی پھوٹی بارہ دری اب تک موجود ہے ۔

ہمایوں نے دریائے جمنا پر ایک تیرتا ہوا باغ بنوایا ، جس میں لکڑی کے تختوں پر پھول لگوائے ۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے میں لاہور، فتح پور سیکری اور کشمیر میں بہت سے باغ لگائے گئے، جن میں نسیم باغ، نگین باغ، شالامار اور نشاط باغ مشہور ہیں ۔ شاہ جہان کے زمانے میں آگرہ ، دہلی اور لاہور میں جو بہت سے باغ لگائے گئے، ان میں لاہور کا شالا مار باغ دنیا بھر میں مشہور ہے ۔

اورنگ زیب نے لاہور میں بادشاہی مسجد کے سامنے ایک ہائیں باغ لگوایا ۔ مغلیہ حکومت کے زمانے میں لاہور باغوں کا شہر تھا ۔ چوبرجی اور موجودہ پبلک لائبریری ، جہانگیر، آصف جاہ اور نورجہاں کے مقبرے ایسے ہی باغات سے گھرے ہوئے تھے۔ ان باغوں، کے چاروں طرف بلند دیواریں ، مرکز میں شفاف پانی کے حوض ، ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھوٹی سی فواروں والی نہریں ، آس پاس پھولوں کی کیاریاں اور ان کے پیچھے وسیع سبزہ زار ہوتے تھے۔

مغلیہ خاندان کے ترکوں کے ساتھ تعلقات :

ابتدائی سلاطین دہلی سب کے سب ترکی نسل سے تھے۔ آغاز میں جو مسلمان ان کے ساتھ آئے وہ بھی ترک تھے ۔ ہندی گیتوں میں

"ترکوا" سے ہمیشہ مسلمان مراد ہوتی ہے - اس طرح شروع ہی سے برصغیر کے مسلمانوں کا تعلق وسط ایشیا کے ترکوں سے رہا، جو مغلیہ سلطنت کے آخری زمانے تک قائم رہا - بابر کی مادری زبان ترکی تھی اور اس نے اپنی سوانح حیات "توزک بابری" بھی ترکی زبان ہی میں لکھی تھی - ترکی زبان میں اس کا ایک دیوان بھی ہے- اس کے بعد ہر بادشاہ نے اپنی اولاد کو ترکی زبان سکھانے کا انتظام کیا- جہانگیر نے یہ زبان اپنے اتالیق عبدالرحیم خانخاناں سے سیکھی تھی- شاہجہان نے اس کو شاہی خاندان کی عورتوں سے سیکھا- اورنگ زیب بھی ترکی جانتا تھا اور اس نے اپنے بچوں کو ترکی زبان سکھانے کے لیے "ترکی‌خواں" استاد ملازم بھی رکھے - دہلی میں مغلیہ خاندان کے شہزادوں کو مغلیہ دور کے آخری زمانے تک یہ زبان برابر سکھائی جاتی تھی -

استنبول میں عثمانیہ سلطنت کی بنیاد پندرھویں صدی میں رکھی گئی - ترکوں کا توپ خانہ اس زمانے میں بہت شہرت رکھتا تھا - بابر نے توپیں ڈھالنے کے لیے ترک ماہرین کو ملازم رکھا ہوا تھا - ان کا بحری بیڑہ بحیرۂ عرب میں بھی آتا جاتا تھا- ایک ترکی امیرالبحر ہمایوں کے دربار میں آیا تو بادشاہ نے اسے کچھ مدت تک اپنے ساتھ رکھا - یہ امیرالبحر علم ہیئت کا بھی بڑا ماہر تھا - ہمایوں نے اس سے سورج اور چاند گرہن کی تاریخوں کا حساب کرایا تھا - ترکوں کی سلطنت میں عرب ، مصر اور عراق کے ملک بھی شامل تھے - چونکہ ہر سال حاجیوں کے جہاز عرب جاتے تھے، اس لیے ترکوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کا ایک اور ذریعہ بھی پیدا ہوگیا - عوب کی بندرگاہوں کے بعض ترک حاکم، مغلیہ حکمرانوں کو عربی گھوڑے اور دوسرے تحائف بھی بھیجتے رہتے تھے - شاہ جہان کے زمانے سے عثمانیہ سلطنت کے ساتھ علمی تعلقات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا -

شاہجہان کے دور کے مشہور عالم ملاّ عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابیں عثمانیہ سلطنت کے مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں اور جب

اورنگ زیب نے اپنی نگرانی میں "فتاویٰ عالمگیری" کو مرتب کرایا تو اس کتاب کی وہاں کے مدرسوں اور عدلیہ میں خاص پذیرائی ہوئی۔ سرسید احمد خاں کے والد دہلی کے مشہور صوفی غلام علی شاہ صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ سرسید کو بھی شاہ صاحب سے بہت عقیدت تھی۔ غلام علی شاہ کے ایک مرید خالد کردی نے ان کے صوفی سلسلے کی اشاعت عراق، کردستان اور عثمانیہ سلطنت میں کی۔ یہ سلسلہ ترکوں میں اتنا مقبول ہوا کہ اتاترک کے زمانے تک صرف استنبول میں اس سلسلہ کی ۷۲ خانقاہیں تھیں۔

مغلیہ خاندان اور خاندان صفویہ:

ایران کا صفوی خاندان، بابر کے زمانے میں برسر اقتدار آیا۔ بابر کی اوزبک حکمرانوں اور ہمسایہ حکومتوں سے کشمکش رہتی تھی۔ صفوی خاندان کے بانی شاہ اسماعیل صفوی نے اس کو اوزبکوں کے خلاف امداد دی اور ایک مرتبہ اس نے صفوی فوج کی امداد سے سمرقند کا شہر بھی فتح کر لیا تھا۔ صفویوں کی فوج میں توپ خانے اور رسالے کا معیار بہت اچھا تھا اور صفوی حکمرانوں کی کامیابی کا راز ان دستوں کی جنگی چالوں اور کارکردگی پر تھا۔ بابر نے ہندوستان کی لڑائیوں میں ان ہی جنگی ترکیبوں سے کام لیا تھا۔ جب ہمایوں کو شیر شاہ کے مقابلے میں شکست ہوئی اور اسے ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا تو اس نے پرانے تعلقات کی بنا پر صفوی حکمران ہی سے امداد کی درخواست کی تھی۔ اس زمانے کے صفوی حکمران شاہ طہماسپ نے اس کے ہمراہ فوج کر دی، جس کی امداد سے ہمایوں نے قندھار اور کابل کو فتح کیا۔ ہمایوں کو اپنے وفادار ہمراہیوں کے ساتھ پندرہ سال ایران میں قیام کرنا پڑا۔ ثقافتی لحاظ سے اس کے بہت خوشگوار نتائج نکلے۔ جن فن کاروں کو ہمایوں اپنے ساتھ ہندوستان لایا، ان کے اثر سے ہمارے ہاں مصوّری اور خطّاطی کو بہت ترقی ہوئی اور ہیئت اور ریاضی کے علوم میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس کے

بعد ایرانیوں کی آمد کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس میں شعرا، علما، مفلوک الحال شرفا طالع آزما ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ زبان کی یکسانیت کی وجہ سے یہ تعلقات روز بروز مضبوط ہوتے گئے ۔ اگرچہ قندھار کے معاملے پر مغل اور ایرانی حکومتوں کی اکثر چپقلش رہی، لیکن دونوں ملکوں کے عوام علمی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے گہری وابستگی رکھتے تھے ۔

ہندوستان میں جو ایرانی وارد ہوئے، ان میں سے بعض نے اپنے نئے وطن میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ۔ علی مردان خاں نے شاہجہان کے زمانے میں نہر جمن غربی اور مادھوپور کی نہریں بنوائیں جن سے دہلی کے شہر اور لاہور کے شالا مارباغ کو پانی ملتا تھا ۔ اکبر کے دربار کے حکیم فتح اللہ شیرازی نے سائنس کو نئی زندگی بخشی۔ ایران سے ہمارے ہاں کئی قسم کی صنعتیں آئیں، جن میں چینی کی ٹائلیں بنانا، پیپر ماشی، کوفت کاری وغیرہ کے فنون بھی تھے ۔

سوالات

۱ ۔ مغل حکمرانوں نے علم و ادب اور سوانح نگاری میں جس دلچسپی کا اظہار کیا ۔ ان پر ایک سیر حاصل مضمون لکھیے۔ نیز اس میں ان ادبی خدمات کا ذکر خاص طور پر کیجیے جن میں خود حکمران دلچسپی لیتے تھے ۔

۲ ۔ مغلوں نے اہل ہند کو تاریخ نگاری سے کیسے روشناس کرایا ؟

۳ ۔ مغلوں اور ہندوؤں کے فن تعمیر میں کیا فرق تھا ؟ مغلوں نے فن تعمیر اور باغبانی کو ترقی دینے کے لیے جو کچھ کیا اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیے ۔

باب ۵

سلطنت کا زوال اور اصلاحی تحریکیں

برّصغیر میں مسلم سلطنت کے زوال کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کا علمی اور اخلاقی انحطاط تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کی علمی دنیا میں بہت سے نئے انکشافات ہوئے۔ مشینیں ایجاد ہوئیں۔ نئے آلات حرب بنائے گئے۔ اسی طرح یورپی اقوام نے جدید سامان جنگ کی تیاری میں بہت ترقی کی۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی علمی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی۔ قدامت پسند عناصر کو ابھرنے کا موقع ملا اور مسلمانوں نے سائنس کے نئے انکشافات سے فائدہ نہ اٹھایا۔ چھاپے کی ایجاد کے ذریعے ملک میں تعلیم کو عام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو فن خطّاطی کا ایسا والہانہ شوق تھا کہ انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ کہتے ہیں کہ اکبر کے سامنے ایک مرتبہ ایک چھپی ہوئی کتاب پیش کی گئی، لیکن بادشاہ نے اس کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ یہ حسن کتابت میں ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کا مقابلہ نہیں کرتی تھی، اس لیے اس ایجاد سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ کتابوں کی کمی کے باعث تعلیم کا معیار پست رہ گیا۔ سترھویں صدی کے اندر یورپ میں برّصغیر کی تاریخ اور معاشرے کے متعلق بہت سی کتابیں چھپ چکی تھی، لیکن برصغیر میں "آئین اکبری" کے بعد کوئی قابل ذکر کتاب نہ لکھی گئی۔

ذہنی پستی کا اثر براہ راست عسکری قوت پر بھی پڑا۔ بابر نے ہندوستان میں آ کر بارود کا استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد فن حرب کی ترقی رک گئی۔ اس کے برعکس یورپ کی قوموں نے فنون جنگ میں

انقلابی تبدیلیاں کیں۔ پرتگیزوں نے ایسے جہاز تیار کیے جن پر توپیں چڑھائی جا سکتی تھیں۔ اس طرح انھوں نے بحر ہند میں اپنی برتری قائم کر لی۔ مغل سب کچھ دیکھتے تھے لیکن بحری قوت کی اہمیت سے بے پروا تھے۔ اکبر کے زمانے میں بھی، پرتگیزوں سے اجازت حاصل کیے بغیر، حاجیوں کے جہازوں کا عرب کی طرف جانا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ کے لوگ مغلوں کی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے۔ انگریزی سفیر سر ٹامس رو نے جہانگیر کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر گجرات کے صوبے دار نے اپنے علاقے میں میرے ہم قوموں پر کوئی زیادتی کی تو سمندر پر اس کا بدلہ چکا دیا جائے گا۔ مغلوں نے اپنے سپاہیوں کو توپ خانے کے استعمال سے بھی بہت حد تک بے خبر رکھا۔ جب ضرورت پڑتی تو وہ تربیت یافتہ یورپی باشندوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتے تھے۔ فرانسیسی سیاح برنیر (Bernier) نے اورنگ زیب کی فوج کے سپاہیوں کو دیکھ کر کہا کہ ان میں تو نظم و ضبط کی اتنی کمی ہے کہ ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جا سکتا ہے۔

امرائے سلطنت کا اخلاقی انحطاط بھی مسلم سلطنت کی تباہی کا باعث بن گیا۔ مغلوں نے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ لوگوں کو خوشحال بنایا۔ جب سامان تعیش کی فراوانی ہوئی تو بادشاہ اور امرا عیش پسند ہو گئے۔ اورنگ زیب نے زندگی کے تکلفات کو کم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی موت کے بعد امرا کی عادتیں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بگڑ گئیں۔ وہ خود سختیاں جھیلنے کے قابل نہ رہے، اس لیے لمبی لڑائیوں سے گھبراتے تھے۔ دکن میں مغلیہ فوج نے مرہٹوں کے بہت سے قلعے فتح تو کر لیے لیکن ان پر قبضہ رکھنے کے لیے جتنی سخت کوشش کی ضرورت تھی وہ امرا کے بس کی بات نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ہر فتح تھوڑے عرصے کے بعد شکست میں تبدیل

ہو جاتی تھی - بدنظمی، کاہلی ، فرائض سے گریز اور ملک و ملت سے غداری ، یہ سب کچھ امرا کی گھٹی میں پڑ چکا تھا - اپنے بڑھے ہوئے معیار زندگی کو قائم رکھنے کے لیے وہ بدعنوانیوں کے مرتکب ہوتے تھے - رشوت ستانی عام ہو گئی اور امرا لوگوں سے روپیہ وصول کرنے کے لیے ان پر بے حد ظلم اور زیادتیاں کرنے لگے -

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمان حکومتوں میں تخت نشینی کا کوئی باقاعدہ اصول نہیں تھا - بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لیے جنگ چھڑ جاتی - اورنگ زیب کی موت کے دس سال کے اندر اندر جانشینی کی سات خونریز لڑائیاں ہوئیں جن میں شاہی خاندان کے بہت سے افراد اور آزمودہ کار سپاہی مارے گئے - ان جنگوں سے نظم و نسق کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا - سادات بارہہ کا عروج اور زوال ، فرخ سیر کی درد ناک موت ، سکھوں کی شورش ، نادر شاہ کا حملہ اور دہلی کا قتل عام ، احمد شاہ ابدالی کی لڑائیاں ، روہیلوں کا دہلی پر حملہ ، بنگال اور بہار میں انگریزوں کی حکومت کا قیام ، ان سب واقعات نے سلطنت کو کھوکھلا کر دیا -

حضرت شاہ ولی اللہؒ :

اورنگ زیب کی وفات کے بعد برصغیر میں ابتری پھیل گئی - بدامنی عام ہو گئی اور فتنہ و فساد کا دور دورہ شروع ہو گیا - خانہ جنگی میں ہزاروں لوگ تلوار کے گھاٹ اتر گئے - نظام حکومت فرسودہ ہو چکا تھا - فرقہ پرستی عام تھی - لوگ توہمات میں الجھے ہوئے تھے - معاشرے میں اسلامی روح مفقود تھی اور ہندووانہ رسمیں مسلم معاشرے میں گھر کر چکی تھیں - ان حالات میں معاشرے کی اصلاح کا کام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانداں نے اپنے ذمّے لیا اور لوگوں کو قرآن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا -

شاہ ولی اللہؒ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے - ان کے والد شاہ

عبدالرحیمؒ دہلی کے مشہور و معروف عالم تھے ، جو دینی مدرسے ''مدرسہ رحیمیہ'' میں درس دیتے تھے ۔ شاہ صاحب نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا ۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حج بیت اللہ کے لیے حجاز تشریف لے گئے ۔ تقریباً چودہ ماہ عرب میں رہ کر حدیث کی سند حاصل کی ۔ عزیزوں نے مشورہ دیا کہ ملک کے حالات غیر یقینی ہیں ۔ آپ حجاز ہی میں رک جائیں ، لیکن آپ ۱۷۳۲ میں دہلی آ گئے ۔ واپس آ کر ''مدرسۂ رحیمیہ'' کا انتظام سنبھالا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کی تعلیم کو عام فہم بنانے کے لیے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ شاہ صاحب کے دو بیٹوں نے بھی قرآن مجید کے دو علیٰحدہ علیٰحدہ ترجمے کیے ۔ ان میں سے ایک ترجمہ لفظی تھا اور دوسرا با محاورہ ۔ ان تینوں ترجموں کے بعد قرآن کے اور بھی بہت سے ترجمے ہوئے ۔ ان کی مدد سے قرآن پاک کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا ۔ اس زمانے میں لوگ قرآن کے ترجمے کو بدعت سمجھتے تھے ۔ جب شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کا ترجمہ کیا تو اس پر دہلی کے لوگ مرنے مارنے پر تیار ہوگئے ، لیکن شاہ ولی اللہؒ نے ان کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کام کو بخوبی تکمیل تک پہنچایا ۔ تمام بڑے بڑے مسلم فرقوں کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد شاہ صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ہر گروہ کے فکر میں بہت سی اچھی باتیں ہیں ، لیکن سب افراط و تفریط کا شکار ہیں ۔ انھوں نے مختلف مسلم فرقوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کیا اور اسلام کے عقائد اور اصولوں کی ایسی تشریح کی جو سب کے لیے قابل قبول تھی ۔

مسلم معاشرے کی خرابیوں اور انحطاط کو دیکھ کر شاہ ولی اللہؒ دل ہی دل میں کڑھتے تھے ۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تفہیمات'' میں

معاشرے کے ایک ایک طبقے کو اُن کی خوبیوں اور کمزوریوں پر ایسے دل گداز الفاظ میں خطاب کیا ہے کہ آج بھی دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اس صورت حال کا علاج، ایسی اسلامی تعلیم تھی جو فرد کی شخصیت میں انقلاب لے آئے۔ انھوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ ان کے زمانے کا نظام تعلیم اسلام کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، لہٰذا انھوں نے اپنے مدرسے کے نصاب تعلیم اور اس کے طریقۂ تدریس میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔

شاہ ولی اللہؒ کا خیال تھا کہ بادشاہوں اور حکمران طبقے کو معاشرے کا حق ادا کرنا چاہیے اور انھیں ملک کے امن و امان کو تباہ کرنے والے گروہوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے نظام الملک آصف جاہ، ریاست حیدر آباد کے بانی کو لکھا تھا کہ وہ کفّار اور گمراہوں کے خلاف جہاد کریں۔ شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں ملک مرہٹہ گردی سے پائمال ہو رہا تھا۔ مرہٹوں کے گھڑ سوار، کسانوں کو لوٹتے اور کھیتوں کو تباہ کرتے تھے۔ جب ان کا فتنہ حد سے بڑھ گیا تو شاہ ولی اللہؒ نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور نواب شجاع الدولہ اور نواب نجیب الدولہ کو اس کی مدد پر آمادہ کیا۔ اس کا نتیجہ پانی پت کی تیسری لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوا، جس سے مرہٹوں کی فوجی قوت پر ایسی کاری ضرب لگی کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ یہ جنگ ۱۷۶۱ء میں ہوئی اس کے دو سال بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ہو گیا۔ شاہ ولی اللہؒ کے چار بیٹے تھے جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز زیادہ مشہور ہوئے۔ انھوں نے تفسیر اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا اور اہم اسلامی موضوعات پر کتابیں اور رسالے لکھے۔ انھوں نے مدرسہ رحیمیہ کے طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے تربیت دی کہ وہ برصغیر کے کونے کونے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا پیغام پہنچائیں۔ شاہ اسماعیل

شہیدؒ اور مولانا عبدالحی جو سید احمد شہید کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے ، شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے ہی چشم وچراغ تھے - ان دونوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی - حضرت اسماعیل شہید سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہو گئے -

سید احمد شہید اور ان کی تحریک :

دوسری بڑی اصلاحی تحریک کے سربراہ سید احمد شہید بریلوی تھے - وہ ۱۷۸۶ء میں بریلی کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے - جب مدرسے میں داخل ہوئے تو پڑھائی لکھائی کے بجائے مردانہ کھیلوں اور ورزشوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے - اکیس برس کی عمر میں وہ لکھنئو پہنچے تو زوال پزیر معاشرے کے طور طریقوں سے بیزار ہو کر دینی تعلیم کے لیے شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسے واقع دہلی میں چلے آئے - یہاں بھی انھوں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دی ،لیکن باطنی صفائی کی وجہ سے بہت سے روحانی مقامات طے کر لیے - وہ اپنی قوت بازو پر بھروسا اور خدا کی ذات پر کامل یقین رکھتے تھے - مدرسے میں دو سال گزارنے کے بعد وہ ریاست ٹونک میں ملازم ہوگئےاور راجپوتانے کی لڑائیوں میں شریک ہوئے - اپنی پاکیزہ عادتوں اور حسن اخلاق سے دوسروں کے دل موہ لیتے تھے - جو شخص ان کے قریب جاتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا - ۱۸۱۶ء میں وہ دوبارہ دہلی آ گئے- یہاں شاہ عبدالحی نے ، جو علم و فضل میں منفرد تھے اور شاہ اسماعیلؒ نے ، جو ایک بلند پایہ خطیب تھے ، حضرت سید احمدؒ کی بیعت کی -

سید صاحب کو مشرکانہ رسموں سے شدید نفرت تھی - وہ کہتے تھے کہ یہی رسمیں مسلمانوں کے زوال کا سبب ہیں - مسلمانوں کو رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے اور کسی ایسی رسم پر عمل نہیں کرنا چاہیے جو آپ کے زمانے میں

موجود نہ تھی ۔ حضرت سید احمدؒ صرف ان خیالات کی تبلیغ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر خود بھی عمل کرتے تھے ۔

۱۸۲۱ء میں سید صاحب اپنے آٹھ سو ساتھیوں کے ہمراہ حج کے لیے مکے کو روانہ ہوئے اور تین سال کے بعد حجاز سے واپس آئے ۔ واپسی پر انھوں نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے خلاف جہاد کا پروگرام بنایا ۔

پنجاب اس وقت سکھوں کے قبضے میں تھا ۔ سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کیا اور اس کے بعد صوبہ سرحد کے کچھ حصے اور کشمیر تک کے علاقے کو فتح کر لیا ۔ اس نے اپنی فوج کی تربیت کے لیے چند فرانسیسی اور اطالوی جرنیلوں کو مقرر کیا ۔ سکھوں کے عہد میں مسلمان مذہبی آزادی سے محروم تھے ۔ مسجدوں میں اکثر گھوڑے باندھے جاتے تھے ۔ مسلمانوں کو مسجدوں میں اذان دینے کی اجازت نہ تھی اور باجماعت نماز پر پابندیاں تھیں ۔ جب سید صاحب کو ان باتوں کا علم ہوا تو انھوں نے شاہ اسماعیلؒ کو پنجاب کے خفیہ دورے پر بھیجا ۔ شاہ اسماعیل نے سکھوں کی زیادتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور واپس آ کر سارے حالات بیان کیے ۔ اس پر حضرت سید احمدؒ نے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی حکومت سے نجات دلانے کا مصمم ارادہ کرلیا ۔ اس مقصد کے لیے سید صاحب نے شروع میں پانچ سو سپاہی بھرتی کرکے مجاہدین کی فوج کا آغاز کیا ۔ چند دنوں میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ۔ دہلی اور دوسری جگہوں کے مسلمانوں نے اسلحہ کی خریداری کے لیے چندہ دیا ۔ انگریزوں نے ان جنگی تیاریوں کو نہ روکا کیونکہ سید صاحب کہتے تھے کہ یہ لڑائی ملک گیری کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے لیے لڑی جا رہی ہے ۔ سید صاحب کی فوج کے بہت سے سپاہی نا تجربہ کار تھے ۔ روپے کی کمی تھی ، رسد کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا ، لیکن سید صاحب نے ان تمام

مشکلوں کو نظر انداز کر کے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے جہاد کا اعلان کر دیا۔

پنجاب پر براہ راست حملہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جنگ کا محاذ سکھوں کی سلطنت کے کسی ایسے سرحدی علاقے میں بنایا جائے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔

پشاور کا خطہ اس مقصد کے لیے بہت موزوں تھا۔ سید صاحب راجپوتانے اور سندھ کے علاقوں سے ہوتے ہوئے بلوچستان پہنچ گئے اور وہاں سے درہ بولان کے راستے، مجاہدین کی فوج کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوئے۔ یہاں سے شمال کا رخ کیا۔ کابل کے قریب پہنچ کر انھوں نے مشرق کا راستہ لیا اور آخر کار نوشہرہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ طویل اور دشوار گزار سفر کئی مہینوں میں ختم ہوا۔ جب انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو سرحدی علاقے کے بہت سے آزمودہ کار لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور بہت سا اسلحہ بھی خرید لیا۔

دشمن کے ساتھ پہلی جھڑپ ۱۸۲۷ء کے آخر میں اکوڑہ کے مقام پر ہوئی۔ اس جنگ میں سکھوں کی فوج شکست کھا کر پسپا ہوگئی لیکن مجاہدین کو بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ حضرو کی فتح کے بعد سید صاحب کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اور ان کے نام کو نماز جمعہ کے خطبہ میں شامل کر دیا گیا۔ سید صاحب کی حکومت کا خرچ چلانے کے لیے شرعی ٹیکس لگانے پڑے، جس پر قبائلی سردار بگڑ گئے۔ سرحد کے مختلف قبیلوں کے اندرونی اختلافات اتنے شدید تھے کہ اگر ایک سردار ان کی حمایت کرتا تھا تو اس کے دشمن قبائل مخالف ہو جاتے تھے۔ اس خلفشار سے تنگ آ کر سید صاحب پنجتار چلے گئے اور اپنی فوج کو از سر نو مرتب کرنے لگے۔

سید صاحب کی کامیابیوں سے رنجیت سنگھ کو سخت تشویش ہوئی۔ مجاہدین کو میدان جنگ میں شکست دینا مشکل تھا۔ اس لیے

اُس نے یہ چال چلی کہ پشاور کا شہر دو پٹھان سرداروں یار محمد اور سلطان محمد کے حوالے کر دیا ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے ۔ اس طرح تین سال تک لڑائی ہوتی رہی ۔ آخرکار ۱۸۳۰ء میں مجاہدین نے پشاور فتح کر لیا ۔ یار محمد لڑائی میں مارا گیا اور پشاور میں سید صاحب کی حکومت قائم ہو گئی ۔ قبضہ ہونے کے بعد یہاں قانون شریعت کا نفاذ کیا گیا ۔ نشہ آور چیزوں کی ممانعت کر دی گئی ۔ بدکاری کو سختی سے روک دیا گیا اور بہت سی غیر اسلامی رسوم کا قلع قمع کیا گیا ۔

ان اقدامات کے سبب بہت سے قبائلی سردار کھلم کھلا سید صاحب کے خلاف ہو گئے ۔ جب ان کے اصلاحی کام میں دقتیں حد سے بڑھ گئیں تو سید صاحب نے اپنا مرکز ضلع ہزارہ میں تبدیل کرلیا ۔ یہ علاقہ کشمیر کی ریاست کے متصل واقع ہے ۔ یہاں بالا کوٹ کے مقام پر مجاہدین، سکھ فوج کے نرغے میں آ گئے ۔ اس جنگ میں مجاہدین کی فوج کی تعداد بہت کم تھی ۔ اُن کے بہت سے رہنما شہید ہو گئے ۔ بالا کوٹ کی جنگ ۱۸۳۱ء میں ہوئی، اس میں سید احمد صاحب اور شاہ اسماعیلؒ نے شہادت پائی ۔ سکھوں نے اس فتح کی خوشی میں نہایت درندگی کا ثبوت دیا اور بالا کوٹ کا شہر نذر آتش کر دیا ۔

سید احمد شہیدؒ کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ انھوں نے صرف خدا کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے آپ کو بڑی آزمائش میں ڈالا تھا ۔ اُن کی شہادت کے بعد ان کے کچھ عقیدت مند تو واپس ہندوستان چلے گئے ۔ جو باقی بچے وہ ستھانہ میں آباد ہو گئے اور مجاہد کہلانے لگے ، انھیں بنگال جیسے دور دراز علاقوں سے باقاعدہ امداد پہنچتی تھی ۔ اب ستھانہ' مجاہدین کا ایک ایسا مرکز بن گیا تھا ، جہاں سے سکھ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی انگریزوں کے خلاف برابر جہاد ہوتا رہا ۔

سارے برصغیر میں سید صاحب کے پیروؤں کا جال بچھا ہوا تھا ۔

ان کے سفیر بنگال اور بہار جیسے دور دراز مقامات سے چندہ جمع کرتے اور مجاہدین کو بھیجتے تھے - بنگال اور بہار کے لوگ اس معاملے میں سب سے پیش پیش تھے - وہاں سے مجاہدین جہاد کے لیے ستھانہ جاتے اور مجاہدانہ خدمات انجام دے کر واپس بھی آ جاتے تھے اور اپنے علاقے میں تحریک کا کام جاری رکھتے تھے - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں اس تحریک کو ختم کرنے کی بہت کوشش کی ، مگر کامیاب نہ ہوئے -

بنگال میں اس تحریک کا اثر گہرا اور دیرپا ہوا - اس میں سید صاحب کے جاں فروش پیروکار تیتومیر ، مولوی امام الدین اور صوفی نور محمد کام کرتے رہے - ایک انگریز مصنّف کا کہنا ہے کہ "انیسویں صدی میں احیائے اسلام کی تحریک جدید ہندوستان کی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ہے، چند غیر معروف انسانوں نے جو بیج بویا تھا وہ ایک تناور درخت ہو گیا اور اس وقت سارے مشرقی بنگال پر چھایا ہوا ہے" تحریک کے بڑے مرکز نواکھلی ، چاٹگام ، مالدہ ، راج شاہی اور جیسور میں تھے - اس تحریک میں بنگال کے مسلمانوں نے جان و مال کی قربانی سے قطعاً دریغ نہیں کیا اور انھی قربانیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہزار میل کے فاصلے کے باوجود بنگال اور پنجاب کے مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے -

حاجی شریعت اللہ ؒ :

انیسویں صدی کی ابتدا میں برّصغیر میں سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی - مسلمان عوام اقتصادی بد حالی کا شکار تھے - مسلم معاشرے میں بہت سی غیر اسلامی رسمیں تھیں اور ہندوؤں کے بہت سے عقائد اور توہمات مسلمانوں کی روزمرّہ زندگی میں داخل ہو گئے تھے - باشعور مسلمان ان حالات کو تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے اور صحیح اسلامی عقائد کی ترویج پر زور دیتے تھے - اس زمانے میں چند اصلاحی تحریکیں اٹھیں ، جن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے

معاشرے کو ہندو رسم و رواج سے پاک کیا جائے۔ پہلی تحریک بنگال سے شروع ہوئی ، اس کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔

حاجی شریعت اللہ بہادر پور کے گاؤں میں جو آج کل فرید پور کے ضلع میں ہے ، پیدا ہوئے۔ وہ جوانی میں حج کی غرض سے مکّے پہنچے اور بیس سال وہیں رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۰۲ء میں وطن واپس لوٹے۔ حاجی شریعت اللہ بڑے شعلہ بیان واعظ اور نیکی اور اخلاص کے پیکر تھے۔ ان کے خلوص کی وجہ سے معتقدین کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی۔ یہ لوگ ہر مشکل میں ان سے مشورہ لیتے اور مطمئن ہو کر واپس لوٹتے تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے تمام مشرکانہ عقیدوں اور رسموں کی پر زور مذمت کی اور فرائضی تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کو ان کے بیٹے نے منظّم شکل دی۔

دودھو میاں :

حاجی شریعت اللہؒ کے بیٹے دودھو میاں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرح انھوں نے بھی جوانی میں ہی حج کا فریضہ ادا کیا۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم تھے اور اپنے پیروؤں کے مفاد کا بہت خیال رکھتے۔ ہر وقت ان کی تکلیف سے آگاہ رہتے اور ضرورت کے وقت ان کی امداد کو پہنچتے۔ وہ بد باطن عناصر سے بھی نپٹنا جانتے تھے۔ ان کے زمانے میں فرائضی فرقے نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی ، جس کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے مسلمان کاشت کاروں کو ہندو زمینداروں کے ظلم و ستم سے نجات دلائی جائے۔

دودھو میاں نے بنگال کو حلقوں میں تقسیم کر کے ہر حلقے میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا جو کاشتکاروں کو ہندو زمینداروں اور نیل کی کاشت کرانے والے لالچی اور ظالم انگریز سوداگروں کے خلاف منظم کرتا تھا۔ تحریک کے لیے چندہ بھی جمع کیا جاتا تھا۔ ہندو زمیندار، کاشت کاروں پر ہر قسم کی زیادتیاں کرتے تھے۔ وہ

لگان کے علاوہ ان سے کئی قسم کے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے ، مثلاً درگا دیوی کی پوجا کے تہوار کا ٹیکس ۔ اس تحریک کا آہستہ آہستہ پورے بنگال پر اثر ہوا اور ہندو زمیندار تحریک کے کارکنوں سے خوف کھانے لگے ۔ فرائضی تحریک کو آگے بڑھانے میں حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے بعض پیروؤں نے بھی بہت کام کیا ۔ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں میں ہندوؤانہ رسموں کا خاتمہ ہو گیا اور بنگال کے مسلمانوں کا وقار اور عزت بحال ہو گئی ۔

تیتو میر :

تیتو میر کی تحریک کا مقصد بھی کاشتکاروں کو زمینداروں کے ظلم اور تعدّی سے نجات دلانا تھا ۔ ان کا اصلی نام سید نثار علی تھا ۔ یہ ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے ۔ جس زمانے میں یہ حج کو گئے اُن کی ملاقات مکّہ معظمہ میں سید احمد شہید سے ہوئی ، انھوں نے وہیں ان کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ تیتو میر، سید صاحب کے ساتھ ہی ہندوستان واپس آئے ۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی سید احمد شہید سے کلکتہ میں دوبارہ ملاقات ہوئی ۔ جس کے بعد تیتو میر نے بنگال کے شہروں کا دورہ کرنا شروع کیا ۔ اس زمانے میں انھیں اس بات کا اندازا ہوا کہ کاشت کاروں پر کیا کیا ظلم ڈھائے جا رہے ہیں ۔ اس میں ہندو زمیندار ، نیل کے انگریز سوداگر ، یورپی پادری اور پولیس برابر کے شریک تھے ۔

سرفرازپور کا زمیندار کرشن دیو رائے اپنے کاشتکاروں پر بہت زیادتیاں کیا کرتا تھا ۔ تیتو میر نے وہیں ایک مسجد میں اپنا مرکز قائم کیا ۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے گرد سرفروشوں کا ایک گروہ جمع ہو گیا ۔ اس پر زمیندار کی سختیاں اور بھی شدت اختیار کر گئیں اور اس نے اعلان کر دیا کہ جو شخص ڈاڑھی رکھے گا اُسے ۱۲۵ روپے جرمانہ ادا کرنا ہو گا ۔ اگر مسجد تعمیر کی جائے تو کچی عمارت پر ۵۰۰ روپیہ اور پکی عمارت پر ایک ہزار روپیہ تاوان

دینا ہو گا ۔ اگر کسی نے گائے ذبح کرنے کی جرأت کی تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا اور جو شخص تیتو میر کو پناہ دے گا ، اس کا گھر مسمار کر دیا جائے گا ۔ اس اعلان کا لوگوں پر زیادہ اثر نہ ہوا اور وہ بدستور تیتو میر کے پاس حاضر ہوتے رہے ۔ ایک روز زمیندار نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ تیتو میر پر حملہ کر دیا ۔ مسجد کو آگ لگا دی اور ان کے ساتھیوں کے گھر بھی جلا دیے ۔

کاشت کاروں نے علاقے کے انگریز مجسٹریٹ کے پاس شکایت کی ، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ ادھر تیتو میر نے ایک پرانی مسجد کو آباد کر کے وہاں نیا مرکز قائم کر لیا اور لوگوں کو شمشیرزنی اور تیر اندازی کی مشق کرانی شروع کر دی ۔ یہ تحریک نیل کے انگریز سوداگروں کے لیے بھی خطرہ بن چکی تھی ۔ ان میں سے نیل کے ایک سوداگر نے چار سو آدمیوں کے ساتھ حملہ کیا ، مگر اس وقت تیتو میر کے رفیق اچھی تربیت حاصل کر چکے تھے ۔ انھوں نے ایسا زور دار جوابی حملہ کیا کہ انگریز سوداگر کو بھاگ کر جان بچانی پڑی ۔ اس کے بعد ایک اور ہندو زمیندار نے جو اس علاقے میں اپنی دلیری کی وجہ سے مشہور تھا ، ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ حملہ کیا ۔ اس لڑائی میں ہندو زمیندار جان سے مارا گیا اور اس کے ساتھیوں کا بھی بہت نقصان ہوا ۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے علاقوں کے کلکٹر اور مجسٹریٹ بھی دستے لے کر آئے ، مگر سب کو نقصان اٹھا کر واپس جانا پڑا ۔ تحریک کے خلاف کلکتہ میں زمینداروں نے بڑا ہنگامہ مچایا اور گورنر بنگال سے بھی اس کی رپورٹ کی گئی ۔ اس نے وہاں سے ایک فوج بھیجی ۔ اس حملے میں تیتو میر شہید ہو گئے اور ان کے آٹھ سو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ تیتو میر کے سالار ، غلام معصوم کو پھانسی کی اور دوسرے قیدیوں میں سے بعض کو کالے پانی اور دوسروں کو عمر قید کی سزا دی گئی ۔ بنگال کے مسلمان آج بھی تیتو میر کو زندہ شہید سمجھتے ہیں ۔

سوالات

۱ - حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کمالات اور اصلاحی کارناموں کو بیان کیجیے -

۲ - سید احمد شہید کی ابتدائی زندگی کیسی تھی اور ان کی تحریکِ جہاد کا کیا مقصد تھا ؟ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ؟

۳ - تحریکِ جہاد نے برصغیر کے مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی زندگی پر کیا اثرات چھوڑے ؟

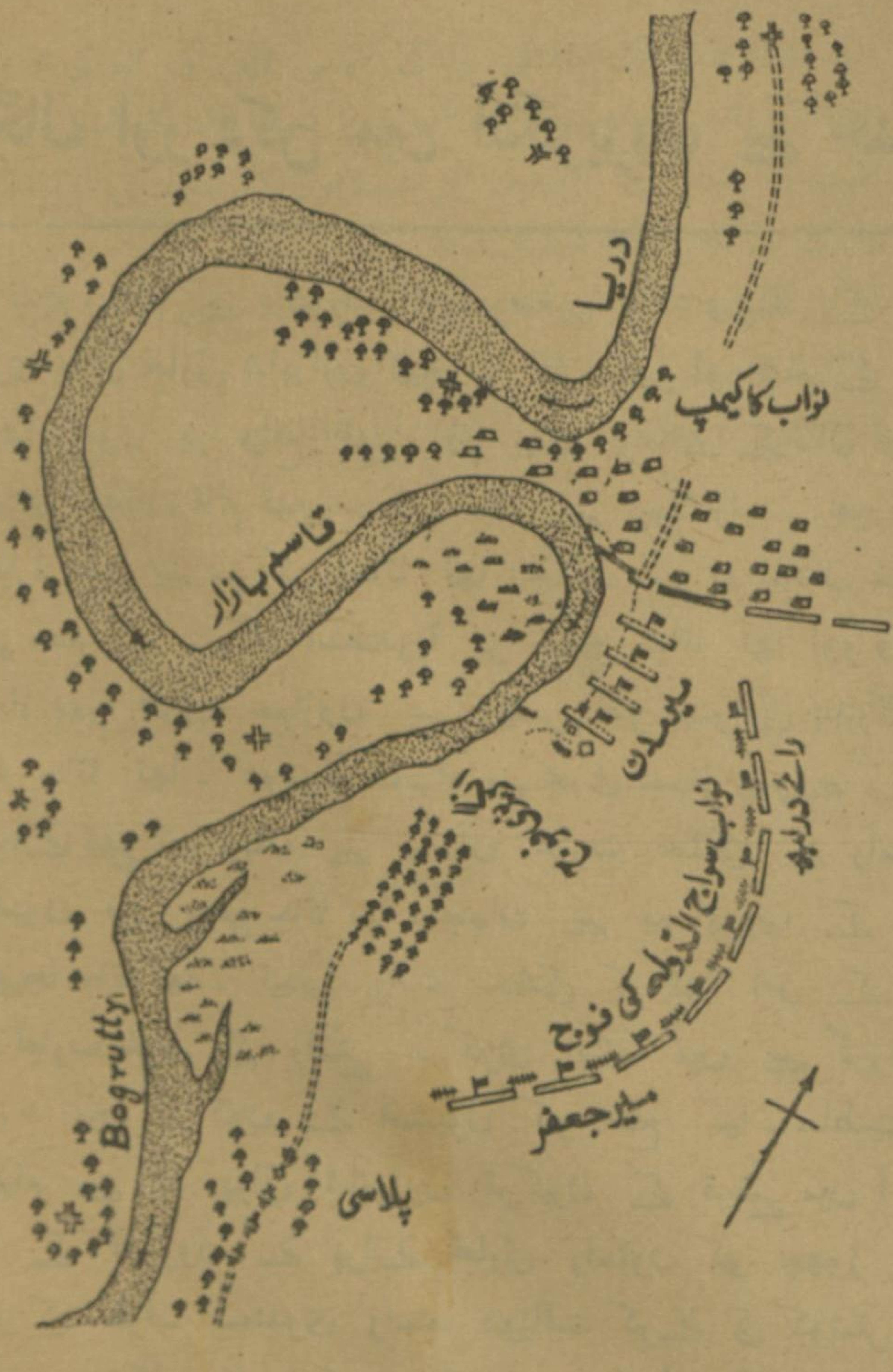
۴ - حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر کی تحریکات کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ؟

۵ - تیتو میر کو زندہ شہید کیوں مانا جاتا ہے ؟

باب ٦

بنگال اور دکن میں انگریزوں سے جنگیں

قدیم ایام سے ، یورپ اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان تین بڑی بڑی تجارتی شاہراہیں تھیں ۔ اٹلی، مصر اور شام کے ممالک ، انھیں شاہراہوں پر واقع تھے اور یہاں برصغیر کے مال تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں قائم تھیں ۔ ان میں سے پہلا راستہ بحیرۂ عرب اور بحیرۂ احمر سے ہو کر جاتا تھا جہاں سے یہ سامان خشکی کی راہ سے مصر کی بندرگاہ اسکندریا پر پہنچ جاتا تھا اور وہاں سے ایک بار پھر بحری جہازوں سے وینس اور جینوا کی بندرگاہوں پر پہنچایا جاتا تھا ۔ دوسری شاہراہ سے بحری جہاز بصرے کی بندرگاہ تک جاتے تھے اور وہاں سے سامان تجارت خشکی کے راستے شام کی منڈیوں میں پہنچ جاتا تھا ۔ جہاں سے یہ یورپ کے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا ۔ تیسرا راستہ خشکی کا تھا اس کے ذریعے سامان تجارت غزنی کے راستے مرکزی ایشیا میں سے گزرتا تھا ۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے استنبول کو فتح کیا ۔ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے یہ پرانی شاہراہیں ترکوں کے قبضے میں آ گئیں ۔ یورپ کے تاجروں نے پرانے تجارتی راستوں کو چھوڑ دیا اور برّصغیر کی طرف سمندری راستہ دریافت کرنے کی کوشش شروع کر دی ۔ پرتگال کے ایک جہازران واسکوڈی گاما نے چند سال کی تگ دو کے بعد راس امید کے گرد چکر کاٹ کر برّصغیر کا بحری راستہ دریافت کر لیا ۔ جن ملکوں نے نئے تجارتی راستے دریافت کیے ، انھوں نے سمندر پار بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا



نقشہ جنگِ پلاسی

جس سے ان کی تجارت خوب چمک اٹھی۔

دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے بھی برصغیر کے ساتھ تجارت کے لیے ۱۶۰۰ء میں ایک تجارتی کمپنی بنائی جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا۔ اس کمپنی نے اپنی سب سے پہلی تجارتی کوٹھی سورت میں قائم کی۔ اس کے بعد مدراس اور بنگال میں تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں۔ بنگال میں ان کا سب سے اہم تجارتی مرکز ہگلی (کلکتہ) تھا۔

اس زمانے میں مغلیہ سلطنت پر زوال آچکا تھا۔ مغل حکمرانوں کی کوشش سے جو مرکزی حکومت قائم ہوئی تھی، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ مختلف صوبوں کے حاکم ایک ایک کر کے آزاد ہوتے جارہے تھے۔ بنگال کا صوبہ دار علی وردی خان بھی مرکزی حکومت کے اقتدار سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے ہندوؤں پر اس قدر اعتماد کیا کہ ان میں سے اکثر فوج کے سالار، لگان جمع کرنے کے اجارہ دار اور زمیندار بن گئے۔ اس کے جانشینوں کے وزیر اور مشیر بھی زیادہ تر ہندو ہی ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ دل سے مسلم حکومت کے مخالف تھے۔ ایک انگریز مصنف کے بقول "وہ حکومت کا تختہ الٹ دینے کے موقع کا انتظار کر رہے تھے"۔

علی وردی خان ملکی معاملات کو خوب سمجھتا تھا اور وہ انگریز کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر بہت کڑی نظر رکھتا تھا۔ اگر قدرت اسے مہلت دیتی تو وہ انگریزوں کو قابو میں رکھتا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ، بنگال کا نواب بنا۔ نیا حکمران ایک سچا اور نڈر محب وطن تھا۔ اس کے مقابلے میں بنگال کی نوابی کا ایک اور دعویدار بھی تھا۔ اس وجہ سے اس کے دربار کے ہندو افسروں اور کلکتہ کے سیٹھوں کو ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا۔ اس سے انگریزوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ

نواب کے مخالفوں اور باغیوں کو پناہ دیتے اور کلکتے میں قلعہ بندیاں کرتے تھے ۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کو قلعہ بندیوں سے روکا۔ جب انگریزوں نے انکار کیا تو نواب نے اعلان جنگ کر دیا اور کلکتے پر چڑھائی کر کے انھیں ذلت آمیز شکست دے کر کلکتہ سے نکال دیا ۔ اگر ہندو افسروں کی سازشیں انگریزوں کے آڑے نہ آتیں تو سراج الدولہ ان کو ہمیشہ کے لیے بنگال سے نکال دیتا ۔ لیکن موقع پرست ہندو امرا نے اس کے دل میں یہ خوف بھی پیدا کر دیا کہ افغانستان کا حکمران احمد شاہ ابدالی، بنگال پر حملہ کرنے والا ہے ان باتوں سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ نواب سے ٹکر لینے کی تیاریاں کرنے لگے ۔ مدراس سے مزید فوج منگوائی اور نواب کے سپہ سالار میر جعفر کو نوابی کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ۔ اس سازش میں نواب کے ہندو افسروں کے علاوہ کلکتے کے ہندو سیٹھ بھی شامل تھے ۔ جون ۱۷۵۷ء میں انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان پلاسی کے مقام پر جنگ ہوئی ۔ میر جعفر کے فوجی دستے حرکت میں نہ آئے ۔ سراج الدولہ کی فوج کو شکست ہوئی ۔ میر جعفر نے اسی موقع پر عہد شکنی اور قوم کے ساتھ دشمنی کی ایک ایسی مثال پیش کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی سراج الدولہ واپسی پر شہید ہو گیا ۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلے میں مسلمانان ہند کی یہ سب سے پہلی عظیم قربانی تھی ۔ اس لیے اس کا نام آزادی کے سرفروشوں میں سر فہرست آتا ہے ۔ میر جعفر کو نواب بنا دیا گیا لیکن حقیقت میں بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا ۔ انھوں نے اپنی تجارت کو وسیع کیا ۔ بنگال کی دولت کو سمیٹا ۔ کسانوں پر تشدد کرنا شروع کر دیا ۔ صنعتیں تباہ کر دیں اور اہل حرفہ کو قلاش بنا دیا ۔

انگریزوں کی ان زیادتیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب ۱۷۷۰ء میں قحط پڑا تو بنگال کی ایک تہائی آبادی ہلاک ہو گئی ۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان:

بعض مسلمان حکمرانوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا جم کر مقابلہ کیا ۔ ان میں میسور کے حکمران حیدر علی اور سلطان ٹیپو سب سے زیادہ مشہور ہیں ۔ حیدر علی اپنی خدا داد صلاحیتوں سے معمولی حیثیت سے ترقی کر کے میسور کا حکمران بن گیا تھا ۔ اس نے آہستہ آہستہ اردگرد کے علاقوں کو فتح کر کے اس ریاست کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا ۔ اس نے فرانسیسی افسروں کو ملازم رکھ کر اپنی فوج کو اعلیٰ تربیت دی ۔ اس زمانے میں اس کی رسالہ فوج برّصغیر کی بہترین فوج سمجھی جاتی تھی ۔ اس فوج کو لے کر جب وہ کسی علاقے پر حملہ کرتا تو بجلی کی سی تیزی سے جا پڑتا۔ اس کے رسالے کی برق رفتاری اور کارکردگی کی وجہ سے انگریزی فوج کو اکثر پسپا ہونا پڑتا تھا ۔ اس نے جنگی قیدیوں اور یتیم بچوں کو تربیت دے کر کچھ دستے تیار کر لیے تھے ، جن کو "چیلا فوج" کہتے تھے ۔ وہ کسانوں سے ان کے فالتو اوقات میں فوج کے لیے سڑکیں اور مورچے بنانے کا کام بھی لیتا تھا ۔ اس زمانے میں دکن میں حیدر علی کے علاوہ دو اور بڑی طاقتیں مرہٹے اور نظام حیدر آباد تھے ۔ میسور کی پہلی جنگ میں حیدر علی نے سب سے پہلے نظام اور مرہٹوں کو انگریزوں سے علیٰحدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا لیکن نظام جلد ہی اپنے وعدے سے منحرف ہو کر دوبارہ انگریزوں سے مل گیا ۔

انگریزوں کی فوج نے مغربی ساحل کی بندرگاہ 'ماہی' پر قبضہ کر لیا تھا ۔ حیدر علی نے اپنے بحری بیڑے کو ایک فرانسیسی افسر کے ماتحت تربیت دی تھی اور فرانسیسیوں نے اسی بندرگاہ کے راستے اسے امداد بھیجی تھی ۔ حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان نے برق رفتاری سے ماہی پر حملہ کیا ۔ اس کے بعد حیدر علی خود بھی جا پہنچا ۔ انگریزوں کی فوج ، حیدر علی کی جنگی تیاریاں دیکھ کر اتنی خوف زدہ

ہوئی کہ بحری جہازوں میں بیٹھ کر بھاگ گئی ۔ ادھر مدراس کی انگریزی حکومت اس اچانک حملے سے بے حد بوکھلا اٹھی ۔ اُس نے اپنے سفیر کے ذریعے صلح کی درخواست کی ، لیکن حیدر علی نے پیغام بھیجا کہ اس درخواست کا جواب وہ خود مدراس پہنچ کر دے گا ۔ حیدر علی ایک سو تین میل کا سفر ساڑھے تین دن میں طے کر کے اچانک مدراس کے قریب پہنچ گیا ۔ اس صورت حال سے انگریزی حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انھوں نے دب کر حیدر علی سے صلح کر لی ۔

حیدر علی کے ساتھ انگریزوں نے جو صلح نامہ کیا تھا ۔ اس کی رو سے انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی دشمن نے حملہ کیا تو فریقین ایک دوسرے کی مدد کریں گے ۔ کچھ عرصے کے بعد مرہٹوں نے میسور پر حملہ کر دیا ، لیکن اس موقع پر انگریزوں نے کوئی مدد نہ کی ۔ اس کے علاوہ بمبئی کی انگریزی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ حیدر علی کو گرم مسالے کے بدلے میں بارود اور قلمی شورہ مہیا کرے گی ، لیکن انھوں نے اس وعدے کا بھی پاس نہ کیا ۔ اس طرح سے حیدر علی کے ساتھ جو عہد نامے کیے گئے تھے ، ان سب کی دھجیاں بکھیر دیں ۔ اس بد عہدی کی سزا دینے کے لیے حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔

حیدر علی ایک طوفان کی طرح کرناٹک پر حملہ آور ہوا اور دیکھتے دیکھتے مدراس سے نوے میل کے فاصلے پر پہنچ گیا ۔ اس کے مقابلے کے لیے انگریزوں نے علیٰحدہ علیٰحدہ دو فوجیں بھیجیں ۔ کرنل بیلی کی فوج پر پیچھے سے ٹیپو سلطان نے گولہ باری کی اور دونوں جانب سے حیدر علی کی رسالہ فوج نے بجلی کی تیزی سے حملہ کر دیا ۔ کرنل بیلی کو پسپا ہونے کا بھی موقع نہ ملا ۔ اس کا پورا بریگیڈ تباہ ہو گیا اور اسے حیدر علی سے نہایت دب کر صلح کرنی پڑی ۔ انگریزوں کے وقار کو اس سے بڑا دھچکا لگا ۔ کرنل منرو کی

فوج اس شکست کا حال سن کر بدحواسی کے عالم میں بھاگ گئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کے ہاتھ سے مدراس کے سوا تمام قلعے نکل گئے۔ لیکن اس مرحلے پر حیدر علی نے سرطان کے مرض سے وفات پائی۔ اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی۔ آخرکار فریقین نے صلح کر لی اور ایک دوسرے کے علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے۔ دشمنوں کے خلاف حیدر علی کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ بڑا جفاکش اور سخت کوش حکمران تھا، وہ صبح سے لے کر آدھی رات تک کام کرتا تھا۔ وہ اپنی رعایا کے لیے شفیق باپ سے کم نہیں تھا اور سب طبقوں کا دل ہاتھ میں رکھتا تھا۔ حیدر علی کا دل قوم کی محبت اور آزادی کے جذبے سے سرشار تھا۔ بچپن ہی میں دینی تعلیم کی بدولت اس کے دل میں جہاد کا شدید احساس پیدا ہو گیا تھا اس وجہ سے اس نے انگریزوں جیسی زبردست طاقت سے ٹکر لی اور ان کے قدم ڈگمگا دیے۔

ٹیپو سلطان:

ٹیپو سلطان نے میسور کی دوسری جنگ میں انگریزی فوجوں کو بار بار شکست دی۔ حیدر علی کے مرنے کے بعد اس نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر کے اپنی توجہ انتظام سلطنت کو بہتر بنانے کی طرف مبذول کر دی اور آنے والی کشمکش کے لیے تیاری کرنے لگا۔ اس نے فرانسیسیوں کی مدد سے اپنے بحری بیڑے کو مضبوط بنایا اور ترکی اور فرانس کو سفارتیں بھیجیں تاکہ وہ آنے والی جنگ میں اس کی امداد کر سکیں۔ لیکن سفارتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اس زمانے میں لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر آیا تھا۔ اس نے سلطان ٹیپو کے خلاف محاذ بنانے میں ہر قسم کی بدعہدی اور سیاسی فریب کاری سے کام لے کر نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے سلطان کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کر لیا اور جنرل میڈوز

کو سلطان کے خلاف مدراس بھیجا ۔ سلطان نے اس کو شکست فاش دی ۔ اس پر کارنوالس خود فوج لے کر اس کے مقابلے میں آیا ، لیکن سلطان کی رسالہ فوج نے برق رفتاری سے اس کی رسد کے راستے کاٹ دیے ، جس پر کارنوالس کو بری طرح پسپا ہونا پڑا ۔ اس کے بعد اس نے مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کیا اور سلطان کے خلاف کئی محاذوں پر جنگ شروع کر دی ۔ سلطان ایک سال تک بڑی بے جگری سے تینوں دشمنوں کی ، متحدہ افواج کا مقابلہ کرتا رہا ، لیکن دشمن کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے سرنگاپٹم کے قلعے میں محصور ہونا پڑا ۔ محاصرے کی حالت میں بھی وہ سال بھر دشمن کا مقابلہ کرتا رہا ، لیکن آخرکار اس نے آدھی سلطنت دشمنوں کے حوالے کر کے صلح کر لی ۔

اس کے بعد ، جب ولزلی، گورنر جنرل بن کر آیا تو اس نے آتے ہی سلطان کے خلاف ایک بار پھر محاذ بنانے کی کوشش کی ۔ اس مرتبہ نظام اور مرہٹے دوبارہ انگریزوں کے ساتھ مل گئے ۔ جنگ شروع کرنے کے لیے انگریزوں نے یہ بہانہ بنایا کہ سلطان فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے ۔ ۱۷۹۹ء میں میسور پر تین طرف سے حملہ کر دیا گیا ۔ سلطان نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا ، لیکن آخرکار اسے سرنگاپٹم کے قلعے میں محصور ہونا پڑا ۔ محاصرے نے طول کھینچا ۔ اس کے ہاں بھی غداروں کی کمی نہیں تھی ۔ انھوں نے انگریزوں کو فصیل کے کمزور حصوں کا پتا بتا دیا جس سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے قلعہ فتح کر لیا اور سلطان بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا ۔ سلطان ٹیپو کا قول تھا کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی ، گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے“ ۔ سلطان نے اپنی بے مثال قربانی سے اپنے قول کو سچا کر دکھایا ۔ اس نے اپنے والد کے زمانے ہی سے انگریزوں اور دوسرے دشمنوں پر اپنی جرأت ، بہادری اور جنگی مہارت کی دھاک بٹھا دی تھی ۔ اگر



ٹیپو سلطان

مرہٹے اور نظام ، اس کے ساتھ دغا بازی نہ کرتے تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ۔

اگرچہ سلطان ساری عمر طاقت ور ، سخت بد عہد اور بے اصول دشمنوں میں گھرا رہا ، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی مملکت کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی ۔ اس نے کسانوں کو ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچائیں ۔ کاشت کاری کو ترقی دینے کے لیے ان کو قرضے دیتا تھا ۔ اس کے عہد حکومت میں کسانوں سے بے گار لینے کی سخت ممانعت تھی ۔ جو کسان بنجر زمین کو کاشت میں لاتا تھا اسے شروع میں لگان معاف کر دیا جاتا تھا ۔ کسانوں سے لگان کی صورت میں ، پیداوار کا زیادہ سے زیادہ ایک تہائی وصول کیا جاتا تھا ، بلکہ بعض حالات میں حکومت صرف دسواں حصہ وصول کرتی تھی ۔ اس نے چین اور بنگال سے شہتوت کے درخت منگوا کر ان کی کاشت کروائی ، جس سے میسور میں ریشم کی پیداوار کو بہت ترقی ہوئی ۔ گنے سے چینی بنانے کے لیے اس نے چین سے ماہر بلوائے ۔ اس نے گھوڑوں اور بار بردار جانوروں کی نسل کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی ، جن کی وجہ سے اس کی رسالہ فوج کی کارکردگی میں بہت اضافہ ہوا ۔

سوالات

۱ ۔ ان اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیے جو مغربی طاقتوں کے برصغیر میں آنے کا باعث ہوئے ۔

۲ ۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ملک کو غیروں کے قبضہ میں جانے کے خلاف کون کون سے کارنامے انجام دیے ؟

۳ ۔ ٹیپو سلطان کی شکست کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیے ۔

باب ۷

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

۱۸۵۷ء کی جنگ ، برصغیر کی تاریخ کا وہ ناقابل فراموش باب ہے ، جس پر بے شمار کتابیں اور رسالے لکھے جا چکے ہیں ۔ لیکن اس کے متعلق کم و بیش تمام معلومات انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں ۔ انگریز اس جنگ کو غدر کا نام دیتے اور اپنے مخالفوں کو باغی کہتے تھے ۔ پاکستانی عوام کے نزدیک یہ بغاوت نہ تھی بلکہ جنگ آزادی تھی ۔ انگریز مورخوں نے اس جنگ کے دو بڑے بڑے اسباب بتائے ہیں ۔

(الف) کمپنی کی فوج میں نظم و ضبط کا فقدان تھا ۔ سپاہی خودسر تھے اور اکثر اپنے افسروں کی نافرمانی کرتے رہتے تھے ۔ کہنے کو یہ بنگال کی فوج تھی ، لیکن اس میں زیادہ تر گنگا جمنا کے دوآبے کی اونچی ذاتوں کے ہندو شامل تھے ۔ مسلمان سپاہیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی ۔ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سلطنت کی وجہ سے فوج کو دور دراز مقامات پر بھیجنا پڑتا تھا ۔ سپاہیوں کو اگر سمندر پار جانے کا حکم دیا جاتا تو وہ صاف انکار کر دیتے اور اگر جانے پر رضامند بھی ہوتے تو زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرتے تھے ۔ حکم عدولی کے مسلسل واقعات کے بعد ۱۸۵۶ء میں یہ قانون بنایا گیا کہ فوج میں بھرتی ہونے والے ہر نوجوان سے تحریری طور پر یہ وعدہ لیا جائے کہ وہ دنیا کے ہر حصہ میں فوجی خدمت کے لیے جانے کو تیار ہوگا ۔ ہندو مذہب میں سمندر پار جانے

پر پابندی تھی ، اس لیے ہندو سپاہیوں نے اس قانون کو اپنے مذہب میں مداخلت خیال کیا اور اس کے خلاف بہت شور مچایا ۔

(ب) برصغیر کے اندر ۱۸۵۷ء کے آغاز میں گورا فوج بہت کم رہ گئی تھی ، کیونکہ بہت سے انگریز سپاہی چین اور ایران کی لڑائیوں میں بھیج دیے گئے تھے ۔ برصغیر میں گورے سپاہیوں کی اکثریت پنجاب کے نو مفتوحہ علاقوں میں متعین تھی ۔ دہلی اور کلکتہ کے درمیانی علاقوں میں خال خال انگریز سپاہی نظر آتے تھے ۔ ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دیسی فوج نے اپنے افسروں کے خلاف بغاوت کر دی ۔

یہ تو ہے انگریز مؤرخوں کی کہانی ، بات صرف اتنی نہیں ۔ ہنگامہ شروع تو فوجی چھاؤنیوں سے ہوا لیکن جلد ہی پورے ملک میں پھیل گیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی تمام قومیں ، انگریزی حکومت کے رویے سے بیزار تھیں ۔ لوگوں میں بد دلی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ۔ پچھلے چند سالوں میں بہت سے جاگیرداروں اور والیان ریاست کی جاگیریں اور ریاستیں جبراً ضبط کر کے انگریزی سلطنت میں شامل کر لی گئی تھیں ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکّہ برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا تھا ۔ اس کی متواتر کامیابیوں سے لوگوں میں ہراس پھیل گیا ۔ کمپنی کا وظیفہ خوار مغل بادشاہ ، صرف قلعے کے اندر اپنا دربار لگاتا تھا ، اس طرح وہ بھی انگریزوں کا قیدی بن کر رہ گیا تھا ۔ اودھ کے بادشاہوں نے انگریزوں سے دوستی کا حق نبھایا ۔ ان کے عہد میں انگریزوں کو ہر لحاظ سے بہت فائدہ پہنچا ۔ مگر ۱۸۵۶ء میں شاہ اودھ کو ذلیل کر کے گدی سے اتار کر کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا ۔ حیدر آباد کے نظام کو ڈرا دھمکا کر اس سے برابر کا علاقہ ہتھیا لیا ۔ مغل بادشاہ کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ تمھارے مرنے کے بعد تمھارے خاندان میں

بادشاہی کا خطاب باقی نہ رہے گا اور تمھاری اولاد کو لال قلعہ بھی خالی کرنا ہوگا ۔ اگرچہ مغلوں کی سلطنت ختم ہو چکی تھی لیکن لوگوں کو پھر بھی بادشاہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ ایسی باتوں سے ان کو دلی رنج پہنچتا تھا ۔ وہ انگریزوں کو ملک کا دشمن سمجھتے تھے ۔

انگریزوں کے عہد حکومت میں آبادی کے ہر طبقے کو نقصان ہوا ۔ زمینداروں سے ان کی جاگیریں چھین لی گئیں ۔ کاشکاروں کا لگان بڑھا دیا گیا ۔ دیسی صنعتوں پر تباہی آ گئی اور ہزاروں اہل حرفہ بیکار ہو گئے ۔ غرضیکہ ہر طبقے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ برابر پرورش پاتا رہا ۔ لوگ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پاتے تھے اور موقع کی تلاش میں تھے ۔ کمپنی کی حکومت میں عیسائی پادریوں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا ۔ حکومت کی طرف سے ان کو بہت رعایتیں حاصل تھیں ۔ وہ شہروں اور دیہات میں آزادی سے جلسے منعقد کرتے ، عیسایت کی خوبیاں بتاتے اور دوسرے مذہبوں کی ''برائیاں'' بیان کرتے تھے ۔ لوگوں کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا ۔ کوئی شخص اپنے مذہب کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا ، لیکن حکومت کے افسر پادریوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے ۔ اس سے عوام میں یہ خیال زور پکڑ گیا کہ انگریزی حکومت لوگوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے اور وہ اس کو بنیاد سے اکھاڑنے کے درپے ہوگئے ۔

جنوری ۱۸۵۷ء میں فوج میں ایک نئی ساخت کی بندوق رائج کی گئی جس کے کارتوسوں پر چربی چڑھی ہوئی تھی ۔ کارتوس کو بندوق میں بھرنے سے پہلے ضروری تھا کہ کارتوس کا سرا دانتوں سے کاٹا جائے ۔ ان کارتوسوں کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ ان پر گائے اور سؤر ، دونوں کی چربی چڑھی ہوئی ہے ۔ یہ بات بہت حد تک درست بھی تھی ۔ افسروں نے سپاہیوں کو لاکھ تسلی دی لیکن

وہ مطمئن نہ ہوئے۔ سپاہیوں کا خیال تھا کہ یہ کارتوس ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے تقسیم کیے گئے ہیں۔ مارچ میں بارک پور کی چھاؤنی میں جب ایک سپاہی نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو اسے فوراً گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کو بچانے کے لیے دوسرا سپاہی بڑھا تو اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ ہنگامے کی اصل ابتدا میرٹھ سے ہوئی۔ ۹ مئی کو پچاسی سپاہی ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کرنے پر، فوجی عدالت کے روبرو پیش کیے گئے، جہاں انھیں قید بامشقت کی سزا دی گئی اور ان کی وردیاں اتروا کر انھیں جیل میں بھیج دیا گیا۔ اگلے روز اتوار تھا، جس وقت انگریز افسر گرجا میں گئے تو سپاہی جیل کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کو آزاد کرکے دہلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب یہ سپاہی دہلی میں پہنچے تو شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ انگریزوں نے اپنے گولہ بارود کے ذخیرے کو آگ لگا دی تاکہ یہ ان سپاہیوں کے ہاتھ نہ آ جائے۔ وہاں کی مقامی فوج بھی میرٹھ سے آنے والے سپاہیوں کے ساتھ مل گئی اور دونوں نے مل کر بہادر شاہ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ بہت سے انگریز دہلی سے نکل گئے، جو بھاگ نہ سکے وہ قتل کر دیے گئے۔

اسّی برس کا بوڑھا بہادر شاہ اس فوج کی رہنمائی کے قابل نہ تھا۔ اس لیے اس کا بیٹا مرزا مغل فوج کا جرنیل بنایا گیا، لیکن وہ سخت نا اہل تھا۔ نہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا تھا، نہ ان کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی نااہلی سے شہر میں ابتری پھیل گئی۔ خوراک کی کمی ہوگئی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور شرپسند عناصر نے لوٹ مار شروع کر دی۔ ایک مہینے کے بعد بخت خاں کی سر کردگی میں چودہ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج بریلی سے دہلی پہنچی۔ اس فوج کے تجربہ کار سپاہی انگریزی حکومت کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ بخت خان فنون جنگ سے بخوبی آگاہ تھا۔

اس نے شہر کا انتظام سنبھال کر امن و امان قائم کیا اور اپنی رواداری سے ہندوؤں کا تعاون حاصل کر لیا ۔ لیکن حالات روز بروز خراب ہوتے گئے ۔ فوج کا نظم و نسق بگڑ گیا ۔ انگریزوں نے گیا شہر کے اندر جاسوسوں کا جال پھیلا دیا ۔ بادشاہ کے کئی قریبی مشیر بھی انگریزوں کے مخبر تھے ۔ انھوں نے مرزا مغل کو بخت خان سے لڑوا دیا ۔

ستمبر کے مہینے میں ، انگریز ، زبردست سامان جنگ لے کر گورکھا اور پنجاب کی سکھ فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہوئے ۔ گولہ باری سے شہر کی فصیل توڑ دی گئی اور انگریزی فوج شہر کے اندر داخل ہو گئی ۔چھے دن کی لڑائی کے بعد شہر فتح ہو گیا ۔ بہادر شاہ نے قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی ۔ بخت خان نے بادشاہ کو دوآبے یا دکن میں جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا ، لیکن بادشاہ نہ مانا ۔ اس پر بخت خان نیپال کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا ۔ اگر بخت خان دہلی میں نہ ہوتا تو انگریز اس سے بہت پہلے شہر کو فتح کر لیتے ۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہوا ۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا ۔ عدالت نے اسے مجرم قرار دے کر جلاوطنی کی سزا دی ۔ اُسے رنگون بھیج دیا گیا ، جہاں وہ نومبر ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا ۔

اودھ کے علاقے میں بھی جنگ نے سنگین صورت اختیار کرلی ۔ انگریز لکھنؤ سے نکال دیے گئے اور انگریز ریذیڈنٹ قتل کر دیا گیا واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے برجیس قدر کو بادشاہ بنایا گیا اور اس کی ماں حضرت محل اس کی سرپرست مقرر ہوئیں ۔ احمد اللہ شاہ اپنی فوج لے کر فیض آباد سے لکھنؤ پہنچ گئے ۔ احمد اللہ شاہ،دکن کے رہنے والے تھے ۔ وہ جوانی میں آگرہ چلے آئے اور اپنے گرد مریدوں کی ایک معقول تعداد جمع کر لی ۔ اگرچہ وہ انگریزوں کے خلاف تھے ، لیکن وہ خون ناحق سے پرہیز کرتے تھے ۔ حضرت محل

اور احمداللہ شاہ میں باہمی اتحاد نہ ہو سکا۔ اس سے انگریزوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے لکھنؤ کو دوبارہ فتح کر لیا۔ کان پور، بریلی، الہ آباد اور جھانسی میں بھی جنگیں ہوئیں۔ بخت خان کے علاوہ روہیل کھنڈ میں خان بہادر خان، مولوی سرفراز علی اور سہارن پور میں حاجی امداد اللہ، تحریک آزادی کے مشہور لیڈر تھے ۱۸۵۸ء میں یہ ہنگامہ ختم ہوا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو قیام امن کا اعلان کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر دی گئی اور برّصغیر کا نظم و ضبط انگلستان کی پارلیمنٹ کو سونپ دیا گیا۔

اس جنگ میں انگریز اس لیے کامیاب رہے کہ بہت سے والیان ریاست نے ان کا ساتھ دیا اور انھیں فوجی امداد بہم پہنچائی۔ کسی بیرونی ملک کے حکمران نے اس ہنگامہ میں دخل نہ دیا۔ اگر کابل کا امیر دوست محمد خان چاہتا تو اس موقع پر انگریزوں سے بدلہ لے سکتا تھا، لیکن وہ غیر جانبدار رہا۔ سکھ اپنی سلطنت کی بربادی کو بالکل بھول گئے اور انھوں نے دل کھول کر انگریزوں کی امداد کی۔ سکھ ریاستوں کی فوجیں، انگریزوں کی امداد کے لیے دہلی پہنچیں اور انھوں نے شہر کو فتح کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس جنگ میں سات ہزار انگریز مارے گئے۔ قتل ہونے والے ملکی باشندوں کی تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو دہشت گردی کا دور شروع ہوا۔ انگریزوں نے چن چن کر محبان وطن سے بدلہ لیا۔ انگریز سپاہیوں کو قتل و غارت کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ وہ جس طرف چاہتے نکل جاتے اور لوگوں پر قتل و غارت کی مشق کرتے۔ جامع مسجد کے سامنے خوبصورت بازاروں اور عظیم الشان عمارتوں کو گراگرا کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ایک انگریز نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ دہلی کی مغلیہ عمارتوں کو مسمار کر دیا جائے۔ سکھ سپاہی مسلمانوں کے گھروں میں بے روک

ٹوک داخل ہوتے ، سامان لوٹتے اور عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے - معزز مسلمان شہریوں کو شبہ میں گرفتار کر کے فوجی عدالتوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور سرسری سماعت کے بعد موت کی سزا دے دی جاتی - اُن کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد اُن کی لاشیں دریا میں پھینک دی جاتیں - دہلی کے مسلمان مکمل طور پر تباہ ہو گئے اور مسلمان آبادی کا صرف ایک چوتھائی حصہ شہر میں رہ گیا -

انگریز فتح کے نشے میں چور تھے - انھوں نے مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی - بنگال اور یو - پی میں ان کی املاک ضبط کرلی گئیں - اوقاف چھین لیے گئے اور ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے - عیسائی پادری ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے پھرتے تھے. ان پادریوں کو سرکاری افسروں کی تائید حاصل تھی - مسلمانوں کی برتری کا زمانہ ختم ہوا اور نئے دور میں قوم کو نئے اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑ گیا -

سوالات

۱ - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حقیقی اسباب کیا تھے ؟ جنگ کے بعد مسلمانوں کو کیا مسائل پیش آئے ؟

۲ - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے -

باب ۸

۱۸۵۷ء کے بعد
سر سید احمد خاں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد، مسلمانوں پر بڑی تباہی آئی۔ قوم، مصائب کے دلدل میں پھنس گئی اور قومی بقا کے مسئلے نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ اس مسئلے کو سلجھانے اور قوم کو ایک قابل عمل راستہ دکھانے کا سہرا سرسید احمد خاں کے سر ہے۔

سر سید ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک اونچے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں مروجہ تعلیم پائی۔ بڑے ہوئے تو کھیل کود اور ورزش کے شوقین نکلے۔ اکثر مشاعروں میں جاتے اور موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ لیکن باپ کی وفات نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا اور انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ فرصت کے اوقات میں وہ تاریخ اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں انھوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب "آثارالصنادید" چھپوائی۔ جس میں دہلی کے آثار قدیمہ اور تاریخی عمارتوں کا حال لکھا۔ ان عمارتوں کا، سرسید نے گہری نظر سے معائنہ کیا۔ ان کی پیمائش کی اور ان کے کتبے نقل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیے۔ جو کتبے اونچی جگہوں پر نصب تھے ان کو نقل کرنے کے لیے کئی مرتبہ اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا۔ اس کتاب میں اردو زبان کی تاریخ اور شہر دہلی کے ماضی اور اس کے باکمال لوگوں کا حال بھی شامل کر دیا گیا۔

اس کتاب کی یورپ میں بہت قدر ہوئی ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ، انگریزوں کی حیثیت فاتح کی تھی اور مسلمانوں کی مفتوح کی ۔ فاتح قوم نے گن گن کر مسلمانوں سے بدلے لیے اور ان کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو دوبارہ اُبھرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ۔ اس تباہی پر سر سید احمد خاں ، خون کے آنسو روتے تھے ۔ ان کو قوم سے ہمدردی نہیں ، عشق تھا ۔ ساتھ ہی وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے ۔ وہ ہر قدم سوچ بچار کے بعد اٹھاتے تھے اور اس کے بعد چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر جم جاتے ۔ مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کرنے کے بعد وہ دو نتیجوں پر پہنچے ۔

(الف) مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومت سے محروم ہونے والے مسلمان ہیں اور ان کے محروم کرنے والے انگریز ۔ اس لیے مسلمانوں کو انگریزوں کے طور طریقے سے نفرت ہے ۔ انگریزوں کو مسلمانوں سے شدید بدگمانی ہے ، لیکن برّصغیر میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے اور بظاہر اس کی بنیادیں مضبوط ہیں ۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ انگریزوں سے مغائرت چھوڑ دیں ، اس کے ساتھ مجلسی تعلقات قائم کریں اور انگریزوں کے طرزِ فکر اور معاشرت کا بغور مطالعہ کریں ۔

(ب) بہت سے موجودہ علوم و فنون کے بانی مسلمان تھے لیکن پندرھویں صدی کے بعد ہماری علمی ترقی رک گئی ۔ مغربی قوموں نے جو کچھ مسلمانوں سے سیکھا تھا اس میں اضافہ کیا اور سائنس کے نظری اور علمی مطالعہ کو ترقی دی ۔ یورپ کی خوشحالی اور تمدنی ترقی کا راز جدید علوم میں مضمر ہے ۔ اگر مسلمان ، یورپی قوموں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ جدید علوم



سر سيد احمد خان

کے میدان میں اتریں اور اپنی تعلیمی کمی کو پورا کر کے دنیا کی طاقتور اقوام کے دوش بدوش چلیں ۔

یہ دنوں نکتے سر سید کی تحریک کا آغاز بنے ۔

سر سید نے انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے چند رسالے لکھے ۔ ان میں سب سے مشہور ''اسباب بغاوتِ ہند'' ہے ۔ اس رسالے میں انھوں نے بتایا کہ انگریزوں کی حکومت ، رعایا کے خیالات اور جذبات سے بالکل ناواقف تھی ۔ زود رنج اور نازک مزاج حکمران رعایا کے حال سے ناواقف اور اس کی بہبود سے بے پروا تھے ۔ مسلمانوں کے ساتھ خاص طور پر انگریزوں کا برتاؤ ظالمانہ تھا ۔ ایسے حالات میں بغاوت کا بھڑکنا قدرتی بات تھی ۔ اگر حکومت امن چاہتی ہے تو رعایا کے حالات سے باخبر رہے ۔ مسلمانوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے سر سید نے ۱۸۶۴ء میں ''سائنٹیفک سوسائٹی'' قائم کی اور اس کے دفاتر کے لیے ایک نئی عمارت بنوائی ۔ اس سو سائٹی کے جلسے مہینے میں دو بار ہوتے تھے ۔ ان جلسوں میں ذی علم لوگ آپس میں گفتگو کرتے یا اپنے لکھے ہوئے مضامین پڑھتے ۔ جلسے کے آخر میں تبادلہ خیال کیا جاتا ۔ اس سوسائٹی نے زراعت ، معاشیات ، تاریخ ، ریاضی ، طبیعیات اور کیمیا کے مضمونوں پو مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے چھپوائے ۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا وہ یورپ کی علمی ترقیوں سے واقف ہو سکیں ۔ یہ ترجمے نہایت سلیس اور با محاورہ تھے اور پڑھنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ اصل کتاب پڑھ رہا ہے یا ترجمہ ۔

۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے ، جہاں انھوں نے بہت سے سکولوں اور یونیورسٹیوں کا معائنہ کیا ۔ انگریزی طریقہ تعلیم میں انھیں یہ بات خاص طور پر پسند آئی کہ طالب علموں کو صرف

کتابیں ہی نہیں رٹائی جاتیں ، بلکہ اُن کی صحیح تربیت کی جاتی ہے اور اُن کے اخلاق پر بھی نظر رکھی جاتی ہے ۔ انھیں نہ صرف علم سکھایا جاتا ہے بلکہ مہذّب زندگی بسر کرنے کے اصول بھی بتائے جاتے ہیں ۔ یہی خیالات لے کر سر سید احمد خاں اگلے سال واپس لوٹے اور آ کر ایک کالج کی بنیاد رکھی ۔ اس کالج کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا گیا ۔ مختصر الفاظ میں اس کو ایم ۔ اے ۔ او کالج بھی کہا جاتا تھا ۔ یہ کالج علی گڑھ میں قائم کیا گیا ۔ اس کی عمارتوں کا نقشہ خود سر سید نے تیار کیا اور ان کو اپنی نگرانی میں بنوایا ۔ یہ عمارتیں سو سال گزرنے کے بعد ، آج بھی ایک عظیم علمی ادارے کے شایانِ شان نظر آتی ہیں ۔

اس کالج میں برّصغیر کے مختلف صوبوں کے مسلمان طلبا داخل ہوتے تھے ۔ بورڈنگ ہاؤس کا خرچ کم تھا ، اس لیے غریب والدین کے لڑکے بھی آسانی سے تعلیم حاصل کر سکتے تھے ۔ بے وسیلہ طالب علموں کو مالی امداد دی جاتی تھی ، طالب علم اکٹھے رہتے ، اکٹھے پڑھتے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے ۔ اس سے باہمی خلوص بڑھتا اور مسلم برادری کا جذبہ نشوونما پاتا ہے۔ علی گڑھ کا طالب علم صوبائی تعصب سے پاک تھا ۔ اس کا دل قومی خدمت کے جذبے سے معمور ہوتا تھا ۔ وہ باقاعدہ مسجد میں جا کر نماز ادا کرتا ، پابندی سے روزے رکھتا ، دل لگا کر تعلیم حاصل کرتا ، مباحثوں میں حصہ لیتا اور کھیل کے میدان میں بھی وقت گزارتا ۔ اس کالج نے برّصغیر کے مسلمانوں میں قومیت کی ایک نئی روح پھونک دی ، جس سے مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہوا اور اسی اتحاد کی وجہ سے بعد میں پاکستان وجود میں آیا ۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی سر سید کو اپنے عظیم رہنماؤں میں شمار کرتے ہیں ۔ یہ کالج ”اپنی مدد آپ کرو“ کے اصول پر قائم کیا گیا تھا ۔ اس کے قیام سے پہلے مشنری ، سرکاری سکول اور کالج موجود تھے ، لیکن ان میں مسلمانوں کی دینی تعلیم

کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سرسید سمجھتے تھے کہ ہر قوم کی تعلیمی ضروریات جدا جدا ہوتی ہیں اور کوئی ایک نظام تعلیم، تمام قوموں کے لیے یکساں طور پر مفید نہیں ہوسکتا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر سرکاری سکول اور کالج ہماری تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کرتے تو ہمیں چاہیے کہ ہم خود اپنے سکول اور کالج بنائیں۔ بہت سے اہل علم نے سرسید کے خیالات سے اتفاق کیا۔ ان کے تعلیمی منصوبے میں، ہاتھ بٹایا اور سرسید کے خیالات کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ مسلمان عوام نے کالج کو مالی امداد دی۔ چنانچہ کالج زیادہ تر مسلم قوم کے خرچ پر بنا اور اسی کے خرچ پر چلتا رہا۔ اس کامیابی سے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان کو معلوم ہو گیا کہ اگر حکومت، قومی ضرورت کا کوئی کام نہ کرے تو لوگوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اپنی مدد آپ کرنی چاہیے۔ کالج کے ہر طالب علم کے لیے دینیات اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ لازمی تھا۔ ان مضامین میں ناکام ہونے والے طالب علموں کی ترقی روک دی جاتی تھی۔ مذہبی تعلیم سے طالب علموں کے اخلاق سنورتے تھے اور تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے ان کو اپنے شان دار ماضی سے واقفیت حاصل ہوتی تھی۔

علی گڑھ کالج بہت مقبول ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں برِّصغیر کے مسلمانوں کا مرکزی ادارہ بن گیا۔ سندھ، پنجاب، بنگال اور سرحد کے طلبا جدید تعلیم کے لیے علی گڑھ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۵ء میں تمام برِّصغیر کے کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طالب علموں کا اڑسٹھ فی صد علی گڑھ ہی میں تعلیم پا رہا تھا۔

۱۹۴۰ء میں تحریک پاکستان شروع ہوئی تو علی گڑھ میں اس تحریک کی بڑے جوش و خروش سے پذیرائی ہوئی۔ قائد اعظمؒ علی گڑھ کے طلبا کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انھیں

قوم کا بہت قیمتی سرمایہ سمجھتے اور طالب علموں کی دعوت کو شوق سے قبول کرتے تھے ۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ علی گڑھ تشریف لے جاتے اور پورے سال کے سیاسی واقعات پر تبصرہ کرتے تھے ۔ تحریک پاکستان میں علی گڑھ کے طلبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ انھوں نے شہروں ، قصبوں اور دیہات میں ہر جگہ جا کر مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا اور ہر طرح پاکستان کے قیام میں امداد دی ۔

نواب عبداللطیف :

شروع شروع میں سر سیّد کی تعلیمی تحریک کا دائرہ اثر محدود تھا ۔ ان کوششوں سے صرف شمالی برصغیر کے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا ۔ بنگال میں یہی خدمت نواب عبداللطیف نے انجام دی ۔ نواب عبداللطیف فرید پور کے ضلع میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد کو تاریخ سے دلچسپی تھی اور وہ فارسی زبان میں ایک عالمی تاریخ کے مصنف بھی تھے ۔ عبداللطیف نے خود مدرسۂ عالیہ ، کلکتہ میں تعلیم پائی تھی جو وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں قائم ہوا تھا ۔ اس میں مسلمانوں کو عربی ، فارسی ، فقہ اور دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ برصغیر کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کی طرح بنگال کے مسلمان بھی اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے اور پرانے نصاب تعلیم کو اپنے لیے کافی سمجھتے تھے ۔ عبداللطیف کی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ مدرسے میں انگریزی پڑھانے کی تجویز پیش کی گئی جو بحث مباحثے کے بعد منظور ہوئی ۔ بہت سے طالب علموں کو انگریزی سے بڑی وحشت تھی ۔ وہ مدرسے میں تو باقاعدگی سے آتے تھے لیکن انگریزی کی کلاس سے غیر حاضر ہو جاتے ۔ عبداللطیف نے انگریزی کا مطالعہ شروع کیا اور اس میں مہارت پیدا کر لی ۔ بعد میں حکومت نے ان کو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر کر دیا ۔ وہ ۱۸۸۷ء میں ملازمت



نواب عبداللطیف



سید امیر علی

سے سبکدوش ہوئے۔

نواب عبداللطیف کی عمر کا زیادہ حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا۔ وہ اپنے عدالتی اور سرکاری کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، لیکن ساتھ ہی اپنی قوم کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے دن رات کوشش کرتے رہتے۔ بنگال کے مسلمانوں میں بھی انگریزی تعلیم کی مخالفت زوروں پر تھی۔

مسلمانوں کو علوم جدید سے روشناس کرنے کے لیے نواب عبداللطیف نے کلکتہ میں "محمڈن لٹریری سوسائٹی" قائم کی۔ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی سے ملتے جلتے تھے۔ لٹریری سوسائٹی کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کو بیرونی دنیا کے حالات اور سائنس کی ترقی کی رفتار سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے جلسوں میں تاریخ کے مطالعے کے فوائد، عالمی تجارت کی ترقی، جہاز رانی کی تاریخ، امریکہ کی دریافت اور تاریخ تمدن کا مطالعہ جیسے مضامین پر مقالے پڑھے جاتے تھے۔ کلکتہ کے مسلمان عمائد، ان جلسوں میں شریک ہوتے اور قومی زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ ان بحث مباحثوں نے مسلمانوں کو اپنے گرد و پیش کے حالات سمجھنے میں بہت مدد دی۔ نواب عبداللطیف کا سب سے بڑا کارنامہ محسن ٹرسٹ کی واگزاری ہے۔ حاجی محمد محسن جو ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوئے اور بیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا، کلکتہ کے بہت بڑے تاجر اور مخیر بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنی جائداد مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ وقف غیر مسلموں کے قبضے میں چلا گیا اور ایک زمانے میں اس وقف کی یہ حالت تھی کہ ہگلی کالج جو اس کی آمدنی سے چلایا جا رہا تھا، اس کے سیکڑوں طلبا میں سے صرف تین مسلمان تھے۔ نواب عبداللطیف کی کوششوں سے یہ نا جائز تصرف ختم ہوا اور وقف سے حاصل ہونے والی رقم

مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ ہونے لگی ۔

سیّد امیر علی

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سید امیر علی کو مسلمانوں کی قومی زندگی میں بہت بلند مقام حاصل ہوا ۔ سید امیر علی، بنگال کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے کلکتہ میں تعلیم پائی اور ۱۸۷۰ء میں قانون کی تعلیم کے لیے انگلستان گئے ۔ وہاں اسلامی تاریخ اور مغربی تمدن کا گہرا مطالعہ کیا اور انگلستان کے بہت سے عمائد کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کیے ۔ واپسی پر کلکتہ میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے ۔ سر سید اور امیر علی کے خیالات میں کچھ اختلاف تھا ۔ سر سید مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے ، لیکن امیر علی اس بات کے حق میں نہیں تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ سیاسی میدان مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں چھوڑ دینے سے مسلمانوں کو نقصان ہو گا ۔ اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے سید امیر علی نے ۱۸۷۹ء میں "سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی ۔ ایسوسی ایشن کے ارکان چند سال تک بہت جوش سے کام کرتے رہے ۔ سید امیر علی خود اس کے روح رواں تھے اور وہ پچیس سال تک اس کے سیکریٹری رہے ۔

سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن :

حکومت کے ہر شعبے میں مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی ۔ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ سرکاری ملازمت کے لیے قابل مسلمان نہیں ملتے ۔ یہ بہانہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اپنے جائز حق سے محروم رکھنے کے لیے تراشا جاتا تھا ۔ سید امیر علی نے انگلستان کے رسالوں میں کئی ایک مضمون لکھ کر حقیقت حال کو واضح کیا اور حکومت کے پاس بھی اسی امر کی یاد داشتیں بھیجیں ۔ ایسوسی ایشن کی کوششوں سے بہت سے مسلمانوں کو سرکاری مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے ملے ۔ جب

سید امیر علی کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بنا دیے گئے تو وہ عملی طور پر ایسوسی ایشن سے علیحدہ ہو گئے - ججی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے - ۱۹۰۸ء میں ان کو پریوی کونسل کی عدالتی کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا - یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور سید امیر علی آخری دنوں تک (۱۹۲۸ء) اس پر فائز رہے -

سید امیر علی نے انگلستان میں رہ کر مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دیں ، جو شاید کوئی دوسرا شخص انجام نہ دے سکتا - ۱۹۰۶ء میں وائسرائے نے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب دینے کا وعدہ کر لیا تھا ، لیکن اس کا آخری فیصلہ برطانوی حکومت کے ہاتھ میں تھا - یہ ڈر تھا کہ ہندوؤں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے برطانوی حکومت اس وعدے کو پورا نہیں کرے گی - اس موقع پر سیّد امیر علی نے لندن میں پبلک جلسوں ، یاد داشتوں اور ذاتی ملاقاتوں سے برطانوی حکومت کو جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ماننے پر مجبور کر دیا - اسی فیصلے نے آخر کار مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان کی راہ ہموار کر دی -

سید امیر علی کو مسلم لیگ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے - ۱۹۰۶ء میں جب مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تو سید امیر علی انگلستان میں تھے - ان کو ہمیشہ سے اس بات کا شدید احساس تھا کہ مسلمانوں کے لیے ملکی سیاست سے دور رہنا بہت مضر ہے ، اس لیے انھوں نے محسن الملک کو ایک چٹھی لکھ کر ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا مشورہ دیا - چنانچہ چند ماہ بعد ڈھاکہ میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی - اس کا ایک دفتر لندن میں بھی قائم کیا گیا اور سید امیر علی اس کے صدر منتخب کیے گئے - اس کے پہلے اجلاس میں علامہ اقبال نے بھی

شرکت کی تھی ۔

پریوی کونسل کی عدالتی کمیٹی میں سلطنت برطانیہ کے مختلف مقبوضات کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں دائر کی جاتی تھیں ۔ مقدمے زیادہ تر دیوانی نوعیت کے ہوتے تھے اور برصغیر سے پیش ہونے والے مقدموں میں اسلامی قانون کی تشریح و توضیح درکار ہوتی تھی ۔ انگریز جج اپنی لا علمی کی وجہ سے فقہ اسلامی کو غلط سمجھتے اور اس کے اصولوں کو توڑ مروڑ کر فیصلے صادر کرتے تھے ۔ سید امیر علی نے عدالتی کمیٹی میں بیٹھ کر بیسیوں مقدموں کی اپیلیں سنیں اور تمام فیصلے شرع اسلامی کے مطابق لکھے ۔ سید امیر علی کی اس خدمت کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ اگر وہ اس عدالت کے رکن نہ ہوتے تو اس عدالت کے انگریز اور دوسرے غیر مسلم جج ، شرع اسلامی کی ایسی غلط تاویلیں کرتے کہ عدالتوں کی رہنمائی کرنے والا اسلامی قانون مسخ ہو کر رہ جاتا ۔

سید امیر علی کے تحقیقی اور علمی کارنامے بھی سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں ۔ انھوں نے اسلامی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ، جس میں ابتدا سے لے کر سقوط بغداد ۱۲۵۸ء تک کے حالات نہایت عالمانہ انداز میں قلمبند کیے ۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانوں کے اقتصادی اور معاشرتی حالات ، نیز ان کی علمی اور ذہنی ترقی کا ذکر ، نہایت وضاحت کے ساتھ کیا ۔ ان کی دوسری مشہور کتاب ''دی سپرٹ آف اسلام'' ہے ۔ یہ رسول کریمؐ کی زندگی اور تعلیمات کے متعلق اعلیٰ پائے کی تصنیف ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے مصنف کی حرارت ایمانی ٹپکتی ہے ۔

تحریک دیو بند :

تحریک دیو بند کا آغاز ۱۸۶۷ء میں اس چھوٹے سے مدرسے سے ہوا ، جو سب سے پہلے دیو بند کی ایک مسجد میں قائم کیا گیا

تھا۔ اس کے اولین اساتذہ میں مولوی ذوالفقار علی کو بہت نمایاں مقام حاصل ہوا۔ مولوی صاحب محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کو ترک کر کے ایک قلیل مشاہرے پر اس مدرسے میں چلے آئے تھے اور ایک عرصے تک صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی مدرسے کے صدر مقرر ہوئے۔

مولانا محمد قاسم ۱۸۳۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پائی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔ لیکن ایک چھوٹی سی جھڑپ میں زخمی ہو گئے۔ جنگ کا ہنگامہ ابھی ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ وہ حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ واپس آ کر وہ کچھ عرصے تک تو عیسائی مشنریوں کے ساتھ مناظرے کرتے رہے، لیکن جلد ہی دیو بند کے مدرسے سے منسلک ہو گئے۔ وہ اس ادارے میں صرف پچاس روپے ماہوار تنخواہ لیتے تھے۔ مولانا محمد قاسم اعلیٰ درجے کے منتظم تھے اور رہنے سہنے میں بے حد سادہ تھے۔ ان کی زندگی توکل اور قناعت کا عمدہ نمونہ تھی۔ اپنے وصیت نامے میں انھوں نے کھل کر اس بات کا ذکر کیا کہ مدرسے کو چلانے کے لیے امرا کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔ مدرسے کی مالی حالت کا مضبوط ہونا کوئی نیک فال نہیں۔ اگر مدرسے کو صاحب ثروت طبقے کی امداد حاصل ہو گئی تو اس کے منتظم خدا پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں گے۔ مدرسے کے لیے ٹوٹی پھوٹی عمارتیں کافی ہیں۔ شاندار عمارات بنانے سے پرہیز کیا جائے۔ مالی امداد کے لیے حکومت سے بھی کوئی درخواست نہ کی جائے۔ چندہ صرف ان لوگوں سے لیا جائے جو نام و نمود کی خواہش نہ رکھتے ہوں، بلکہ محض خدا کی خوشنودی چاہتے ہوں۔ مولانا محمد قاسم کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا، لیکن ان کا تقویٰ اور ان کی پرہیز گاری مدرسے کے اساتذہ اور منتظمین کے لیے ایک

درخشاں مثال بن گئی ۔

سر سیّد احمد خاں اور مولانا محمد قاسم دونوں دہلی میں مولوی مملوک علی کے شاگرد رہے تھے، لیکن زندگی میں ان دونوں کی راہیں الگ الگ رہیں ۔ اس کے باوجود سر سید، مولوی محمد قاسم کے ذہنی اور علمی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے ۔ مولانا محمودالحسن جو مولوی ذوالفقار علی کے لڑکے تھے، ۱۸۸۸ء میں دیو بند کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور ۱۹۲۰ء تک اس عہدے پر فائز رہے ۔ ان کے زمانے میں علی گڑھ اور دیو بند ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے ۔ مولانا محمودالحسن نے "جمعیت الانصار" قائم کی ۔ ان جلسوں میں علی گڑھ تحریک کے سرگرم کارکن شریک ہوتے تھے ۔ ان کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں اداروں میں یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ علی گڑھ کے انگریزی خواندہ طلبا جو تبلیغ دین کا شوق رکھتے ہوں وہ دیو بند میں مذہبی تعلیم حاصل کریں ۔ اسی طرح علی گڑھ میں دیو بند کے ان طلبا کے لیے خاص انتظام کیا جائے گا جو وہاں سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی اور سائنسی علوم سیکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں، لیکن پہلی جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ یہ تعلق پائدار ثابت نہ ہو سکا ۔

مولانا محمودالحسن جنگ کے دوران میں مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ ۱۹۱۶ء میں شریفِ مکہ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو مولانا محمودالحسن کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا ۔ برطانوی حکومت نے ان کو مالٹا میں نظر بند کر دیا ۔ جنگ کے خاتمے پر رہا ہوئے تو دیوبند واپس آ گئے ۔ مولانا محمودالحسن کے شاگردوں میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مولانا حسین احمد مدنی، جو بعد میں دیو بند کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور مالٹا میں مولانا

محمودالحسن کے ساتھ تھے۔ دوسرے مولانا عبیداللہ سندھی جو ایک سکھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن میں چند اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بعد میں اپنے استاد کے کہنے پر افغانستان کو ہجرت کر گئے اور جنگ کے دنوں میں کابل میں مقیم رہے۔ یہاں بیٹھ کر وہ برصغیر کی تحریک آزادی کی رہنمائی کرتے رہے۔

ندوۃالعلما :

جس طرح علی گڑھ کا مقصد مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں زمانے کے تقاضوں سے روشناس کرانا تھا اسی طرح ندوۃالعلما کے قیام کا یہ مقصد تھا کہ علما اسلام کو دور جدید کی ضروریات کی روشنی میں مطالعہ کر سکیں اور علمی تحقیق کے طریقوں کو اپنا سکیں۔

اس ادارے کا قیام ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ سر سید اس وقت زندہ تھے۔ انھوں نے بھی نئے ادارے کو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے نیک فال خیال کیا۔ مولانا شبلی مصر اور ترکی کے سفر میں وہاں کی مذہبی درسگاہوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اس لیے آن کو ادارے کے قواعد و ضوابط تیار کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ چونکہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں بعض علما ایسے تھے جو حکومت کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے تھے، اس لیے حکومت اس ادارے کو شروع ہی سے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ آخر کار ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی مستقل طور پر ندوۃالعلما میں آ گئے اور یہاں کے طلبا کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا شبلی جدید علوم کے اصولوں اور یورپ کے ان علما کی تصنیفات سے بھی واقف تھے جنھوں نے اسلام پر قلم اٹھایا تھا۔ اس لیے ان کے طلبا جدید و قدیم دونوں قسم کے علوم سے استفادہ کرنے لگے۔ یہ ادارہ اپنے معیّن کردہ مقاصد کو تو آگے نہ بڑھا

سکا ، تاہم اس نے بعض اچھے علما پیدا کیے ، جنھوں نے علمی دنیا میں اس ادارے کا نام روشن کر دیا ۔ ان میں مولانا سلیمان ندوی سب سے زیادہ مشہور ہیں ۔

سوالات

۱ ۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کن اصولوں پر قائم کی گئی تھی ؟ اس تحریک نے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو کس حد تک پورا کیا ؟

۲ ۔ نواب عبداللطیف اور سید امیر علی نے بنگال کے مسلمانوں میں جدید تعلیم پھیلانے کے لیے کون کون سی تدابیر اختیار کیں ۔

۳ ۔ دیو بند ، علی گڑھ اور ندوۃالعلما کی تحریکوں کا مقابلہ کیجیے اور ان کے باہمی تعلقات کو بیان کیجیے ۔

باب ۹

برطانوی عہد میں مسلم اکثریت کے علاقے آن کے اقتصادی اور سیاسی مسائل

پہلے پہل انگریز سترھویں صدی میں تجارت کی غرض سے آئے لیکن مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر ان کی نیت بدل گئی ۔ انھوں نے درباری سازشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اپنی حکومت قائم کر لی ۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے بنگال کو فتح کیا اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی ان کے قبضے میں آ گیا ۔ گویا فتوحات کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سو سال تک جاری رہا ۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی ۔ انگریز مذہباً عیسائی تھے ۔ انھیں شروع ہی سے اسلام سے عداوت اور مسلمانوں سے بغض تھا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوؤں کی سر پرستی کرتی تھی ۔ جو عہدہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا وہ کسی ہندو کو ملتا یا کسی انگریز کو ۔ انگریز اپنی اسلام دشمنی کا کھلم کھلا اعلان کرتے اور کہتے کہ اگر ہم پر کوئی مصیبت آئی تو ہندو ہمارا ساتھ دیں گے ۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں انگریزوں کے قدم جمتے گئے وہاں مسلمانوں کی حالت ابتر ہوتی گئی ۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بنگال کا صوبہ آزاد ہو گیا ۔ بنگال کے نواب ہندوؤں پر بہت اعتماد کرتے تھے ۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے بھی آن کو دیتے تھے ۔ معمولی حیثیت کے ہندو

خاندانوں نے نوابوں کی مہربانی سے فائدہ اٹھا کر بے اندازہ دولت جمع کر لی تھی، یہاں تک کہ حکومت کے لین دین کا حساب بھی ہندو سیٹھوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا، لیکن ہندو اس پر بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ مسلمانوں کی برائے نام حکومت کو بھی جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے۔ انگریز تاجروں نے اس صورت حال کو بھانپ کر ہندو بنیوں اور سیٹھوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائے اور مسلم حکومت کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پلاسی کی لڑائی اسی گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھی۔ انگریز جرنیل کلائیو اور بنگال کے سپہ سالار میر جعفر کے درمیان سازش کی تمام تفصیلات ایک ہندو تاجر امی چند کی معرفت طے ہوئیں۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے نواب کے خزانے کو دل کھول کر لوٹا۔ بے شمار زر و جواہر انگلستان بھیجے اور نئے نواب میر جعفر سے بہت سی تجارتی رعایتیں حاصل کیں۔ ان تجارتی رعایتوں کا نقصان صرف مسلمانوں کو ہی ہوا۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو حکومت سے بھی بے دخل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے فارسی زبان سیکھنے کے لیے بھی ایک ہندو استاد مقرر کیا ہوا تھا۔ انگریز حکمران مسلمانوں کے خلاف اپنے بغض کا اعلانیہ اظہار کرتے تھے۔

مسلم حکومت کے زمانے میں حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ فوجوں کے کمانڈر، صوبوں کے گورنر، مال گزاری کے مہتمم اور عدالتوں کے حاکم ہوتے تھے۔ مسلمان علما کو حکومت کی طرف سے جاگیریں ملتی تھیں۔ مدرسوں کے مصارف کے لیے بیش بہا اوقاف تھے۔ اسی وجہ سے پوری مسلمان قوم خوش حال تھی۔ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ "اسلامی حکومت میں کوئی مسلمان مفلس نہ تھا۔ لیکن جب ان کی حکومت ختم ہوئی تو قوم کی خوش حالی بھی مفقود ہو گئی"۔ بنگال میں ایک لاکھ

مسلمان بے کار ہو گئے اور انھوں نے روزی کمانے کے لیے کاشت کاری اختیار کی۔

۱۷۹۳ء میں بنگال کا دوامی بندوبست ہوا۔ یہ بندوبست مسلمانانِ بنگال کی تاریخ کا انتہائی المناک واقعہ ہے۔ اس کی رو سے مالگزاری اکٹھا کرنے والے ہندو اراضی کے مالک بن گئے اور مسلمان کاشت کاروں کی ملکیت کا حق غضب کر لیا گیا۔ انگریزی حکومت بنگال میں وفادار ہندو زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتی تھی جو ضرورت کے وقت حکومت کی طرف داری اور حمایت کرے۔ اس سے انگریزوں کا مقصد تو پورا ہو گیا لیکن مسلمانوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہوئی۔ بنگال کے کاشت کار زیادہ تر مسلمان تھے۔ سرکاری ملازمتوں سے برطرف ہونے والے مسلمان بھی زمین پر آباد ہونے لگے۔ اس طرح زمین کی تقسیم در تقسیم ہوئی اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کاشت کرنے والے کسانوں کے لیے پیٹ پالنا مشکل ہو گیا۔ ہندو زمیندار خود تو شہروں میں رہتے تھے لیکن اپنی زمینوں کا انتظام گماشتوں کی معرفت کرتے تھے۔ یہ گماشتے مسلمان کاشت کاروں سے نہایت سختی کے ساتھ لگان اور ناواجب ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ہندو زمینداروں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے مسلمان مزارعین کو ہندو ساہوکاروں سے بھاری شرح سود پر قرض لینا پڑتا تھا۔ یہ شرح پچاس فی صد سے ساٹھ فی صد سالانہ تک ہوتی تھی۔ اس شرح میں حکومت تعلیم کے لیے جو روپیہ منظور کرتی تھی اسے عربی فارسی اور سنسکرت کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں سرکاری تعلیمی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اب مشرقی زبانوں کی بجائے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے حکومت کے دروازے بند ہو گئے اور چونکہ ابھی تک مسلمانوں کے ذہن انگریزی تعلیم کو قبول کرنے کو تیار نہ

تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سرکاری ملازمت سے بھی محروم ہو گئے۔

۱۸۳۷ء تک دفتری کاروبار فارسی زبان میں رہا۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لیے فارسی جاننا لازمی تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کے مواقع تھے۔

لیکن برطانوی حکومت نے جب فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان بنایا تو تمام فارسی جاننے والے بے کار ہو گئے۔ تم پڑھ چکے ہو کہ مغلوں کے زمانے میں تعلیم کا معقول انتظام تھا۔ مدرسوں کے اخراجات، اوقاف کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ اوقاف، بادشاہوں اور امرا کے طبقے کی طرف سے دیے جاتے تھے۔ انگریز حکمرانوں نے بہت سے اوقاف واپس لے لیے۔ اس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام معطل ہو کر رہ گیا۔ حصول علم کا رجحان اس لیے بھی کم ہو گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کو سرکاری مدرسوں میں بھیجنے پر رضامند نہ تھی۔

بنگال میں صدیوں سے نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ انگریز تاجروں نے نیل کی تجارت کو بہت فائدہ مند پایا اور وہ بنگال اور بہار میں زمینیں خرید کر اپنی نگرانی میں نیل کی کاشت کرانے لگے، لیکن نیل کے کاشت کاروں کو اتنی تھوڑی اجرت ملتی تھی کہ ان کے گھریلو اخراجات بھی پورے نہ ہوتے تھے۔ اگر کوئی کاشت کار نیل کی مقررہ مقدار وقت پر مہیا نہ کر سکتا تھا تو اسے درخت کے ساتھ باندھ کر کوڑے لگائے جاتے، اس کا مکان جلا دیا جاتا اور اس کی کھڑی فصل تباہ کر دی جاتی تھی۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے بنگال کے جلاہے بہت خوش حال تھے۔ صوبے کے صنعتی شہروں میں نہایت اعلیٰ قسم کی ململ تیار ہوتی تھی جو دور دور تک پہنچتی اور بڑی قیمت پاتی تھی۔ انگریزوں نے کپڑے کی تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر دستکاروں کے ساتھ کم و بیش وہی سلوک کیا

جو نیل کے کاشت کاروں کے ساتھ سلوک کیا تھا۔ یعنی ان کو مجبور کر کے ان سے کپڑا بنوایا جاتا۔ اجرت کم دی جاتی، جو دستکار انگریزوں کا کام لینے سے انکار کرتے ان کو وحشت ناک سزائیں دی جاتیں۔ شاید اسی خوف سے بعض دستکاروں نے اپنے انگوٹھے خود کاٹ لیے تاکہ وہ کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد بنگال کے مسلمانوں کی درد ناک حالت کا نقشہ ایک اعلیٰ انگریز عہدے دار ولیم ہنٹر نے نہایت مؤثر الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے "محلوں کے رہنے والوں کو سر چھپانے کے لیے جھونپڑے بھی میسر نہیں۔ مسلمان تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔ سرکاری دفتروں میں ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کوئی مسلمان، چپڑاسی سے بڑا عہدہ نہیں پا سکتا"۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ "جب سرکاری نوکریوں کے لیے اشتہار دیا جاتا ہے تو یہ بات صاف بتا دی جاتی ہے کہ مسلمان امیدوار درخواست نہ بھیجیں"۔ بنگال کے مسلمانوں کی حالت ۱۹۰۵ء کی تقسیمِ بنگال تک ایسی ہی رہی۔ صوبے میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کا راج تھا۔ مسلمان کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ حصول آزادی تک بنگال کے مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔

پنجاب:

پنجاب میں انگریزی حکومت ۱۸۴۹ء میں قائم ہوئی۔ اس سے پہلے سکھ، پنجاب کے مالک تھے۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سکھوں کی حکومت نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کو اذان تک دینے کی اجازت نہ تھی، اس لیے با جماعت نماز ممکن نہ تھی۔ بڑی بڑی مسجدیں اصطبل یا بارود خانے بنا دی گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک شروع کی۔ اگرچہ یہ تحریک ناکام رہی لیکن مجاہدوں نے سرحدی علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہ مدت تک

انگریزوں کو پریشان کرتے رہے۔ پنجاب، انگریزی عمل داری میں آیا تو مسلمانوں پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند تھے۔ سرکاری دفتروں پر بنگالی ہندو چھائے ہوئے تھے۔ حکومت کے افسر سکھوں کی دلجوئی کرتے اور اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے ان کو بے شمار رعایتیں دیتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے مسلمان تعلیم و تدریس کا کام کرتے تھے۔ انگریزوں کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ استادوں کو تربیت دینے والے مدرسوں میں صرف ہندوؤں کو داخل کیا جاتا اور ہندو اکثریت کے علاقوں سے مسلمان استادوں کو ہٹا دیا جاتا تھا۔ اس صوبے میں برطانوی عہد کے اندر کوئی قابل ذکر صنعت قائم نہ ہوئی۔ تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں رہی اور اکثریت کے باوجود مسلمان ہندو ساہوکاروں اور تاجروں کے دست نگر رہے۔

انگریزی دور میں پنجاب کی مسلمان دیہی آبادی کو بہت نقصان پہنچا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ جب انگریزوں نے پنجاب کو فتح کیا تو اگرچہ سارے صوبے میں جان اور مال محفوظ نہیں تھے لیکن ساہوکاروں کا سودی کاروبار زوروں پر تھا۔ قرض خواہ ہمیشہ ہندو اور مقروض عام طور پر مسلمان ہوتا تھا۔ مسلمان کسان سخت محنت کرتا لیکن اس کا معیار زندگی پست رہتا تھا۔ اس کی ساری کمائی ساہوکار کی نذر ہو جاتی تھی اور وہ ہمیشہ قرض کے بوجھ تلے دبا رہتا۔ دیہات میں جا بجا گندگی اور غلاظت کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ انگریزوں نے ہسپتال بنائے، نہ سکول کھولے۔ سڑکیں کچی تھیں اور ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ۱۸۶۸ء میں سارے صوبے میں ساہوکاروں کی تعداد چون ہزار کے قریب تھی۔ یہ ساہوکار تجارت اور روپے کا لین دین بھی کرتے تھے۔ عاقبت نا اندیش مسلمان کسان، شادی بیاہ کے موقع پر قرض لیتے اور دل کھول کر روپیہ لٹاتے تھے۔ قرض کی رقم مہاجن کی بہی میں درج ہو جاتی

اور نیچے کاشت کار انگوٹھا لگا دیتا تھا ۔ حساب کتاب لنڈوں یا ہندی کے ہندسوں میں رکھا جاتا ۔ کاشت کار نہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور نہ ہی اسے حساب کتاب کی الجھنیں سمجھ میں آتی تھیں ۔ شرح سود بھی بہت زیادہ تھی ۔ شرح سود عام طور پر پچیس سے پچاس فی صد سالانہ کے درمیان ہوتی تھی ۔ جو شخص ایک دفعہ قرض لے لیتا وہ ساری زندگی ساہوکار سے چھٹکارا نہ پا سکتا ۔ انگریزی دور میں قرضے کے تمام مقدمے دیوانی عدالتوں میں جانے لگے ۔ عدالتوں کی دوری سے وکیلوں اور صلاح کاروں کی فیس اور گواہوں کے خرچ اخراجات کا دروازہ کھل گیا ۔ بھاری اور پرانے قرضوں کے عوض ساہوکار کسان کی زمین یا گھر بار کا سامان ہتھیانے لگے ۔ جھوٹے سچے بہی کھاتوں کی مدد سے ساہوکاروں نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار مسلمان کسان زمینوں سے بے دخل کر دیے گئے اور ساہوکار اراضی کے مالک بنتے چلے گئے ۔ اس صورت حال کو روکنے کے لیے ۱۹۰۱ء میں قانون میں ترمیم کی گئی ۔ لیکن وہ بھی چنداں سود مند اور موثر ثابت نہ ہوئی اور قرضے کے عوض زمین اور جائیداد قرق کرانے کا سلسلہ بند نہ ہوا ۔ بالآخر ۱۹۳۸ء کے زرعی قوانین کی رو سے ، جو پنجاب کی ایک مسلم وزارت نے منظور کیے تھے ، ظلم و ناانصافی کا یہ سیلاب تھا اور مسلمان کسانوں کی زمینیں اور جائدادیں ہندو ساہوکار کے پنجوں سے از روئے قانون محفوظ قرار دی گئیں ۔

۱۸۹۸ء میں پنجاب میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی ۔ اس کے ممبروں کی تعداد کم اور اس کے اختیارات محدود تھے ۔ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم تھی ۔ ۱۹۰۹ء کے بعد انتخاب کا طریقہ جاری کیا گیا ۔ اکثریت والے حلقوں سے کسی مسلمان کا انتخاب ناممکن تھا ۔ لائق اور محبِ وطن مسلمان امیدوار کبھی ہندو ووٹروں کی تائید حاصل نہ کر سکتا تھا ۔ ۱۹۲۲ء کے بعد

سکھوں میں اپنی علیٰحدہ قومی ہستی کا شعور پیدا ہوا اور ان کے نمایندے اپنی قوم کے لیے رعایتیں طلب کرنے لگے ۔ ان کے اکثر مطالبات بہت مبالغہ آمیز تھے ، لیکن ہندو ہر حالت میں سکھوں کی تائید کرتے تھے ۔ اس طرح ہندوؤں اور سکھوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا ۔ ہندوؤں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ مسلمانوں کی مخالفت خود نہیں بلکہ سکھوں سے کراتے تھے ۔ ہندو سکھ اتحاد کا بے دردانہ مظاہرہ ۱۹۴۷ء میں ہوا ، جب ہندوؤں اور سکھوں کی مسلح جماعتوں نے مشرقی پنجاب کے بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا ۔

سندھ :

انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں جو اعلیٰ افسر مقرر کیا اسے کمشنر کہتے تھے ۔ لیکن اسے دوسرے صوبوں کے گورنروں کے برابر اختیارات دیے گئے ۔ سندھی مسلمانوں کو بھی ، برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ، آزادی سے محرومی کے خوفناک نتائج بھگتنے پڑے ۔ وہ انگریزی حکومت اور سرکاری ملازمت دونوں سے بیزار تھے ۔ مسلمان زیادہ تر دیہات میں رہتے تھے ۔ ان کی تعلیم چند فارسی کتابوں تک محدود تھی اور پڑھے لکھے آدمیوں کی تعداد کم تھی ۔ ۱۹۰۰ء تک سارے سندھ میں صرف تین سرکاری ہائی سکول تھے ۔

سندھ میں جدید تعلیم پھیلانے کے لیے کراچی کے ایک وکیل حسن علی آفندی نے پہل کی ۔ ان کی کوششوں سے ۱۸۸۵ء میں مدرسۃ الاسلام کی بنیاد پڑی ۔ ابتدا میں یہ سکول بولٹن مارکیٹ کے نزدیک واقع تھا ۔ بعد میں اس کے لیے کراچی کی میونسپل کمیٹی سے فرئیر روڈ پر ایک کارواں سرائے کی عمارت حاصل کی گئی ۔ نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۸۸۶ء میں رکھا گیا ۔ علی گڑھ کی طرح یہاں بھی مذہبی تعلیم لازمی تھی ۔ ۱۸۹۶ء میں حسن علی آفندی کی وفات

کے بعد مدرسے کی ترقی عارضی طور پر رک گئی ۔ مشہور سندھی عالم ڈاکٹر داؤد پوتا بھی کچھ عرصہ اس مدرسے کے ساتھ وابستہ رہے ۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور کئی دوسرے نامور مسلمانوں نے یہیں تعلیم پائی ۔ غرضیکہ مدرسۃ الاسلام کی بدولت سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلی ۔ سندھ کو بمبئی سے علیٰحدہ کرنے کی تجویز ۱۹۱۶ء میں خود ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوئی ، لیکن یہ عمل میں نہ آسکی ۔ جب ۱۹۲۶ء میں یہی مطالبہ مسلمانوں نے کیا تو ہندوؤں نے سر توڑ مخالفت شروع کر دی ۔

صوبہ سرحد :

جب پنجاب میں انگریزی عمل داری قائم ہوئی تو سرحد کے اضلاع اسی صوبے میں شامل تھے ۔ ۱۹۰۱ء میں سندھ پار کے چھے ضلعوں کو پنجاب سے علیٰحدہ کرکے ایک نیا صوبہ بنایا گیا اور اس کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا ۔ اس صوبے کا نظم و نسق براہ راست مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور نظام حکومت میں بہت سی تبدیلیاں کر دیں ۔ مثلاً تحریر و تقریر کی آزادی واپس لے لی گئی ۔ کسی اخبار یا رسالے کا نکالنا قریباً ناممکن ہوگیا ۔ بعض مقامی سرداروں کو بہت اہم عدالتی اختیارات دے دیے گئے ۔ ذرائع آمد و رفت ناقص تھے ۔ انگریز حکمرانوں کی سب سے بڑی کوشش یہی تھی کہ قبائلی علاقوں کے باشندے دوسرے علاقوں کے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رکھے جائیں ۔ بعض ایسے قانون جاری کیے گئے جو نہایت بے انصافی اور ظلم پر مبنی تھے ۔

قبائلی علاقوں کا نظم و نسق پولیٹیکل ایجنٹوں کے ہاتھ میں تھا ۔ یہ عہدہ عام طور پر انگریزوں کو ملتا تھا ۔ پولیٹیکل ایجنٹ بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار افسر ہوتے تھے ۔ علاقائی زبان سیکھتے تھے اور بڑے بڑے سرداروں سے گھل مل جاتے ۔ ان کا

طریق کار ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' تھا - قبائلی ایک دوسرے کے خلاف مہینوں بلکہ برسوں جنگ کرتے رہتے تھے اور پھر انگریزوں کے ہی واسطے سے صلح کرتے - دراصل اس علاقے کے امن و امان کی کنجی پولیٹیکل ایجنٹوں کے ہاتھ میں تھی - قبائلی علاقوں کے لوگوں میں ایمانی حرارت بہت تھی - وہ غیرمسلم حکومت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے - وقتاً فوقتاً مختلف قبیلے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کر دیتے اور بڑی بے جگری سے لڑتے - جب یہ صورت پیدا ہوتی تو پولیٹیکل افسر اپنی حکمت عملی سے قبیلوں کے درمیان تفرقہ ڈلوا دیتے اور وہ اپنا جوش ایک دوسرے کے خلاف نکالتے -

تعلیمی لحاظ سے صوبہ سرحد بہت پسماندہ تھا - یہاں سکولوں کی تعداد بہت کم تھی - پشاور میں صرف دو کالج تھے - ایک کالج تو عیسائی مشنریوں نے جاری کیا تھا اور دوسرا صاحبزادہ عبدالقیوم کی کوششوں سے ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا - اسلامیہ کالج نے صوبے کے نوجوانوں میں تعلیم پھیلائی - یہ کالج ایک اقامتی درسگاہ ہے جس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور مذہبی فرائض کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے -

۱۹۰۹ء کے ایک قانون کی رو سے صوبوں کے نظام حکومت میں کچھ اصلاحات کی گئیں - منتخب مجالس قانون ساز قائم ہوئیں اور ان کو پہلے کی نسبت زیادہ اختیار دیے گئے - دس سال بعد برطانوی پارلیمنٹ نے ایک اور قانون منظور کر کے کونسلوں کے اختیارات میں مزید توسیع کی اور صوبائی حکومتوں کے بہت سے محکمے کونسلوں کی نگرانی میں دے دیے - لیکن صوبہ سرحد میں ۱۹۰۹ء کی اصلاحات جاری نہ کی گئیں - جب ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا نفاذ ہوا تو صوبہ سرحد کے لوگوں کو دوبارہ محرومی کا سامنا کرنا پڑا - انگریز یہ دلیل دیتے تھے کہ اس صوبے میں نمایندہ ادارے قائم کرنا امن عامہ


ہندوستان میں مسلم اکثریت کے صوبے
(قبل از تقسیم)
سنہ ۱۹۴۰ء
میل ۳۰۰ ۲۰۰ ۱۰۰ ۰ میل
افغانستان
جموں و کشمیر
پنجاب
بلوچستان
کوئٹہ
سندھ
کراچی
بہاولپور
دہلی
راجپوتانہ
جودھپور
اجمیر
کچھ
کاٹھیاواڑ
دیو
دمن (پرتگال)
بمبئی
نیپال
بھوٹان
آسام
بنگال
کلکتہ
برما
بہار
پٹنہ
لکھنؤ
الہ آباد
صوبجات متحدہ
ہند
بھوپال
صوبجات متوسط
ناگپور
اڑیسہ
نظام حیدر آباد
حیدرآباد
گوا (پرتگال)
مدراس
میسور
لکادیپ جزائر
انڈمان
جزائر
لنکا
بحیرۂ عرب
خلیج بنگال
بحر ہند
مسلم اکثریت کے صوبے
ہندو اکثریت کے صوبے

کے لیے خطرناک ہو گا۔ اس معاملے میں ہندو ان کے ہمنوا تھے۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت نے صوبہ سرحد میں اصلاحات جاری کرنے کے مسئلے کی چھان بین کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ کمیٹی کی رپورٹ صوبہ سرحد کے حق میں تھی، لیکن اسے نظر انداز کردیا گیا۔ چند سال کے بعد جب اسی تحقیقاتی کمیٹی کا صدر صوبے کا گورنر بنا تو مسلمانوں نے سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ پیش کیا، لیکن گورنر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ صوبے کی سات فی صد ہندو اور سکھ آبادی اصلاحات کو نا پسند کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن علاقوں میں ہندو اکثریت تھی وہاں تو لازمی طور پر ہندوؤں کی حکومت قائم ہونا تھی، لیکن جہاں ہندو تھوڑی سی اقلیت میں بھی تھے وہاں بھی انگریز ان کی رائے کو مسلمان اکثریت کی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔

نمایندہ حکومت سے پیدا ہونے والے مسائل:

۱۸۹۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے صوبائی کونسلوں میں بالواسطہ انتخاب کا طریقہ جاری کیا۔ کمیٹیوں اور کونسلوں کے انتخابات سے ایک بات واضح ہو گئی کہ یہ طریقہ مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔ ووٹ دینے کا حق تعلیم یافتہ یا صاحب جائداد شہریوں کو ملتا تھا۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی تھی اور ان کی اقتصادی حالت بھی چنداں اچھی نہ تھی، اس لیے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں بھی مسلمان ووٹروں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ انتخابات میں کوئی ہندو رائے دہندہ عام طور پر کسی مسلمان امیدوار کو ووٹ نہ دیتا تھا۔ اکا دکا منتخب ہونے والے مسلمان اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے تھے اور کمیٹیوں اور کونسلوں میں پہنچ کر ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے لگ جاتے تھے۔ طریق انتخاب کے ان اثرات کو سر سید نے اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۹۳ء میں حکومت کو

ایک یاد داشت بھیجی ، جس میں انتخاب کے طریقے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے بالآخر مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت ختم ہو جائے گی ۔ حکومت پر اس رائے کا کچھ اثر نہ ہوا لیکن مسلمانوں نے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ قومی مفاد کو محفوظ کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ کمیٹیوں اور کونسلوں کے مسلمان ممبر، صرف مسلمان ووٹروں کے ووٹ سے چنے جائیں ۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں نے ایک بہت بڑا ہنگامہ برپا کر دیا ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ تقسیم منسوخ کر دی جائے ۔ انگریزی حکومت تقسیم کی منسوخی کے خلاف تھی لیکن اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے کونسلوں میں توسیع کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی اعلان کیا کہ کونسلوں کے اختیارات بھی بڑھا دیے جائیں گے ۔

کونسلوں کے اختیارات میں مجوزہ اضافے کا مطلب یہی تھا کہ ہندوؤں کی سیاسی قوت لگاتار بڑھتی جائے ۔ چنانچہ مسلمان رہنما ، باہمی مشورے کے بعد ، یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو آغا خان کی سرکردگی میں شملہ میں گورنر جنرل کے پاس ایک وفد لے گئے ، جس کے چھتیس ممبر تھے ۔ وفد کا مطالبہ یہی تھا کہ نئی کونسلوں میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے مطابق نمایندگی دی جائے اور مسلمان نمایندوں کا چناؤ صرف مسلمان رائے دہندوں پر چھوڑ دیا جائے ۔ گورنر جنرل نے مطالبے کو غور سے سنا اور اسے منظور کرنے کا وعدہ کیا ، لیکن اس وعدے کے پورا ہونے میں بہت وقت لگا ۔ آخر کار ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ کونسلوں میں مسلمانوں کے نمایندے جداگانہ انتخابات کے ذریعے چنے جائیں ۔ اگر مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق نہ ملتا تو اندیشہ تھا کہ مسلمان، ہندوؤں میں جذب ہو کر اپنا قومی وجود کھو دیتے ۔

سوالات

۱ - بنگال کی مسلم حکومت کو ختم کرنے میں ہندوؤں اور انگریزوں کی باہمی سازشوں کا کہاں تک دخل ہے ؟ تفصیل سے بیان کیجیے -

۲ - دوامی بندوبست سے ہندوؤں کو کیا فائدہ ہوا اور مسلمانوں کو کیا کیا نقصانات اٹھانے پڑے ؟

۳ - برطانوی حکومت میں پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں کی اقتصادی بد حالی کے اسباب بیان کیجیے -

۴ - لیاقتی طرز حکومت کے قیام سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے کیا کیا مسائل پیدا ہوئے ؟

باب ۱۰

سیاسی اور مِلّی تحریکیں

انڈین نیشنل کانگرس اور مسلمان :

انگریزی تعلیم بنگال میں شروع ہوئی اور عیسائی مشنریوں نے اس کی بنیاد رکھی ۔ راجا رام موہن رائے جیسے چند ہندو رہنما انگریزی تعلیم کے طرفدار بن گئے ۔ عیسائی مشنری نہ صرف لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے بلکہ بچوں کو اپنے سکولوں میں تعلیم دے کر اور مریضوں کا علاج معالجہ کر کے بھی اپنے مذہب کی اشاعت کرتے تھے ۔ آہستہ آہستہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ۔ اُن کو حکومت کی تائید حاصل تھی ۔ جب حکومت نے سرکاری مدرسے کھولے تو ان میں بھی مشنری سکولوں سے ملتا جلتا نظام تعلیم جاری کیا گیا ۔

مسلمانوں کے زمانے میں ہندو عربی اور فارسی بہت شوق سے پڑھتے تھے ۔ انگریزوں کے عہد میں ان کی توجہ انگریزی کی طرف ہوئی ، لیکن مسلمان ، جو مشنری سکولوں سے بیزار تھے اپنے بچوں کو سرکاری مدرسوں میں نہیں بھیجتے تھے ۔ مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے کوئی عناد نہیں تھا لیکن مشنری اور سرکاری سکولوں میں نہ تو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ ہی عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی ۔ ان کے استاد عام طور پر غیر مسلم ہوا کرتے تھے ۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند تھے ، اس لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نہ تو مسلمانوں کو اپنے مذہب سے واقفیت

رہتی اور نہ ہی ان کی دنیوی اغراض پوری ہوتیں۔ انگریزی تعلیم ہندوؤں کے لیے سراسر فائدہ مند نکلی۔ انھوں نے انگریز حاکموں سے تعلقات بڑھانے اور زندگی کے ہر شعبے میں برتری حاصل کر لی۔ ہندوؤں کی تعلیمی برتری کا نتیجہ انڈین نیشنل کانگرس کی صورت میں ظاہر ہوا۔

کانگریس کا بانی ایلن ہیوم ایک سرکاری عہدے دار تھا۔ وہ اس بات سے بہت پریشان تھا کہ کسانوں اور آبادی کے دوسرے غریب طبقوں کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ لوگ جلد ہی انگریزی حکومت سے تنگ آ کر بغاوت کر دیں گے۔ وہ اس متوقع بغاوت کو روکنے کی تدبیروں پر اکثر غور کیا کرتا تھا۔ اس نے بہت سے اہل الرائے انگریزوں سے تبادلۂ خیال کیا اور آخر کار اپنی تجویز گورنر جزل ڈفرن کے سامنے رکھی۔ چنانچہ نیشنل کانگریس اسی کے مشورے سے قائم ہوئی۔

کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء کے آخر میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس میں کل اسّی مندوب شریک ہوئے جن میں صرف دو مسلمان تھے۔ ہیوم اس اجلاس پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے بار بار تقریر کی اور ہر مرتبہ انگلستان کی حکومت سے اظہار وفاداری کیا۔ کانگریس کے رہنماؤں نے انگریزوں کی قائم کی ہوئی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی، وہ حکمران قوم کے خیالات اور طور طریقوں سے آگاہ تھے۔ انگریزی ادب پر بھی انھیں عبور تھا اس لیے وہ ایسی زبان میں گفتگو کرتے تھے کہ حکمرانوں پر فوری اثر ہوتا تھا۔ ہر سال کانگریس کا اجلاس کسی بڑے شہر میں منعقد ہوتا۔ اس کے جلسوں میں صرف انگریزی دان طبقہ ہی شامل ہوتا تھا۔

جلد ہی کانگریس نے مطالبات کی ایک فہرست مرتب کرلی۔ یہ مطالبات سال بہ سال دہرائے جانے لگے، جن میں یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ یہ مطالبات برصغیر کی تمام قوموں کے متفقہ مطالبے ہیں۔

کانگریس کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ برصغیر میں برطانیہ جیسا نیابتی نظام جاری کیا جائے، یعنی برطانوی پارلیمنٹ کے نمونے پر یہاں بھی ایک پارلیمنٹ قائم کی جائے اور حکومت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ سرکاری دفتروں میں برطانوی افسروں کی تعداد کم کر کے اہل ملک کو حصہ دیا جائے اور تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ بڑے بڑے سرکاری عہدوں کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے پر کیا جائے۔

بظاہر یہ سب مطالبات معقول تھے لیکن اگر یہ مان لیے جاتے تو ہندو فائدے میں اور مسلمان گھاٹے میں رہتے۔ برطانوی نظام حکومت صرف اسی ملک میں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں مجلسی اور مذہبی اختلافات مٹ چکے ہوں۔ تعلیم عام ہو، آبادی خوشحال ہو اور لوگ مملکت کے معاملوں میں صحیح رائے دے سکتے ہوں۔ اگر سرکاری دفتروں سے برطانوی عنصر خارج کر دیا جاتا تو اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، بلکہ تمام اسامیوں پر انگریزوں کی جگہ ہندو قابض ہو جاتے اور اگر سرکاری ملازمتوں کو پر کرنے کے لیے مقابلے کا امتحان جاری کیا جاتا تو اس کا فائدہ بھی صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں کو ہی ہوتا۔ غرضیکہ کانگریس کے مطالبات میں مسلمانوں کی بھلائی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس کے مطالبات صرف ہندوؤں کے فائدے کے لیے تھے۔

ان تمام باتوں کو سر سید احمد خاں نے فوراً بھانپ لیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا۔ ان کی نصیحت کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مسلمان، بحیثیت قوم کانگریس سے بے تعلق رہے، لیکن ہندوؤں میں کانگریس بہت مقبول ہوئی۔ اس کے رہنما انگلستان آنے جانے لگے۔ انھوں نے حکمران قوم کے با اثر افراد سے دوستیاں بنائیں اور ان کو کانگریس کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ برصغیر کی تمام قومیں کانگریس کے ساتھ ہیں

اور یہ جماعت سارے ملک کا بھلا چاہتی ہے - اس قسم کی باتیں سن کر انگلستان کی پارلیمنٹ کے بعض ممبر کانگریس کے ہمدرد بن گئے - انگریزوں کی ایک مختصر سی تعداد ہر سال اس کے جلسوں میں شامل ہوتی اور بعض انگریز تو اس کے صدر بنائے جاتے تھے - کانگریسی رہنماؤں نے اپنے مطالبات کی اشاعت کے لیے اخبار بھی نکالے یہی وجہ تھی کہ حکمران طبقہ، کانگریس کے خیالات سے بہت جلد واقف ہو گیا اور اس کے مطالبات کو تقویت پہنچی - اس سے مسلمانوں کے لیے سنگین حالات پیدا ہو گئے - ان کی نہ تو کوئی اپنی سیاسی جماعت تھی اور نہ ہی اس کی پشت پر اخبار تھے - قوم میں حکومت کی بے انصافیوں کے خلاف کوئی موثر آواز نہ اٹھتی تھی - جب مسلمان اپنی شکایتیں حکمرانوں کے سامنے پیش کرتے تو ان کی بات ان سنی کر دی جاتی تھی -

اُردو ہندی کا جھگڑا :

اس کس مپرسی کا نتیجہ اس وقت ظاہر ہوا ، جب ۱۹۰۰ء میں صوبہ جات متحدہ کی حکومت نے اپنی عدالتوں میں ہندی کو اُردو کے برابر درجہ دے دیا - اس وقت ہندی محض ایک غیر ترقی یافتہ زبان تھی اور برصغیر کے بہت سے حصوں میں عام طور پر اردو ہی بولی اور سمجھی جاتی تھی - پھر بھی ہندو اس کو مٹانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے - اردو ہندی کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے چلا آ رہا تھا - سر سید احمد خاں نے اپنے زمانے میں اردو کی پر جوش حمایت کی تھی - اس وقت تو یہ فتنہ دب گیا ، لیکن ۱۹۰۰ء میں ہندوؤں کی کوشش بار آور ہوئی - مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا لیکن سرکاری فیصلہ اپنی جگہ قائم رہا -

تقسیمِ بنگال :

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال عمل میں آئی - بنگال رقبے میں وسیع اور آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا - کلکتہ کا شہر صوبائی اور

مرکزی دونوں حکومتوں کا صدر مقام تھا ۔ اس کے انتظامی مسائل بے حد پیچیدہ تھے ۔ حکومت کی ساری توجہ کلکتہ کی طرف لگی رہتی تھی ۔ صوبے کے دور دراز اور پس ماندہ علاقوں کا کوئی پُرسان حال نہ تھا ۔ مشرقی اضلاع میں خاص طور پر بدنظمی پھیلی ہوئی تھی ۔ وہاں جرائم اور جہالت زوروں پر تھے ۔ سکول تھے نہ عدالتیں ۔ بڑی بڑی زمینداریاں ہندوؤں کے ہاتھ میں تھیں ۔ مسلمان کاشت کار روٹی کے محتاج تھے ۔ انتظامی سہولت کی خاطر انگریزی حکومت نے بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا ۔ اس کے ایک حصے کا نام مغربی بنگال اور دوسرے حصے کا مشرقی بنگال اور آسام رکھا ۔ مشرقی صوبے میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی ۔ ڈھاکہ اس کا صدر مقام مقرر ہوا ۔ اس نئے صوبے کے قائم ہونے پر ہندو بھڑک اٹھے ۔ انھوں نے تقسیم بنگال کو ختم کرنے کے لیے پورا پورا زور لگایا ۔ جلسے کیے ، جلوس نکالے ، نعرے لگائے ، قانون شکنی کی ۔ بعد میں انگریز حکمرانوں کو دھمکانے کے لیے انگلستان کی بنی ہوئی اشیا کا استعمال ترک کر دیا ۔ انگریز افسروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا ۔ ہندو رہنما کھلم کھلا کہتے تھے کہ حکومت نے مشرقی بنگال کا صوبہ صرف مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے بنایا ہے اور ہم اس پر دوبارہ اقتدار قائم کر کے رہیں گے ۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات بگڑے اور سارے صوبے میں فساد ہونے لگے ۔ ہر بلوے کے بعد ہندو ، مسلمانوں پر زیادتی کا الزام لگاتے اور اپنی مظلومی کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے ۔

مسلم لیگ کا قیام :

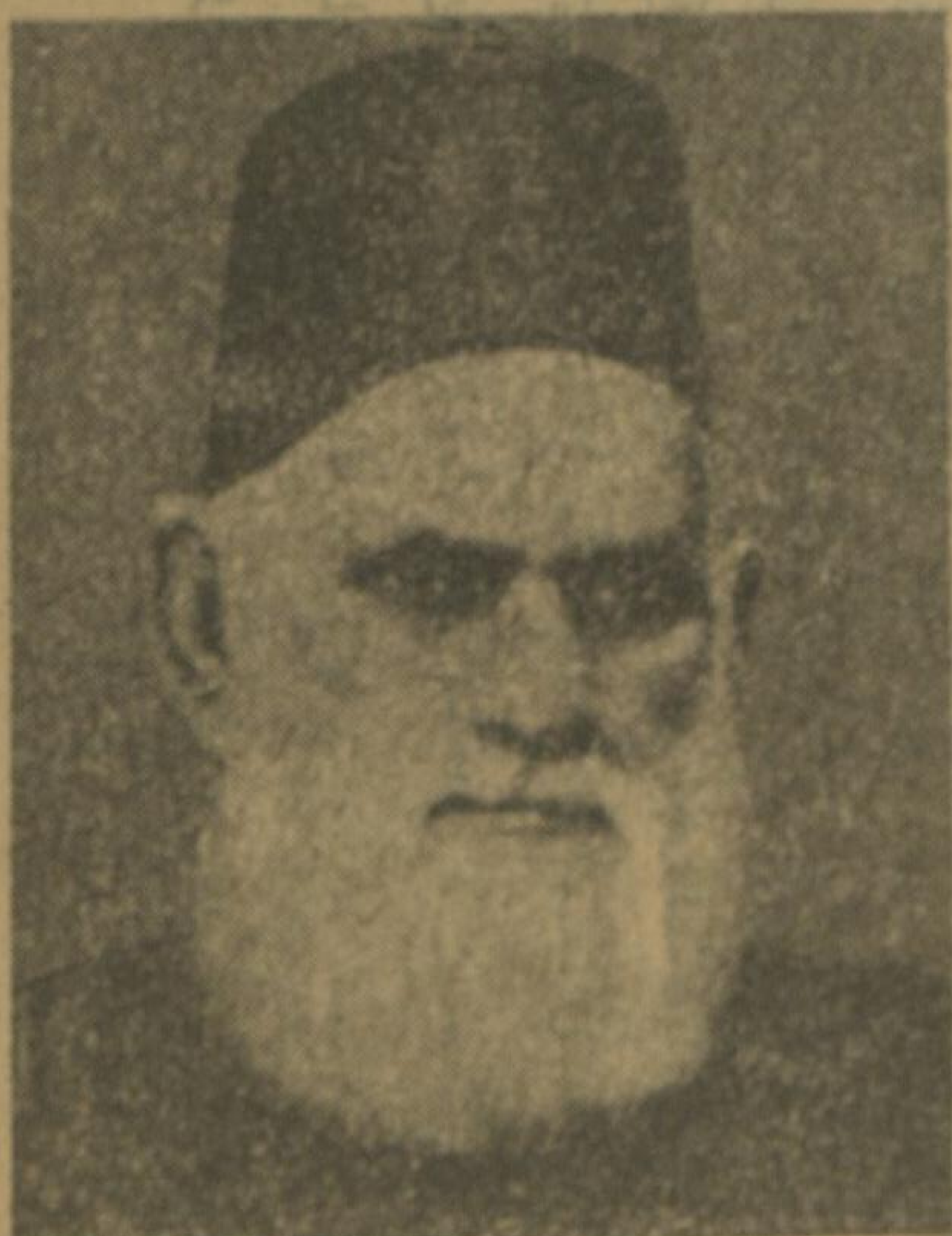
سر سید کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کی توجہ صرف تعلیم کی طرف رہی تھی ۔ وہ سیاست کے میدان سے باہر تھے اور سیاسی معاملوں میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے ۔ سر سید کی قائم کی ہوئی ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ کسی بڑے شہر میں ہوتا



نواب وقار الملک



نواب سلیم اللہ



نواب محسن الملک

تھا ۔ مسلمان دور دور سے آ کر اس میں شریک ہوتے ۔ یہیں مسلمانوں کے قومی مسائل کا جائزہ لیا جاتا اور قومی بہتری کی تجویزوں پر غور کیا جاتا ۔ ۱۹۰۶ء کے مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے اجلاس ڈھاکہ کے دوران ہی میں مسلم لیگ قائم کی گئی تھی ۔

مسلم لیگ کے بانیوں میں تین نام قابل ذکر ہیں ۔ نواب محسن الملک (مہدی علی خان) ، نواب وقارالملک (مولوی مشتاق حسین) اور نواب سلیم اللہ ۔ ان میں محسن الملک اور وقارالملک تو سر سید احمد خاں کے پرانے ساتھی تھے ۔ انھوں نے کئی سال تک سر سید احمد خاں کے تعلیمی منصوبوں میں امداد دی تھی اور ان کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھے ۔ نواب سلیم اللہ ڈھاکہ کے بہت ذی اثر رئیس تھے ۔ ان کے علاوہ سر آغا خان نے مسلم لیگ کے قیام میں بہت دلچسپی لی اور انھوں نے وفد شملہ کی قیادت بھی کی ۔

مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں مدد دے اور قوم کے حقوق کی حفاظت کرے ۔ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک لیگ میں صرف اعتدال پسند مسلمان ہی شامل رہے ، جو خاموشی سے مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کرتے رہے ۔

وفد شملہ :

انگریزی حکومت نے ۱۸۹۲ء میں ہندوستان کو کچھ اصلاحات دی تھیں ۔ ان اصلاحات کے تحت قانون بنانے والی مجالس یا کونسلیں بنائی گئیں ۔ ان کے ممبروں کا انتخاب ووٹوں کے ذریعے ہوتا تھا ۔ انتخابی حلقے میں ہندو اور مسلمان مل کر امیدوار کا انتخاب کرتے تھے ۔ لیکن ووٹ وہی شخص دے سکتا تھا ، جس کے پاس ایک خاص قیمت کی جائداد ہو ۔ چونکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کمزور تھی اس لیے مسلمانوں میں ووٹ دینے والوں کی

تعداد بہت کم تھی ۔ ایسے انتخابی حلقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی تھی وہاں بھی ان کے ووٹروں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی ۔ ہندو ووٹر اپنا ووٹ صرف ہندو امیدوار کو ہی دیتے تھے اور چونکہ ہندوؤں کا حلقوں میں اثر و رسوخ زیادہ ہوتا تھا اس لیے اکثر مسلمان امیدوار، ہندو حامیوں کی ہی امداد سے کامیاب ہوتے تھے ۔ ایسے لوگ مسلمانوں کے مفاد کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ انتخاب کے اس طریق میں مسلمانوں کا سرا سر نقصان تھا اس لیے مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مجلس قانون ساز سے ممبروں کا انتخاب ہندو اور مسلمان ووٹروں کے ملے جلے ووٹوں سے نہ کیا جائے بلکہ مسلمان ووٹر صرف مسلمان امیدوار کو ووٹ دے کر اپنا نمائندہ چنیں اور ہندو ووٹر ہندو امیدار کو ہی ووٹ دیں ۔ اس کو جداگانہ انتخاب کا طریق کہتے ہیں ۔

اب انگریزی حکومت کا ارادہ مزید اصلاحات دینے کا تھا ۔ مسلمان لیڈروں نے خیال کیا کہ اگر پرانی صورت حال رہی تو ان کی قوم کو بہت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے برصغیر کے تمام حصوں کے مسلمانوں نے مل کر ایک وفد تیار کیا، جس نے وفد شملہ کے نام سے شہرت پائی ۔ اس وفد کے سربراہ سر آغا خاں تھے ۔ یہ وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہندوستان کے گورنر جزل سے ملا اور اس کو بتایا کہ انتخاب کے موجودہ طریق میں مسلمانوں کے لیے کیا کیا نقصانات ہیں ۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ آیندہ اصلاحات میں جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا جائے یہ مطالبہ کافی جدوجہد کے بعد منظور کر لیا گیا اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے انتخابات اسی اصول کے تحت ہوئے ۔

میثاق لکھنؤ :

ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو دل سے قبول نہیں کیا تھا ۔ لیکن قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے لوگ یہ

جدوجہد کرتے تھے کہ ہندو کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اس اصول کو تسلیم کر لے ۔ آخر کار ان مسلم لیڈروں کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں اس مسئلے پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ایک سمجھوتا ہو گیا ، جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے مطابق کانگریس نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا اور اس کے بعد انتخابات اسی اصول کے تحت ہوتے رہے ۔

دنیائے اسلام :

بیسویں صدی کے شروع ہی سے دنیائے اسلام کے حالات دِگرگوں ہونے لگے تھے ۔ آئے دن کی سازشوں سے مسلم ممالک اندرونی بدنظمی کا شکار تھے ۔ بہت سے علاقے تیزی سے ان کے ہاتھوں سے نکل رہے تھے ۔ ایران میں انگریز اور روسی مل کر ملک کے حصے بخرے کر رہے تھے ۔ دونوں نے علیحدہ علیحدہ ایرانی حکومت سے بہت سی رعایتیں حاصل کر رکھی تھیں ۔ ان رعایتوں کی بدولت ملک کی آزادی خطرے میں پڑ گئی تھی ۔ ۱۹۰۷ء میں انگلستان اور روس کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا ، جس کی رو سے شمالی ایران پر روس کی اور جنوبی ایران پر انگلستان کی سیادت تسلیم کر لی گئی ۔ ان ہی دنوں روس نے مشہد مقدس پر گولہ باری کی ، جس سے برصغیر کے مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیل گئی ۔

یہی حال ترکی کا تھا ۔ جب یہاں کی مرکزی حکومت کمزور ہوئی ، تو ملکی معاملوں میں یورپی طاقتوں کا عمل دخل بڑھتا گیا ۔ کسی زمانے میں ترکوں کی سُلطنت بہت وسیع تھی جس میں جزیرہ نمائے بلقان ، دنیائے عرب اور شمالی افریقہ کے بہت سے علاقے شامل تھے ۔ جب جزیرہ نمائے بلقان پر ترکوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو یہاں کے مختلف صوبوں نے ترکوں کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں ۔ بلقان کے رہنے والے مذہباً عیسائی اور ترک

مسلمان تھے - روس ان کو بغاوت پر اکثر اکساتا رہتا تھا اور روسی حکمران ترکوں کو جزیرہ نمائے بلقان سے بے دخل کر کے خود اس پر قابض ہونا چاہتے تھے - اُس سے کئی سال پہلے ۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے مصر پر بھی قبضہ کر لیا تھا -

ترکی کے زوال سے برصغیر کے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی - وجہ یہ تھی کہ سلطان ترکی مسلم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا - برصغیر میں ہر جمعے کی نماز میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا - ترکوں کی طاقت پر جو ضرب لگتی ، اُسے یہاں کے مسلمان بہت شدت سے محسوس کرتے تھے -

جنگِ طرابلس :

شمالی افریقہ میں طرابلس (لیبیا) کا نخلستانی علاقہ ترکوں کے قبضے میں تھا اور وہاں زیادہ تر عرب آباد تھے- بہت سے غیر ملکی بھی یہاں بستے تھے جن میں اطالوی باشندے تعداد میں سب سے زیادہ تھے- ۱۸۷۰ء میں یورپ کے بڑے بڑے ملکوں نے مل کر افریقہ کے حصے بخرے کر لیے - اس تقسیم میں اٹلی کو اپنی توقع کے مطابق فائدہ نہ پہنچا ، اس لیے اٹلی کے حکمران مدت سے طرابلس پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور جنگی تیاریاں کر رہے تھے - ان تیاریوں کی تکمیل کے بعد اٹلی کی حکومت نے سلطان ترکی کو الٹی میٹم بھیجا کہ طرابلس میں رہنے والے اطالوی باشندوں کی شکایتیں رفع کرو یا لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ- ترکی حکومت اس کا جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اطالوی حکومت نے ۱۹۱۱ء میں پچاس ہزار سپاہیوں کی فوج طرابلس میں اتار دی - یہ حرکت بین الاقوامی قانون کے خلاف تھی - جنگ شروع ہوئی تو اطالوی سپاہیوں نے عربوں پر وحشیانہ مظالم ڈھائے - ان کے گھروں میں گھس کر عورتوں کی تذلیل کی اور بچوں کو نہایت بے دردی سے قتل کیا - اطالوی فوجوں کی بربریت کی ایسی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں - ترکوں نے انگریزوں

سے درخواست کی کہ انہیں مصر کے راستے اپنی فوجیں طرابلس بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ اگرچہ مصر پر انگریزوں نے ناواجب قبضہ جما رکھا تھا لیکن انگریزوں نے راستہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک سال کی جنگ کے بعد ترکوں کی مزاحمت ختم ہو گئی اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔

جنگ طرابلس نے برصغیر کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ گھر گھر میں طرابلس کے عربوں کی مظلومی اور اطالوی سپاہیوں کی دہشت گردی کا چرچا تھا۔ کلکتہ کے ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' اور لاہور کے روزنامہ ''زمیندار'' میں، جس کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان تھے، اس جنگ کی باقاعدہ رپورٹیں چھپتی تھیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی بعض نظموں میں اس جنگ کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ ایک نظم میں شاعر مشرق نے فاطمہ بنت عبداللہ کو خراج عقیدت پیش کیا، جو ایک کمسن بچی تھی اور جنگ طرابلس میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئی تھی۔

جنگ بلقان :

طرابلس کی جنگ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں چند بلقانی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ تمام ریاستیں ترکوں کی سلطنت میں شامل تھیں، لیکن ان کو اپنے اندرونی معاملات میں خود مختاری حاصل تھی۔ مغربی ممالک، اپنے مفاد کی خاطر، ان کو ترکوں سے اکثر لڑاتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء کی بغاوت ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی، جو مغربی حکومتوں کی سر پرستی میں تیار کی گئی تھی۔ بلقانی فوجوں نے مل کر ترکوں پر اچانک حملہ بول دیا۔ ترک، طرابلس کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے اور بیک وقت دو جنگیں لڑنے کے قابل نہ تھے، تاہم انھوں نے حملہ آوروں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا، لیکن ان کی دفاعی قوت جلد زائل ہو گئی اور ۱۹۱۳ء میں جزیرہ نمائے بلقان سے ترکوں

کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔

طرابلس کی جنگ سے برصغیر کے مسلمانوں میں جو ہیجان پیدا ہوا تھا ، جنگ بلقان نے اسے اور بھی شدید کر دیا ۔ یہاں کے مسلمانوں نے ترکوں کی مدد کے لیے کئی لاکھ روپیہ جمع کیا ۔ اگرچہ انگریز مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جوش سے بہت خائف تھے لیکن انھوں نے جمع کی ہوئی رقم ترکوں تک پہچانے میں مدد دی ۔ انھی دنوں مسلمانوں کے رہنماؤں نے زخمی ترک سپاہیوں کی مرہم پٹی اور خبر گیری کے لیے ایک طبی وفد بھیجنے کا انتظام کیا ۔ اس وفد کے ارکان ابتدائی طبی امداد کا بہت سا سامان ساتھ لے گئے ۔ اس وفد نے چند مہینے یورپ میں قیام کیا اور اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے ۔ واپسی پر وفد نے اپنا سارا سازو سامان ترکوں کی انجمن ہلال احمر کی نذر کر دیا ۔ ان دونوں جنگوں کے دوران برصغیر کے مسلمانوں کے قومی جذبے کو بہت تقویت پہنچی ۔ اردو ادب کے بہت سے مضمون اور نظمیں ہمیں اس دور کی یاد دلاتی ہیں ۔ ان میں آغاحشر کی مشہور نظم "شکریہ یورپ" بہت کامیاب طنز تھی ۔

جنگِ عظیم اول :

جنگ بلقان میں شکست کھانے کے بعد ترکوں کی قوت بہت گھٹ گئی اور وہ کسی نئی جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے ۔ اگست ۱۹۱۴ء میں شروع ہونے والی جنگ عظیم ، یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں ملک گیری کی ہوس اور پرانی دھڑے بندیوں کا نتیجہ تھی ۔ اگرچہ اس کی ابتدا ایک معمولی واقعہ سے ہوئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سارا یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا ۔

برصغیر کے مسلمان دل سے چاہتے تھے کہ ترک اس جنگ سے علیحدہ رہیں اور غیر جانبدار رہ کر اپنے گزشتہ نقصان کی تلافی کریں ، لیکن ۱۸۷۸ء سے ترکوں اور جرمنوں کے تعلقات بہت گہرے چلے

آ رہے تھے - نومبر ۱۹۱۴ء میں سلطان ترکی نے جرمنی کی حمایت میں برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا - برصغیر کے مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں - مقامات مقدسہ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس عرب میں واقع ہیں اور اس مقدس سر زمین کی حفاظت کا فرض بھی ترکوں کے ذمے تھا - مسلمانوں کو صاف طور پر یہ بات نظر آ رہی تھی کہ جنگ کی صورت میں برطانیہ اور فرانس، جزیرۃالعرب پر قابض ہو جائیں گے اور مقامات مقدسہ کی حرمت کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا -

انگریز حکمرانوں نے ایک اعلان کے ذریعے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اور ان کے حلیف ارض پاک پر نہ کوئی فوجی کاروائی کریں گے اور نہ عرب ملکوں کے معاملات میں دخل دیں گے ۔ اگر اتحادیوں کی نیت صاف ہوتی تو شاید مسلمان مطمئن ہو جاتے لیکن انگریزوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے جھٹ پٹ اپنی فوجیں بصرہ اور جدہ میں داخل کر دیں اور عملاً ارض مقدس کے حاکم بن گئے - شریف مکہ انگریزوں کے دام میں آ گیا اور انگریز جاسوسوں کے اکسانے پر اس نے ۱۹۱۶ء میں ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی -

برصغیر کے مسلمانوں نے شریف مکہ کے اقدام کی شدید مذمت کی - حکومت کے تشدد کے باوجود مسلمانوں کا دینی جوش اور جذبہ برابر ابھر رہا تھا - مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈروں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی کو مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بند کر دیا گیا - ان حالات میں بہت سے پُر جوش مسلمان خفیہ طور پر ملک سے باہر نکل گئے - ان میں وہ نوجوان طالب علم بھی شامل تھے، جو میدان جنگ میں پہنچ کر ترکوں کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف لڑنا چاہتے تھے - مولانا محمودالحسن صدر مدرس دارالعلوم دیو بند، حجاز اور مولانا عبیداللہ سندھی، کابل میں چلے گئے - دونوں رہنما برصغیر سے باہر رہ

کر انگریزی حکومت کے خلاف یہاں انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔

تحریکِ خلافت:

جنگ ختم ہوئی تو عثمانی سلطنت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ انگریز اور فرانسیسی مختلف حیلوں بہانوں سے جزیرہ نمائے عرب میں اپنے پاؤں جما چکے تھے۔ یورپ کے مدبر دن رات ترکوں کے خلاف زہر اگل رہے تھے، یہاں تک کہ جنگ ختم ہوتے ہی یونانی فوجیں ترکی پر پل پڑیں۔

برصغیر کے مسلمان بے بس تھے۔ انگریزی حکومت نے ان پر بہت سی پابندیاں لگا رکھی تھیں، پھر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اولوالعزمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے ایک تحریک شروع کی جو "تحریک خلافت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کی قیادت خلافت کمیٹی کے ہاتھ میں تھی جو ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے:

(ا) مقامات مقدسہ ترکوں کی حفاظت میں رہیں،

(ب) خلافت برقرار رہے اور

(ج) ترکوں کی سلطنت کی حدود وہی رہنے دی جائیں جو جنگ سے پہلے تھیں اور اس میں سے مزید علاقے نہ چھینے جائیں۔

ترک گذشتہ چار سو سال سے جزیرہ نمائے عرب پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے، لیکن ان کی حکومت محض برائے نام تھی۔ اصل اقتدار شریفِ مکہ کے ہاتھ میں تھا، جسے ترکوں کی طرف سے گراں قدر وظیفہ ملتا تھا۔ ترکی کے سلطان اپنے آپ کو حرمین شریف کا خادم کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ جنگ کے دوران عرب دنیا کا بہت بڑا حصہ بالواسطہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں چلا گیا اور ارضِ مقدس پر غیر مسلموں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ برصغیر کے مسلمان اس صورت حال سے بہت پریشان تھے، کیونکہ عربوں کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے مجبوراً مغربی

طاقتوں کا آسرا لینا پڑتا تھا - اس لیے مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ مقاماتِ مقدسہ کی سر زمین پر پہلے کی طرح ترکوں کا اقتدار برقرار رہے - لیکن ترکی کی حالت کمزور ہو چکی تھی ، لہٰذا ان مطالبات کو کوئی نہ سنتا تھا - اتحادی فتح کے نشے میں چور ، ترکی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے تھے - جنگ کے دنوں میں برطانوی سیاستدانوں نے بار بار اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جنگ کے بعد ترکوں کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے گا - جب یہ وعدے یاد دلائے جاتے تو وہ اور بھی بھڑک اٹھتے -

علی برادران :

تحریک خلافت کے دو رہنما مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان دونوں کو عام طور پر علی برادران کہا جاتا ہے - مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں پائی - وہاں سے انگلستان پہنچے اور آکسفورڈ میں داخلہ لیا - تاریخ میں سند لی اور واپس آ کر رام پور اور بڑودہ میں ملازمت کی ، لیکن ان کی طبیعت ملازمت کے لیے موزوں نہ تھی - وہ کلکتے چلے آئے اور اپنا انگریزی اخبار "کامریڈ" نکالا - یہ اخبار بلند پایہ انشاء لطیف ، مزاح اور اپنی معتدل تحریروں کی وجہ سے بہت مشہور ہوا - حکمران طبقے کے بہت سے افراد بھی اسے شوق سے پڑھتے تھے - ۱۹۱۱ء کے بعد جب ترکوں پر پے در پے مصیبتیں نازل ہوئیں تو یہ اخبار برطانوی حکومت کا نکتہ چین بن گیا - اس کے بعد مولانا محمد علی "کامریڈ" کو دہلی لے آئے اور وہیں سے اس کے ساتھ ہی ایک نیا اردو اخبار "ہمدرد" نکالا - جنگ کے دنوں میں مولانا محمد علی نظربند کر دیے گئے - مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی کے بڑے بھائی اور طالب علمی کے زمانے میں کرکٹ کے نامور کھلاڑی تھے - تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کرلی - بعد میں ملازمت چھوڑ کر قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر



مولانا شوکت علی



مولانا محمد علی

حصہ لینے لگے ۔

خلافت کمیٹی کو کوئی کامیابی نہ ہوئی کیونکہ انگریز حکمران اس کے مطالبات پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے ۔ اس لیے تجویز ہوا کہ ایک وفد انگلستان بھیجا جائے اور اس کی وساطت سے خلافت کمیٹی کے مطالبات کو براہ راست برطانوی وزرا کے سامنے پیش کیا جائے ۔ یہ وفد مولانا محمد علی ، سید سلیمان ندوی اور سید حسین پر مشتمل تھا ۔ اس کے رکن مارچ ۱۹۲۰ء میں انگلستان پہنچے ، لیکن وہاں تو سارا نقشہ ہی بگڑا ہوا تھا ۔ کوئی انگریز ترکوں کے حق میں ایک کلمہ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھا ۔ وفد نے پارلیمنٹ کے ممبروں ، سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور اہل علم ، ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹایا ، لیکن ہر جگہ سے جواب نفی میں پایا ۔ بالآخر آٹھ نو مہینے کے بعد یہ وفد ناکام واپس آیا ۔

ابھی وفد کے ارکان یورپ ہی میں تھے کہ صلح نامے کی شرائط کا اعلان ہو گیا ۔ یہ شرطیں ترکوں کے لیے حد درجہ سخت تھیں ، لیکن ترک نمایندوں نے مجبوراً ان پر دستخط کر دیے ۔ اس عہد نامے کی رو سے ترکی کے تمام بیرونی مقبوضات چھین لیے گئے ۔ استنبول بین الاقوامی شہر قرار پایا ۔ ترکوں کے بحری جہاز ضبط کر لیے گئے ۔ ان کو ہوائی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی گئی ۔ بری فوج کی تعداد کم کر دی گئی اور فوجی سکول بند کر دیے گئے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اتحادیوں کی سازش کامیاب رہی اور ترکی کوئی دن کا مہمان ہے ۔ لیکن قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ خود ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اسی مایوسی کے عالم میں انقرہ کے مقام پر نئی قومی حکومت قائم ہوئی ، جس کے سر براہ مصطفیٰ کمال پاشا تھے ۔ اس حکومت نے بہت تندہی سے ملک کو مصائب کے بھنور سے نکالا ۔ یونانیوں کے سیلاب کو روکا اور ملک کی سالمیت کو از سر نو قائم کر کے ترکی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی کامیابیوں سے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا ہوئی ۔

گاندھی اور علی برادران :

ان دنوں علی برادران ، گاندھی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے ۔ بظاہر اس ہندو رہنما میں عجز و انکسار کی خوبیاں تھیں ۔ وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور لوگوں کو نیک دلی اور بردباری کی تعلیم دیتا تھا ۔ حکومت کی زیادتیوں کے خلاف گاندھی عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے والا تھا ، جس کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑایا جائے ۔ اس موقع پر گاندھی اور علی برادران میں ایک سمجھوتا ہوا اور خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں آپس میں مل گئیں ۔ اس متحدہ قوت نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں ۔ قریب تھا کہ انگریز حکمران گھٹنے ٹیک دیں کہ ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی نے تحریک عدم تعاون کے خاتمے کا اچانک اعلان کر دیا ۔ تحریک عدم تعاون کے ختم ہونے کے ساتھ ہی خلافت کی تحریک بھی ٹھنڈی پڑ گئی ۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی کی نئی حکومت نے خلافت کو ختم کر دیا ۔ جس سے تحریک خلافت کے رہنماؤں کو بہت صدمہ پہنچا ۔

تحریکِ خلافت کے نتائج :

تحریک خلافت میں برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کے لیے عدیم النظیر قربانیاں دیں ۔ بہت سے نوجوان وطن چھوڑ گئے ، عوام نے دل کھول کر ترکوں کی مالی امداد کی ، ہنسی خوشی جیلوں میں گئے ، جرمانے بھرے ، پولیس کی لاٹھیاں کھائیں ۔ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک ترکی کی حفاظت کے لیے مسلمانوں میں ایک ایسا بے پناہ قومی جذبہ پیدا ہوا ، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ۔ اگر برصغیر کے مسلمان اتنی مصیبتیں برداشت نہ کرتے تو یونانی فوجیں اتحادی امداد کے بل بوتے پر ترکوں کو

کچل کر رکھ دیتیں ۔ اگرچہ ترکوں نے اپنی آزادی اپنی قوت بازو سے برقرار رکھی لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے اس آڑے وقت میں ان کے ساتھ جس محبت اور ہمدردی کا ثبوت دیا ، وہ اسلامی اخوت کی ایک یادگار مثال ہے ۔

تحریک خلافت سے عوام کی زندگی میں انقلاب آ گیا ۔ اپنے لباس، خوراک ، رہنے سہنے کے معاملے میں عوامی زندگی بے حد سادہ ہو گئی ۔ قوم کے لیے قربانی کا جذبہ پیدا ہوا اور عوام میں سیاسی شعور آیا ۔ تحریک خلافت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلم دنیا کی مرکزیت قائم رہے اور مسلم ممالک کے درمیان محبت اور دوستی کے رشتے استوار ہوں ۔

تحریک ہجرت :

تحریک خلافت کے دنوں میں بہت سے مسلمان علما یہ کہنے لگے چونکہ انگریزی حکومت میں ہر وقت فتنہ و فساد کے دروازے کھلے ہیں ، لہٰذا تمام سچے مسلمانوں کو چاہیے کہ یہاں سے نکل کر کسی دوسرے مسلم ملک میں آباد ہو جائیں ۔ بہت سے مخلص مسلمانوں نے اس تحریک پر لبیک کہی ۔ چنانچہ پنجاب ، سندھ اور سرحد کے صوبوں سے تقریباً اٹھارہ ہزار مسلمان اپنے وطن کو چھوڑ کر نزدیک ترین مسلم ملک افغانستان میں چلے گئے ۔ انھوں نے اپنے گھر بار اور املاک کو کوڑیوں کے مولٰ فروخت کر کے اپنا تمام اثاثہ بیل گاڑیوں میں رکھا اور درہ خیبر کی راہ لی ۔ اس میں شک نہیں کہ تمام مہاجر اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور انھوں نے صرف مذہب کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہا تھا ، لیکن افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے ، وہاں اتنے آدمی کہاں سما سکتے تھے ۔ ادھر سردیاں شروع ہو گئیں ۔ بہت سے بے وطن مہاجر بھوک اور سردی کی شدت سے مر گئے اور تحریک ہجرت ختم ہو گئی ۔

سوالات

۱ - انڈین نیشنل کانگریس کب قائم ہوئی اور اسے کس نے قائم کیا تھا؟

۲ - سرسید کیوں یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس سے الگ رہیں؟

۳ - مسلم لیگ کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا ؟ اس کے بانیوں کے نام لکھیے -

۴ - پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں سے جو وعدہ خلافیاں کیں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالیے -

۵ - تحریک خلافت پر ایک نوٹ لکھیے ، جس میں بتائیے کہ برصغیر کے لوگوں میں آزادی کا جذبہ تحریک خلافت سے پیدا ہوا -

باب ۱۱

ہندو مسلم تعلقات

تحریک خلافت نے ہی ہندوؤں میں جرأت اور ہمت کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ ہجرت اور خلافت کی تحریکیں ختم ہوئیں تو ہندو مسلم اختلافات ایک بار پھر ابھر آئے۔ اختلافات نے کشیدگی کی صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۲۱ء سے لےکر ۱۹۳۱ء تک بیسیوں فساد ہوئے۔ ابتدا ۱۹۲۰ء میں مالا بار سے ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں محرم کے موقع پر ملتان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید خون ریزی ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں کوہاٹ کے ہندوؤں کو مکمل طور پر شہر بدر ہونا پڑا کیونکہ کسی ہندو نے پیغمبر اسلام کے خلاف ایک شرانگیز نظم چھاپ کر تقسیم کی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں لاہور کے شہر میں ایک شدید فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اگلے تین سالوں میں کلکتہ اور بمبئی میں ہولناک فساد ہوئے۔ ۱۹۳۱ء والے کانپور کے فساد میں ہندوؤں نے بڑی سفاکی سے سینکڑوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ روزمرہ کے فسادات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور بھی بگڑے۔ کہیں مسلمان گائے کی قربانی کرنا چاہتے اور ہندو مزاحم ہوتے تو فساد ہو جاتا۔ کہیں ہندو عین شام کی نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے باجا بجا کر مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالتے تو بلوہ ہو جاتا۔ ان فسادات کی وجوہ کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کی چند شخصیتوں اور تحریکوں سے واقفیت ضروری ہے۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں:

۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کی۔

شردھانند جالندھر کا رہنے والا اور ابتدا میں لا مذہب تھا ۔ آریہ سماج میں شریک ہوا تو کٹر ہندو بن گیا ۔ شدھی کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کو ہندو بنا لیا جائے ۔ یہ تحریک غریب اور پس ماندہ مسلمانوں کی بستیوں میں شروع کی گئی ۔ ہندو پرچارک غریب مسلمانوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر ورغلاتے اور اپنی تقریروں میں دوسرے مذاہب کے خلاف نازیبا کلمے استعمال کرتے ۔ دوسری مسلم دشمن تحریک سنگھٹن تھی ۔ اس کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھا ، جو رہنے سہنے میں تو بہت سادہ ، لیکن عقیدے کے لحاظ سے کٹر ہندو تھا ۔ سنگھٹن کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے اندرونی جھگڑوں کو ختم کر کے ایک طاقتور قوم بنائی جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کر سکے ۔

ہندو مہاسبھا :

۱۹۲۱ء میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا قائم ہوئی ۔ اس جماعت کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھا ۔ یہ جماعت ہندو قوم کی معاشرتی اور معاشی اصلاح کے لیے وجود میں آئی تھی ، لیکن جلد ہی سیاست کے گرداب میں پھنس گئی ۔ ہندو مہاسبھا کے کارکن مسلمانوں کے ساتھ دلی عداوت رکھتے تھے اور اس کے رہنما اکثر کہتے تھے کہ مسلمان باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں ۔ ہندوستان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ ہندوستان کے مالک صرف ہندو ہیں ۔ اگر مسلمان یہاں رہنا چاہتے ہیں تو انھیں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا ۔ ہندوؤں کو چاہیے کہ سارے مسلمانوں کو ہندو بنا لیں اور جو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوں انھیں ملک سے نکال دیں ۔ غرضیکہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں اور ہندو مہاسبھا نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج اور وسیع کر دی ۔

کانگریس اور ہندو مہاسبھا :

تحریک عدم تعاون کے خاتمے پر گاندھی بغاوت کے الزام میں

گرفتار ہو کر سزا یاب ہوا ، لیکن سزا کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی ۱۹۲۴ء میں رہا کر دیا گیا۔ اب وہ بظاہر ملکی سیاست سے بے تعلق ہو کر ، احمد آباد کے نزدیک اپنے آشرم میں جا بیٹھا۔ ملک کے حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے ۔ جب کبھی گاندھی کی توجہ ہندو مسلم فسادات کی طرف دلائی جاتی تو وہ چپ سادھ لیتا اور اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا ۔ بعض مسلم رہنما گاندھی کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرے ، لیکن اس درخواست کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ ۱۹۲۶ء کے عام انتخابات میں ہندو مہاسبھا کو زبردست فتح ہوئی اور کانگریس کے امیدواروں نے تقریباً ہر جگہ شکست کھائی ۔ اس انتخاب نے کانگریس کو یہ سبق دیا کہ ہندوؤں کی تائید حاصل کرنے کے لیے ہندو مہا سبھا کے مسلک پر چلنا ضروری ہے ۔ اس طرح کانگریس محض ہندو مہاسبھا کی باندی بن کر رہ گئی ۔ آہستہ آہستہ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے عزائم میں کوئی فرق نہیں ۔ یہ دونوں ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے منصوبے باندھ رہی ہیں ۔ خود گاندھی کے خیالات میں زبردست انقلاب آ گیا تھا ۔ اس کے دل میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی ۔ وہ صاف صاف کہا کرتا تھا کہ گائے کی حفاظت کا مسئلہ اتنا ہی اہم ہے جتنا ہندوستان کی آزادی کا ۔

جمہوریت :

۱۹۱۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک نیا آئین جاری کیا جو برطانیہ کی طرف سے برصغیر میں جمہوری نظام کی طرف پہلا قدم تھا ۔ جمہوریت عوام کی حکومت ہوتی ہے اور جمہوری حکومتیں عوام کے مفاد کا خیال رکھتی ہیں ۔ اس لیے ہر جمہوری حکومت اکثریت کی رائے پر چلتی ہے اور اقلیتیں اکثریت کے فیصلوں کو

قبول کرتی ہیں ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکثریت ہمیشہ جبر سے کام لے ۔ صحیح جمہوری حکومت آبادی کے تمام طبقوں کو حکومت میں مناسب حصہ دیتی ہے اور ان میں اقتدار سے محرومی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی ، لیکن ہندوؤں کے نزدیک جمہوریت کے معنی یہ تھے کہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو کچلا جائے اور ان کی تہذیب کو مٹا دیا جائے ۔ مسلمان آبرو مندانہ زندگی بسر کرنے کے خواہاں تھے ۔ آہستہ آہستہ یہی مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ۔ چنانچہ ۱۹۲٦ء میں مسلمانوں نے حسب ذیل مطالبات پیش کیے ۔

(الف) برصغیر میں وفاق نظام حکومت قائم کیا جائے ۔ یہ طرز حکومت ایسے بڑے بڑے ملکوں میں رائج ہے جہاں طرح طرح کے لوگ آباد ہیں اور مختلف علاقوں کے مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ برصغیر کے لوگوں میں بہت سے مذہبی ، تہذیبی اور لسانی اختلافات موجود تھے ۔ اس صورت میں وفاق حکومت، وحدانی حکومت سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ۔ سندھ ، بلوچستان ، پنجاب ، صوبہ سرحد اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وفاق حکومت میں صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں ۔

(ب) مسلمانوں کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جداگانہ طریق انتخاب کو قائم رکھا جائے ۔ حکومت نے یہ مطالبہ ۱۹۰٦ء میں منظور کیا تھا ۔ ۱۹۰۹ء سے اس پر عمل درآمد شروع ہوا ۔ جداگانہ انتخاب کے رائج ہونے سے پہلے، انتخابات میں مسلمانوں کی بہت حق تلفی ہوتی تھی اس لیے مسلمان یہ چاہتے تھے کہ مجالس قانون ساز میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے ان کے صحیح نمایندے چنے جائیں ۔

(ج) سندھ کی بمبئی سے علیحدگی :

سندھ کا علاقہ ۱۸۴۳ء میں برطانوی عملداری میں شامل ہوا ۔ اس وقت پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی ۔ انگریزوں نے سندھ کو

علیحدہ صوبہ نہ بنایا ، بلکہ بمبئی کے احاطے میں شامل کر دیا ۔ بمبئی میں تجارت زوروں پر تھی ۔ تعلیم عام تھی اور لوگ خوش حال تھے ۔ اس کے برخلاف سندھ ، جہاں نوے فی صد مسلمان بستے تھے ، ایک پس ماندہ اور مفلس علاقہ تھا ۔ تعلیم کی بہت کمی تھی ، آبپاشی کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا ، ذرائع آمدورفت ناقص تھے ، کراچی سندھ کا سب سے بڑا شہر ، بمبئی سے تقریباً چھ سو میل کے فاصلے پر واقع تھا ۔ احاطۂ بمبئی میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی ۔ وہ سندھ کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کی پس ماندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا ۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے تاکہ سندھی مسلمان کے مفاد کی طرف توجہ دی جا سکے ۔

(د) سرحد میں اصلاحات کا نفاذ :

پہلے پہل صوبہ سرحد پنجاب میں شامل تھا ۔ ۱۹۰۱ء میں دریائے سندھ کے پار کے چھ اضلاع یعنی پشاور ، ہزارہ ، مردان، کوہاٹ بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کو پنجاب سے علیحدہ کر کے ایک نیا صوبہ "شمال مغربی سرحدی صوبہ" کے نام سے بنایا گیا ۔ لیکن یہاں کے باشندوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دی گئیں ۔ تحریر و تقریر کی آزادی ختم کر دی گئی ۔ بعض نئے قوانین کے ذریعے انتظامی افسروں کو وسیع اختیارات دیے گئے اور عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیے گئے ۔ اس پر عام طور پر صوبہ سرحد کو "سرزمین بے آئین" کہا جاتا تھا ۔ ۱۹۱۹ء میں دوسرے صوبوں میں تو جمہوری نظام رائج کر دیا گیا لیکن صوبہ سرحد کو جان بوجھ کر اس سے محروم رکھا گیا ۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یہاں بھی وہی نظام حکومت جاری کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں پہلے سے نافذ ہے ۔

(ہ) پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت :

پنجاب اور بنگال، برصغیر کے دو ایسے صوبے تھے جن میں مسلمانوں کو معمولی سی اکثریت حاصل تھی ۔ پنجاب میں مسلمان چھپن اور

بنگال میں چون فی صد تھے ، لیکن ان صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کو اپنی تعداد سے بہت کم نمایندگی ملتی تھی - بنگال میں ان کو چالیس فی صد اور پنجاب میں پچاس فی صد کے لگ بھگ نشستیں دی گئیں - اس لیے مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان دونوں صوبوں میں تناسب آبادی کی بنیاد پر نشستیں دی جائیں -

نہرو رپورٹ :

یہ سارے مطالبے حقائق پر مبنی تھے - مسلمان تو نہ اپنے لیے ناواجب رعایتیں مانگتے تھے اور نہ ہی دوسروں کا حق تلف کرنا چاہتے تھے ، لیکن ہندو جماعتیں ان مطالبات کو سننے کے لیے بھی تیار نہ تھیں - مخالفت کی ابتدا ہندو مہا سبھا کے رہنماؤں کی طرف سے ہوئی اور انھوں نے کانگریس کی تائید حاصل کر لی - ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے قانون دانوں کی ایک کمیٹی ، آئین کا خاکہ تیار کرنے کے لیے مقرر کی - اس کمیٹی کے صدر موتی لال نہرو تھے - اس لیے اس کی رپورٹ کو عام طور پر "نہرو رپورٹ" کہا جاتا ہے - نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے تمام مطالبات رد کر دیے - صرف صوبہ سندھ کے قیام کی گنجائش رکھی - نہرو رپورٹ کو دسمبر ۱۹۲۸ء میں سیاسی جماعتوں کے ایک اجلاس کے سامنے پیش کیا گیا - بعض مسلمان رہنما نہرو رپورٹ میں چند تبدیلیاں کرانا چاہتے تھے ، لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی - ہندو مہاسبھا نے دھاندلی سے اس رپورٹ کو منظور کرا لیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ نہرو رپورٹ ہندوستان کی تمام قوموں کا متفقہ مطالبہ ہے ، حالانکہ یہ بات غلط تھی - یہیں سے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان ایسا اختلاف پیدا ہوا جو آزادی تک قائم رہا -

چودہ نکات :

کانگریس کے رویے سے مایوس ہو کر قائداعظم نے ۱۹۲۹ء

میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا - یہاں قائداعظم نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے چودہ نکات پیش کر کے قوم کے سامنے ایک واضح اور قابلِ عمل پروگرام پیش کیا - ان نکات میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ :-

۱ - ملک کا آئین وفاق ہو -

۲ - تمام صوبوں کو یکساں حکومت خود اختیاری دی جائے -

۳ - کسی صوبہ کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے اور اقلیتوں کو مناسب نمایندگی دی جائے -

۴ - مرکزی مجلس میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو -

۵ - طریق انتخاب جدا گانہ ہو -

۶ - صوبوں کی حد بندی مسلم اکثریت کے صوبوں کو قطعاً متاثر نہ کرے -

۷ - مکمل مذہبی آزادی ہو -

۸ - کوئی ایسا مسودہ قانون نہ منظور کیا جائے جس کی مخالفت کسی ایک فرقہ کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد کرے -

۹ - سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے -

۱۰ - شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں -

۱۱ - ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے -

۱۲ - اسلامی تہذیب و تمدن اور زبان کو آئینی تحفظ دیا جائے -

۱۳ - مرکز یا صوبوں میں کوئی ایسی وزارت قائم نہ کی جائے جس میں مسلم وزرا کی تعداد ایک تہائی نہ ہو -

۱۴ - صوبوں کی مرضی کے بغیر مرکزی مجلس آئین ساز آئین میں تبدیلی کی مجاز نہ ہو گی -

ان چودہ نکات نے نہرو رپورٹ کا بھرم کھول دیا اور اس کی اہمیت کو ختم کر دیا -

علامہ اقبال :

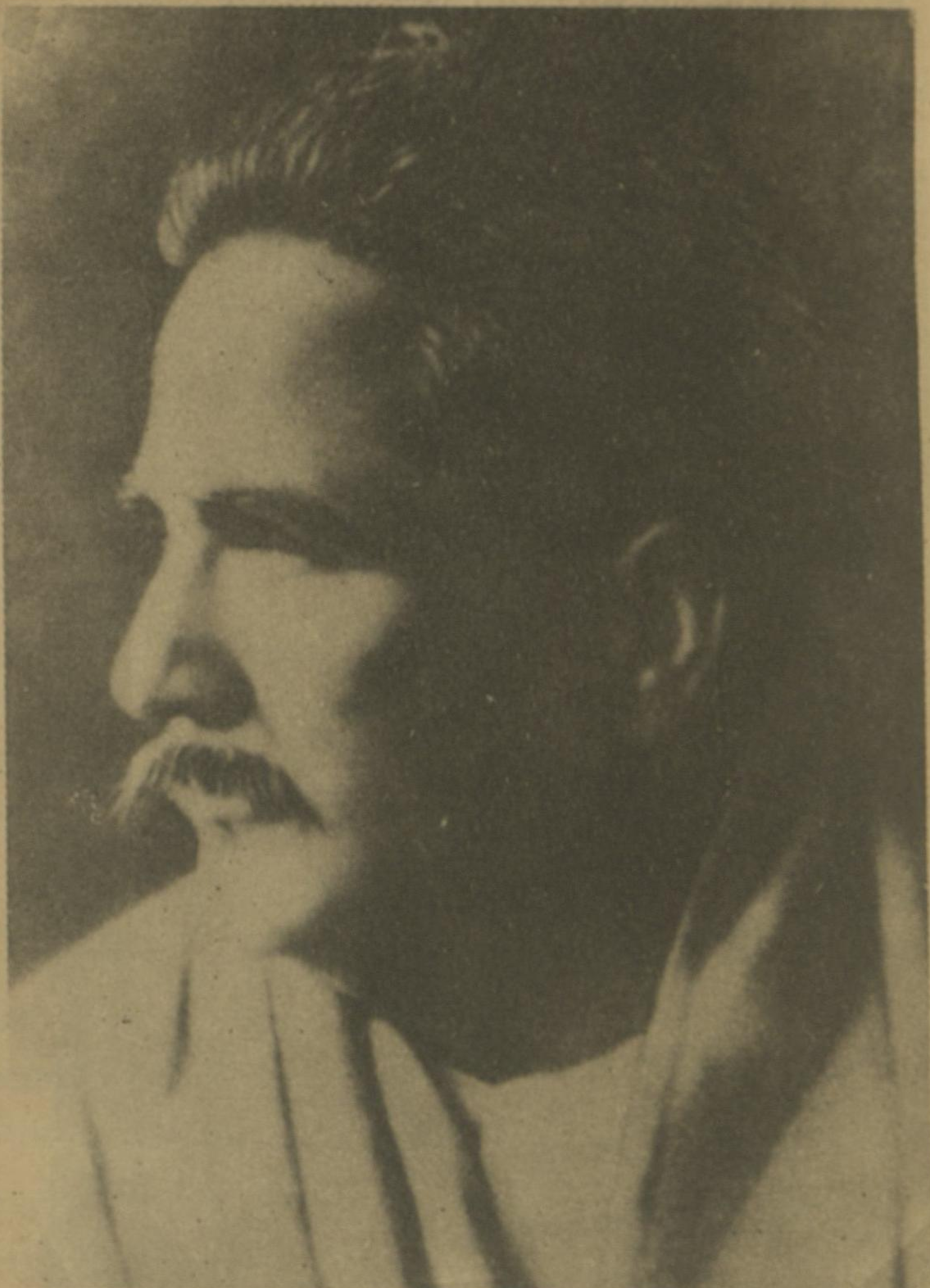
برصغیر کی جنگ آزادی میں جہاں بعض محب وطن حکمرانوں اور مجاہدین نے میدان جنگ میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں ، وہاں اہل قلم نے بھی مسلمانوں میں آزادی کی روح پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ علامہ اقبال کی نظموں نے قوم کے دل میں آزادی کی لگن لگا دی اور ان میں خود اعتمادی کا نیا جذبہ بیدار کر دیا ۔ ان کے نزدیک اسلام ایسی زندہ حقیقت ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بے پناہ قوت کا سر چشمہ ہے ، اس کے سنہری اصولوں پر چل کر وہ اپنے دست و بازو سے اپنی قسمت کی از سر نو تعمیر کر سکتے ہیں ۔ ان کا دل ، برصغیر کے مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے لیے محبت کا اتھاہ سمندر تھا ۔ ان کی ولولہ انگیز نظمیں قوم کے دل میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی تھیں ۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ترکوں سے بہت ہمدردی تھی ۔ علامہ اقبال نے جنگ طرابلس ، جنگ بلقان اور پہلی عالمی جنگ کے بعد ترکی کی کشمکش آزادی کے متعلق بڑی پر تاثیر نظمیں لکھیں ۔ شروع شروع میں علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر برصغیر میں مشترکہ حکومت قائم کر سکتے ہیں ، مگر جب ان پر ہندوؤں کے خفیہ عزائم کھلے تو اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے ۔ آخر کار اپنے اس خطبۂ صدارت میں ، جو انھوں نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ۱۹۳۰ء میں پڑھا ، انھوں نے فرمایا کہ ”ہندوستان میں جو حالات پیش آ رہے ہیں ، انھوں نے مسلمانوں کو سخت مایوس کر دیا ہے ۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان علاقوں کو جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ، ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے الگ کر کے ان کی ایک ایسی آزاد مملکت بنا دی جائے جہاں وہ نہ صرف اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر سکیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی پروان چڑھا سکیں ۔“

آج اقبال کے اردو اور فارسی کلام کی وجہ سے ان کی حیثیت شاعر پاکستان کی ہی نہیں بلکہ شاعرِ اسلام کی بھی ہے۔ ان کی نظموں کے عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور ان کا کلام مسلم ممالک میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

گول میز کانفرنس :

برصغیر کے آئینی مسائل کو طے کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے لندن میں یکے بعد دیگرے تین گول میز کانفرنسیں منعقد کیں۔ پہلی کانفرنس ۱۹۳۰ء میں، دوسری ۱۹۳۱ء میں اور تیسری ۱۹۳۲ء میں۔ پہلی کانفرنس میں کانگریس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ تاہم فضا مسلمانوں کے خلاف تھی، کیونکہ برطانیہ میں برسر اقتدار لیبر پارٹی کے رہنما کانگریس کے طرفدار تھے۔ وہ مسلمانوں پر زور دے رہے تھے کہ ہندوؤں سے سمجھوتہ کر لو، لیکن مسلمان اپنے مطالبات پر قائم رہے۔ سب سے بڑا جھگڑا یہ تھا کہ مختلف صوبوں میں بسنے والی قوموں کو قانون ساز مجالس میں کس نسبت سے نمایندگی دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر سب تصفیہ طلب امور طے ہو گئے اور صرف ایک نشست کے معاملے پر اختلاف باقی رہ گیا، لیکن ہندو نہ مانے اور فیصلہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

دوسری کانفرنس اگلے سال ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ اس میں گاندھی بھی شریک ہوا۔ اس نے انگلستان میں وارد ہوتے ہی اعلان کیا کہ میں برطانیہ سے سمجھوتہ کرنے کے لیے آیا ہوں لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ گاندھی کی موجودگی سے ہندو مسلم اختلافات اور بھی وسیع ہو گئے کیوں کہ وہ مکمل طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ اور اس کی ہندو مہاسبھا کے قبضے میں تھا۔ وہ کبھی برطانوی حکومت کو کوستا اور کبھی مسلمانوں کو الزام دیتا۔ ایک طرف تو گاندھی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ سارے ملک کا واحد نمایندہ ہے، لیکن جب مسلمانوں کے مطالبات



علامہ اقبالؒ



قائد اعظمؒ

کا ذکر آتا تو کہتا کہ میں تو کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ، البتہ میں کوشش کروں گا کہ کانگریس مسلمانوں کے مطالبات مان لے"۔ لیکن ایک موقع پر اس کے منہ سے سچی بات نکل ہی گئی ۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہندوؤں کو مسلمانوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے آمادہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنا ۔" تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے نمایندوں کی تعداد بہت کم تھی اور انھوں نے صرف آئین کی جزئیات ہی تیار کیں ۔ ان تین گول میز کانفرنسوں پر بہت وقت اور روپیہ ضائع ہوا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔

۱۹۳۵ء کا قانون :

۱۹۳۵ء میں نئے آئین کا مسودہ قانون منظور ہوا ۔ اس کی رو سے برصغیر میں وفاق طرز حکومت کی بنیاد رکھی گئی ۔ مرکزی حکومت کا ہمہ گیر اقتدار کم کر دیا گیا اور صوبائی حکومتوں کو وسیع اختیارات دیے گئے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صوبائی گورنروں کو نظم و نسق کی مشینری پر کڑی نظر رکھنے اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے خاص اختیارات دیے گئے ۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وزرا اپنے صوبے کی اقلیتوں کے ساتھ ناواجب سلوک کریں تو گورنر مداخلت کر کے وزرا کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں ۔ کانگریس اس بات پر بہت زور دے رہی تھی کہ گورنروں کے خاص اختیارات کو آئین سے حذف کر دیا جائے اور صوبائی حکومت مکمل طور پر وزرا کے تسلط میں آ جائے ۔ اس معاملے پر کانگریس اور برطانوی حکومت میں کچھ رد و کد بھی ہوئی ۔ برطانوی حکومت نے آئین میں ترمیم کرنے سے تو انکار کر دیا لیکن عملی طور پر کانگریس کا مطالبہ مان لیا ۔

کانگریسی حکومتیں :

۱۹۳۷ء میں نئے آئین کے تحت انتخابات ہوئے ۔ کانگریس کو

چھے ہندو صوبوں میں نمایاں اکثریت حاصل ہوئی ، لیکن مسلم صوبوں میں اسے کوئی کامیابی نہ ہو سکی ۔ اس سے کانگریس کا یہ دعوٰی کہ وہ برصغیر کی تمام قوموں کی نمایندہ ہے ، غلط ثابت ہو گیا ۔ ہندو اکثریت کے چھے صوبوں میں کانگریس نے وزارتیں بنائیں ۔ ان وزارتوں کے بنتے ہی کانگریسی وزیروں نے ہندو مہاسبھا کے مسلک پر کاربند ہو کر مسلمانوں کے لیے باعزت زندگی بسر کرنا ناممکن بنا دیا ۔

حصولِ اقتدار کے بعد کانگریس کے رہنماؤں نے مسلمانوں کو اپنی وزارتوں میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ وزیر بننے کے خواہش مند مسلمان اپنی پارٹی سے مستعفی ہو کر کانگریس میں شریک ہوں اور ہمارے حلف نامے پر دستخط کریں ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے سوا تمام پارٹیوں کا وجود مٹا دیا جائے ۔

کانگریسی حکومتوں نے ہندی کو قومی زبان کا درجہ دینے کے لیے اردو زبان کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر دی ۔ اُردو زبان کی سلیس اور عام فہم اصطلاحات کو ترک کر کے ہندی زبان کی بھاری بھر کم اصطلاحات رائج کر دیں ، حالانکہ بہت سے ہندو خود بھی نئی ہندی اصطلاحوں کو سمجھنے سے قاصر تھے ۔ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی ، مگر گاندھی کو اس سے سخت چڑ تھی ۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے ۔''

کانگریسی حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی ''بندے ماترم'' کے مشہور بنگالی گیت کو قومی ترانہ قرار دے دیا گیا ۔ یہ گیت ایک متعصب بنگالی مصنف کے ناول ''انند مٹھ'' سے لیا گیا تھا ۔ اس گیت کے ۳۶ مصرعوں میں سے ۲۸ مصرعے سنسکرت زبان کے ہیں ۔ اس ناول کے لفظ لفظ سے مسلم دشمنی ٹپکتی ہے ۔ بندے ماترم کے دل آزار گیت کو مسلمان قومی ترانہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۔ جھگڑے

نے طول کھینچا ۔ لیکن کانگریسی وزارتیں اپنی ضد پر قائم رہیں ۔ جب مجالس قانون ساز میں بندے ماترم کا ترانہ گایا جاتا تو مسلمان ارکان احتجاج کے طور پر ایوان سے اٹھ کر چلے جاتے ۔

گاندھی کے کہنے پر کانگریسی وزارتوں نے ایک نئی تعلیمی سکیم مرتّب کی ۔ اس سکیم کو عام طور پر ''ودیا مندر سکیم'' کہا جاتا ہے ۔ اس کو چند کانگریسی ماہرین تعلیم نے مل کر تیار کیا تھا ۔ اس کے ماتحت جو تعلیمی نصاب تیار ہوا وہ ہندوؤں کی تہذیب اور ثقافت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک عملی تدبیر تھی ۔ ودیا مندر سکیم ہندوؤں کی قومی سکیم تھی اِس سکیم کو مسلمانوں پر زبردستی ٹھونسا گیا ، اس سے مسلمانوں میں بہت تشویش پیدا ہو گئی اور یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے لیے باعزت زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں ، ناممکن ہے ۔

کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے حقوق تو ایک طرف ، ان کا وجود بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھیں ۔ انگریز گورنروں کا رویہ ناقابل فہم تھا ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی حق تلفیاں ہوتیں لیکن وہ بالکل خاموش رہتے ۔ اگر کبھی ان کی توجہ اس طرف دلائی جاتی ، تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ہم ان معاملوں سے بے تعلق ہیں ۔ حقیقت یہ تھی کہ انگریزوں اور کانگریس کا آپس میں گٹھ جوڑ ہو چکا تھا اور کانگریسی وزیر اور ان کے انگریز گورنر موقع بے موقع ایک دوسرے کی قصیدہ خوانی کرتے رہتے تھے ۔

قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کی تنظیم نو :

ان حالات میں مسلمانوں کی سیاست میں پھر حرکت پیدا ہوئی اور قومی جذبہ بیدار ہوا ۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی ۔

قائد اعظمؒ ۲۵ دسمبر ۱۸۷٦ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ۔

ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور سکول کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد قانون کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے ۔ ان ہی دنوں وہ مشہور پارسی رہنما دادا بھائی نوروجی کے سیکریٹری بنے اور اس طرح برصغیر کی سیاست سے واقف ہوئے ۔ تعلیم ختم کی تو واپس آ کر بمبئی میں وکالت کرنے لگے ۔ ۱۹۰۵ء میں کانگریس کے ممبر بنے اور اس کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے ۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن کے کہنے پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۔ اگلے سات سال وہ ان دونوں جماعتوں سے وابستہ رہے ۔ جب کانگریس نے عدم تعاون کا راستہ اختیار کیا تو قائد اعظمؒ اس سے علیحدہ ہو گئے ۔ ۱۹۲۴ء میں پھر سیاست کے میدان میں داخل ہوئے ۔ ان کی دلی کوششوں کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ ہو سکا ، بلکہ وہ کانگریس کی مسلسل ہٹ دھرمی سے مایوس ہوتے گئے ۔ ۱۹۲۸ء میں جب ایک نام نہاد کنونشن نے نہرو رپورٹ کی تصدیق کر دی تو وہ ہندو مسلم اتحاد سے ناامید ہو گئے ۔ وہ اتنے بد دل ہو گئے کہ انگلستان جا کر سکونت اختیار کر لی ، لیکن مسلمانوں کے بگڑے ہوئے حالات کی اطلاع پا کر واپس آ گئے ۔ کانگریسی وزارتوں کی زیادتیوں کے خلاف انھوں نے مسلم لیگ کو منظم کیا ۔ جب مسلم لیگ نے نئی زندگی پائی تو اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں اکتوبر ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں برصغیر کے تمام صوبوں سے مسلمان رہنما آ کر شریک ہوئے اور سب نے مل کر کانگریسی وزارتوں کے مسلک کی پر زور مذمت کی ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ، لیگ کو مسلمانوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی گئی ۔ آخر وہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت بن گئی ۔

جنگ عظیم دوم :

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی پہلے تو

انگلستان اور فرانس ایک طرف تھے اور جرمنی دوسری طرف۔ لیکن آہستہ آہستہ جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور افریقہ اور ایشیا کے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ انگریز حکمران جنگی تیاریوں کے لیے آبادی کے ہر طبقے کا تعاون چاہتے تھے۔ لیکن کانگریسی وزارتیں صرف اس شرط پر مدد دینے کو تیار تھیں کہ برصغیر کی حکومت ان کے حوالے کر دی جائے۔ انگریزوں نے یہ مطالبہ رد کر دیا۔ چنانچہ کانگریسی وزارتوں نے استعفے دے دیے۔ کانگریس کا خیال تھا کہ اس طرح حکومت کا کاروبار معطل ہو جائے گا اور انگریز مجبور ہو کر ان کے مطالبات مان لیں گے۔ لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ کانگریسی وزارتوں کے خاتمے پر مسلم لیگ نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" منایا۔

قرار داد پاکستان :

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور کے اقبال پارک (منٹو پارک) میں منعقد ہوا، جہاں ۱۹۶۶ء میں مینار پاکستان تعمیر کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت قائد اعظم نے کی۔ ان کی صدارتی تقریر کے بعد مولوی فضل الحق نے ایک نہایت اہم قرار داد پیش کی جو بعد میں "قرار داد پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کی یاد میں ہم ہر سال ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان مناتے ہیں۔ اس قرار داد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ برصغیر کے ان شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ہندوستان سے علیحدہ کر کے خود مختار حکومتیں قائم کی جائیں۔ قائد اعظمؒ نے اس قرار داد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی تہذیب اور ثقافت ہندوؤں کی تہذیب اور ثقافت سے بالکل جدا ہے۔ دونوں کی تاریخی روایات بھی مختلف ہیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ مسلمان صرف اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے

کے لیے ایک قومی وطن کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ وطن ان ہی علاقوں میں قائم ہو سکتا ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔"

قرار داد کے پاس ہوتے ہی ہندو لیڈروں اور ہندو اخباروں نے اس قرار داد کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے ان اعتراضات کی تردید کی اور بتایا کہ پاکستان اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرے گا اور اقتصادی طور پر اپنے تمام باشندوں کی حالت کو بہتر بنائے گا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی ایک کنونشن دہلی میں ہوئی، جس میں اس قرار داد کی مزید وضاحت کی گئی۔

دہلی کنونشن ۱۹۴۶ء:

برصغیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے دو علاقے تھے۔ شمال مشرق علاقے میں بنگال اور آسام اور شمال مغربی علاقے میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان۔ قرار داد پاکستان میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ شمال مغربی اور شمال مشرق علاقوں میں آزاد ریاستیں بنائی جائیں، لیکن شمال مشرق علاقے کے مسلمانوں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ دونوں علاقے اسلام کے ذریعے ایک وحدت میں منسلک ہیں۔ ان کی روحانی اور تاریخی روایات، ان کا نظریۂ حیات، ان کی اقدار، ان کی ثقافت اور ان کی آرزوئیں ایک ہیں۔ اس لیے ایک سے زیادہ ریاستوں کی بجائے پاکستان ایک واحد متحدہ اکائی ہونا چاہیے۔ مسلم لیگ کی اس کنونشن یا کانفرنس میں اس نئی قرار داد کو مسٹر سہروردی نے پیش کیا جو اس زمانے میں صوبہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے کہا چونکہ ہندو معاشرے کی بنیاد ذات پات کے نظام پر ہے اور یہ نظام قومیت، مساوات، جمہوریت اور اسلام کے تمام بلند اصولوں کے منافی ہے،

نیز چونکہ ہندو اور مسلمان کی روایات، ثقافت اور ان کا معاشرتی اور اقتصادی نظام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، جس کی وجہ سے برصغیر میں ایک ایسی ہندوستانی قوم نہیں ابھر سکتی جس کے مقاصد اور اعلیٰ اصول ایک ہوں، نیز چونکہ ہندوستان میں وہ سیاسی ادارے یا کونسلیں اور اسمبلیاں جو انگریزی حکومت کے دوران قائم ہوئیں، اکثریت کی حکومت پر مبنی ہیں، اس لیے ایسے نظام میں اکثریت اپنے فیصلوں کو اقلیت پر زبردستی ٹھونس نہیں سکتی ہے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ ان ڈھائی سال کے دوران میں ہوا جب ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبوں میں کانگریسی حکومتیں بنائی گئیں۔

اس لیے مسلم قوم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہندوؤں کی بالادستی سے تحفظ کے لیے، شمال مشرق علاقے میں بنگال اور آسام اور شمال مغربی علاقے میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد آزادانہ خود مختار ریاست قائم کی جائے اور انگریزی حکومت اس ریاست کے بنانے کا فوری طور پر اعلان کرے۔ نیز پاکستان اور ہندوستان کے لیے علیحدہ علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں بنائی جائیں۔

۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں جنگ نے بہت زور پکڑا۔ فرانس، ہالینڈ اور بلجیم یکے بعد دیگرے شکست کھا کر جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ پولینڈ پہلے سے ہی جرمنیوں اور روسیوں کے تسلط میں آ گیا تھا۔ انگلستان بے یار و مددگار تھا۔ امریکہ سے فوجی اور مالی امداد ملنے سے اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ ۱۹۴۱ء کے آخر تک روس، جاپان اور امریکہ بھی جنگ میں شامل ہو چکے تھے۔ جاپانیوں نے جنوب مشرق ایشیا کے وسیع علاقوں کو سرعت کے ساتھ مسخر کر لیا اور وہ برما کو فتح کر کے آسام تک پہنچ گئے۔ یہاں سے آگے راستہ صاف تھا۔ اگر جاپانی پیش قدمی کرتے تو غالباً برصغیر کے مشرق علاقوں پر بے روک ٹوک قبضہ کر لیتے۔ جب جنگ برصغیر کے دروازے پر پہنچ گئی، تو

کانگریسی رہنماؤں نے انگریزوں پر زور دینا شروع کیا کہ "برصغیر کی حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ ہم خود دشمن کا مقابلہ کریں گے۔"

کرپس کی تجاویز :

حکومت برطانیہ فوری طور پر تو یہ مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی، لیکن جنگ کے خاتمے پر برصغیر کو آزاد کرنے کی حامی تھی۔ یہ پیغام ایک انگریز رہنما سرسٹیفورڈ کرپس کے ہاتھ بھیجا گیا۔ یہ شخص کانگریس کا پرانا ہمدرد اور کانگریسی رہنماؤں کا دیرینہ دوست تھا۔ اس کو بھیجنے سے برطانوی حکومت، کانگریسی لیڈروں کو اپنی خیر سگالی کا یقین دلانا چاہتی تھی۔ کرپس نے آتے ہی جو اعلان کیا، اس میں برطانوی حکومت کی طرف سے جنگ کے خاتمے پر برصغیر کو آزاد کرنے کی ضمانت دی اور آزادی سے پہلے آئین کی تیاری کا کام ایک منتخب آئین ساز اسمبلی کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا۔ کرپس کے اعلان میں پاکستان کے قیام کی گنجائش اس طرح رکھی گئی تھی کہ اگر ایک یا ایک سے زیادہ صوبے مجوزہ دستور ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو قبول نہ کریں تو وہ وفاق سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں یا مل کر اپنی علیحدہ حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک اشارہ ہی تھا۔ بات کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔

برصغیر کی تقسیم کے امکان پر کانگریسی بہت سٹ پٹائے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز جنگ میں شکست کھا جائیں گے اور برطانیہ کبھی اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو گا۔ اگرچہ سرسٹیفورڈ کرپس نے کانگریس کی بہت منت سماجت کی، لیکن کانگریسیوں نے اس کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ بھی کرپس کے اعلان سے مطمئن نہ تھی۔ چونکہ پاکستان کا وعدہ مبہم اور مشروط تھا، اس لیے لیگ نے بھی کرپس تجاویز کو نامنظور کر دیا۔

"ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک :

۱۹۴۲ء میں کرپس کی واپسی کے بعد گاندھی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز ہندوستان کی حکومت ، کانگریسی لیڈروں کے سپرد کر کے اپنے ملک کو چلے جائیں ۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرار داد ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو پاس ہوئی ۔ گویا کانگریس نے برطانوی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا ۔ کانگریسی کارکنوں نے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں ، بجلی اور ٹیلیفون کے تار کاٹ ڈالے ، تھانوں پر حملے کیے ۔ سرکاری عمارتوں کو جلایا ، محاصل کی ادائیگی بند کر دی اور بعض علاقوں میں متوازی حکومتیں قائم کر لیں ۔ یہ سر گرمیاں زیادہ تر ہندو اکثریت کے صوبوں ہی میں جاری رہیں ۔ کئی مہینے بعد امن قائم ہوا ۔ اس اثنا میں بہت سے کانگریسی لیڈر بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے ۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں جنگ کے خاتمے کے آثار پیدا ہو گئے ۔ انگریز وائسرائے لارڈ ویول اپنے دل میں ، آنے والے واقعات کا نقشہ اور مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہی برصغیر کی سیاسی پارٹیوں یعنی لیگ اور کانگریس کو اپنی حکومت میں شامل کر لے ۔ چنانچہ وہ ایک لیگی لیڈر اور ایک کانگریسی لیڈر کی متفقہ تجویزوں کو اپنے ساتھ لے کر انگلستان پہنچا ۔ برطانوی حکومت سے گفت و شنید کر کے واپس لوٹا تو شملہ میں اس نے چند منتخب لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کی ۔ بعض کانگریسی لیڈروں کو کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے جیل سے رہا کر دیا گیا ۔ کانفرنس جاری تھی کہ ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی کی جنگ ختم ہو گئی ۔ کانفرنس ناکام رہی ۔ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس اپنے آپ کو برصغیر کے تمام باشندوں

کا نمایندہ ظاہر کرتی تھی ، لیکن قائد اعظمؒ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے ۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر حکومت میں نمایندہ عناصر کو شریک کرنا ہے ، تو مسلمان نمایندوں کا انتخاب لیگ پر چھوڑ دیا جائے ۔ شملہ کانفرنس کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا کہ انتخابات جلد سے جلد منعقد کرائے جائیں ۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات :

۱۹۴۶ء کے آغاز میں انتخابات ہوئے ۔ مسلم لیگ نے یہ الیکشن پاکستان کے سوال پر لڑا ۔ اس کے بر خلاف کانگریس نے برصغیر کی وحدت کا نعرہ لگایا ۔ لیگ کو شاندار کامیابی ہوئی ۔ مرکزی اسمبلی کی تیس کی تیس نشستیں مسلم لیگ کے قبضے میں آ گئیں ۔ اسی طرح بنگال میں دو تین نشستوں کو چھوڑ کر ، باقی مسلم نشستیں لیگ کو حاصل ہوئیں ۔ مسلمان اکثریت کے صوبوں میں ، صرف سرحد میں کانگریس کو معمولی سی کامیابی نصیب ہوئی ۔ مسلم لیگ کی اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود کانگریسی رہنما لیگ کی نمایندہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے ۔ انتخابات کے خاتمے پر پنجاب میں کانگریس پارٹی نے مسلمانوں کی ایک مختصر سی غیر نمایندہ ٹولی کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت مرتب کر لی ۔ سندھ میں بھی کانگریسی لیڈروں نے لیگ کو زک پہنچانے کی پوری پوری کوشش کی ، لیکن ناکام رہے ۔

وزارتی مشن :

اسی اثنا میں برطانوی حکومت نے تین وزرا کا ایک وفد نئی دہلی روانہ کیا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کرائی جا سکے ۔ اس کے ارکان نے تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ حق خود اختیاری کے بغیر مطمئن نہ ہو گی ۔ چنانچہ انھوں نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنی طرف سے آیندہ دستور کا ایک خاکہ شائع کیا اور



وزارتی مشن کے ارکان اور قائد اعظم

ایک نئی قسم کا وفاق تجویز کیا ۔ وفاق کی مروجہ صورت تو یہ ہوتی ہے کہ حکومت کے اختیارات مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیے جاتے ہیں، لیکن وزارتی وفد کا وفاق سہ گروہی وفاق تھا ۔ اس میں مرکز اور صوبوں کے درمیان گروپ تھے ۔ ہر گروپ چند صوبوں کا مجموعہ تھا ۔ پہلا گروپ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر مشتمل تھا ۔ دوسرے اور تیسرے گروہوں میں علی الترتیب مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبے یعنی پنجاب ، سرحد ، سندھ اور بلوچستان اور شمال مشرق صوبے یعنی بنگال اور آسام شامل کر دیے گئے ۔ خیال تھا کہ اس نظام حکومت میں گروہوں کی اہمیت بہت زیادہ ہو گی اور حقیقی اختیارت نہ تو مرکز کو حاصل ہوں گے اور نہ صوبوں کو ۔ وفد نے اپنی تجویز کی وضاحت نہ کی بلکہ دستور سازی اور تقسیم اختیارات کے مسائل کا فیصلہ منتخب ہونے والی دستورساز اسمبلی پر چھوڑ دیا۔ اس سکیم کا مطلب یہ تھاکہ ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے ، ہندوؤں کی حکومت کے لیے راستہ صاف کیا جائے ۔ البتہ اس بات کی گنجائش رکھ لی گئی کہ اگر کوئی گروپ چاہے تو دس سال کے عرصے کے بعد وفاق سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ وزارتی وفد کے ارکان نے تجویز کیا کہ کانگریس اور لیگ کچھ اقلیتی نمایندوں سمیت مرکزی انتظامیہ میں شامل ہوجائیں برطانوی وزیروں نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پر واضح کر دیا کہ منصوبے کے دونوں حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔ ان تجویزوں کو یا تو بحیثیت مجموعی قبول کرنا ہو گا یا پورے طور پر رد کرنا ہو گا ۔ جو پارٹی اس سکیم کو قبول کرے گی ، اسے حکومت میں شامل کر لیا جائے گا اور قبول نہ کرنے والی پارٹی کو حکومت سے باہر رکھا جائے گا ۔ دراصل یہ دھمکی صرف لیگ کے لیڈروں کو دی گئی تھی ۔

کانگریس کے رہنماؤں نے وزارتی وفد کی سکیم کے پہلے حصے یعنی دستور

ساز اسمبلی کی تجویز کو تو مان لیا لیکن عارضی حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیگ نے اس منصوبے کے دونوں حصوں کو منظور کر لیا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ وعدے کے مطابق، حکومت لیگ کے سپرد کر دی جاتی اور کانگریس کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن برطانوی حکومت کانگریس کی ہمنوا تھی۔ وفد کے ارکان اپنے وعدے سے پھر گئے۔ انھوں نے عارضی حکومت کی تجویز واپس لے لی۔

وزارتی وفد کے ارکان جون ۱۹۴۶ء میں انگلستان واپس چلے گئے۔ اسی اثنا میں دستور ساز اسمبلی منتخب ہو گئی اور اس میں پانچ انتخابی نشستوں کو چھوڑ کر باقی ماندہ تمام مسلم نشستیں لیگ نے حاصل کر لی تھیں۔ عارضی حکومت بنانے کی تجویز از سر نو زندہ ہوئی۔ ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کانگریس کے ارکان مرکزی انتظامیہ میں شامل ہو گئے۔ چند ہفتوں کے بعد لیگ کے نمایندے بھی وزارت میں شامل ہو گئے لیکن دونوں جماعتوں کے بنیادی اختلافات اس قدر گہرے تھے کہ حکومت کا کام معطل ہو گیا۔ جنگ کے دوران برطانیہ کی فوجی قوت بہت گھٹ گئی تھی۔ سرکاری ملازمین بد دل تھے۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا مل کر مطالبۂ پاکستان کی سر توڑ مخالفت کر رہی تھیں، لیکن حکومت محسوس کر رہی تھی کہ برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت نے یہاں ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیجا۔ ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی وزارتی وفد کے منصوبے کی بنیاد پر کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتا کرانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کانگریس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ پیش کر کے پاکستان کے اصول کو عملی طور پر تسلیم کر لیا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے ریڈیو پر آزادی کا، ان شرطوں پر اعلان کر دیا کہ پنجاب اور بنگال کی قانون ساز مجالس پاکستان کے اصول کی توثیق کریں۔ سندھ کی اسمبلی اس امر پر

رائے دے کہ سندھ کا صوبہ ہندوستان میں شامل ہو یا پاکستان میں۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں استصواب کیا جائے اور اگر رائے دہندوں کی اکثریت پاکستان کے حق میں رائے دے تو یہ صوبہ پاکستان میں شامل کر دیا جائے۔ بلوچستان کی شمولیت کا فیصلہ شاہی جرگے پر چھوڑ دیا جائے۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے بڑے عزم اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا اور تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ اس طرح ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آ گیا۔

دونوں ملکوں کی حد بندی کے لیے دو کمیشن مقرر کیے گئے۔ ان کمیشنوں کا مشترک صدر ایک انگریز قانون دان ریڈ کلف تھا۔ چونکہ دونوں کمیشنوں کے مسلمان اور ہندو ارکان کے درمیان بہت سے اختلافات تھے، اس لیے حد بندی کا فیصلہ ریڈ کلف کی ذاتی رائے پر ٹھہرا۔ اس نے اپنے اختیارات کو غلط طور پر استعمال کیا اور تقسیم کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کر کے مسلم اکثریت کے بعض نہایت اہم علاقے ہندوستان کے سپرد کر دیے۔ مثلاً گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا ضلع تھا لیکن یہ ہندوستان کے ساتھ ملا دیا گیا۔ فیروز پور اور جالندھر کے ضلعوں میں مسلمان آبادی کے حصے بھی پاکستان کو نہ دیے گئے۔ کلکتے کے دفاع کی خاطر دونوں ملکوں کی مشترکہ سرحد کلکتے سے پینسٹھ میل مشرق کی طرف مقرر کی گئی، لیکن لاہور کے دفاع کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا اور پاکستان اور ہندستان کی سرحد لاہور سے چودہ میل مشرق کی طرف کھینچی گئی۔ اس غیر منصفانہ حد بندی سے بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے جو اب تک حل نہیں ہو سکے۔

سوالات

۱۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں سے اردو ادب پر کیا اثر پڑا؟

۲۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان برصغیر کے مسلمانوں نے عثمانی سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے کیا جدوجہد کی؟

۳ - مولانا محمد علی کے حالات زندگی بیان کیجیے -

۴ - خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں کیوں کر متحد ہوئیں اور اس اتحاد کا کیا نتیجہ نکلا ؟

۵ - شدھی ، سنگٹھن ، ہندو مہاسبھا اور کانگریس کی تحریکوں نے ہندو مسلم تعلقات کو کیسے نقصان پہنچایا ؟

۶ - ۱۹۳۷ء میں قائم ہونے والی کانگریسی حکومتوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی یک جہتی کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کیں ؟

۷ - پاکستان کیوں کر وجود میں آیا ؟ تمام اسباب تفصیل سے بیان کیجیے -

۸ - قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی بیان کیجیے -

۹ - تحریک پاکستان میں علامہ اقبالؒ کے کردار پر روشنی ڈالیے -

باب ۱۲

پاکستان اور اس کے باشندے

پاکستان کی سیاسی اہمیت :

اگر دنیا کے نقشے میں پاکستان کے محل وقوع پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ پاکستان کرۂ ارض پر نہایت اہم جگہ پر واقع ہے۔ پاکستان کے مغرب میں افغانستان اور ایران سے شروع ہو کر مسلم ممالک کا ایک ایسا سلسلہ چلا گیا ہے جو ایشیا سے گزر کر بحراوقیانوس کے مشرقی ساحل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس میں مشرق وسطیٰ کے ممالک، سعودی عرب، خلیج فارس کی عرب ریاستیں، عراق، اردن، شام اور ترکی اور شمالی افریقہ کے مصر، لیبیا، ٹیونس، الجزائر اور مراکش شامل ہیں۔

ان کے جنوب میں افریقہ کے کئی اور مسلم ممالک بھی ہیں۔ اسی طرح ہمارے مشرق میں مسلم ممالک کا دوسرا سلسلہ ہے جو ملائیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن کے ان جنوبی جزیروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، جہاں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ ہمارے شمال میں روس کی چھے ایسی ریاستیں ہیں، جن میں مسلمان آباد ہیں۔ اسی طرح پاکستان مسلم دنیا کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ اس لیے ہم کو پوری مسلم دنیا کے ساتھ گہرا رابطہ رکھنے میں خاص سہولتیں میسر ہیں۔

چین :

پاکستان کے شمال میں چین کا ملک ہے۔ ہماری شمالی سرحد چین کے صوبہ سنکیانگ سے ملتی ہے جو پرانے زمانے سے اسلامی تہذیب

کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی آبادی آج بھی مسلمان ہے۔

چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ملک، پاکستان سے کوہ قراقرم کی قدیم تجارتی شاہراہ کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں چین کا ریشم اور دوسرا سامان تجارت اسی راستے سے پاکستان پہنچتا تھا۔ اب اس راستے کو ایک کشادہ اور پختہ شاہراہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جو بلند پہاڑوں اور شدید برف باری کے باوجود سارا سال کھلی رہتی ہے۔ اسے "شاہراہ ریشم" کہتے ہیں۔ چین کے ساتھ ہم نے سرحد کا مسئلہ بہت خوش اسلوبی سے طے کر لیا ہے۔ چین نے اس معاملے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے علاقے میں سیکڑوں میل کی چراگاہوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ چین دنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ہے اور دنیا میں ترقی پذیر ممالک کو برابر امداد دے رہا ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں میں چین ہی ایک ایسا اکیلا ملک ہے جو ترقی پذیر ملکوں کو بلا سود قرضہ دیتا ہے۔ چین نے ہمیں ۱۹۶۶ء میں ۶ کروڑ ڈالر کا بلا سود قرض دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں ہمیں مزید بیس کروڑ ڈالر بطور قرض دیے۔ حال ہی میں چین نے ہمیں ۱۱ کروڑ ڈالر بطور امداد دیے ہیں اور پرانے قرضوں سے دست بردار ہو گیا ہے۔ چین نے ہمیں ملکی دفاع اور سرحدوں کو مضبوط کرنے میں بھی بڑی امداد دی ہے۔ پاکستان میں اسلحہ سازی کا پہلا کارخانہ بھی مارچ ۱۹۷۰ء میں چین کی امداد سے قائم کیا گیا۔

چین کی موجودہ حکومت ۱۹۴۹ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔ پاکستان ان ملکوں میں سے ہے، جنھوں نے اس حکومت کو سب سے پہلے تسلیم کیا۔ اس کے بعد پاکستان، چین کو اقوام متحدہ کا ممبر بنانے کے لیے برابر کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ چین اقوام متحدہ کی اسمبلی اور سلامتی کونسل کا ممبر بن گیا۔ چین نے سیاسی میدان میں پاکستان کی ہمیشہ حمایت کی ہے اور مسئلہ کشمیر میں پاکستان کا ساتھ

دیا ہے - چین، بھارت کی جارحیت کی بھی برابر مخالفت کرتا رہا ہے - چین، اقوام متحدہ میں بھی برابر پاکستان کا ساتھ دے رہا ہے - چین اور پاکستان کے اس اتحاد نے جنوب مشرق ایشیا کے چھوٹے ملکوں میں اتحاد اور امید کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے -

پاکستان اور مسلم ممالک :

پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک مسلم مملکت کی حیثیت سے ظہور میں آیا تھا - چنانچہ قائد اعظمؒ نے شروع ہی سے مسلم ممالک سے گہرا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی - انھوں نے پاکستان کا سربراہ بنتے ہی اپنا ایک خاص نمایندہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں خیر سگالی کے دورے پر بھیجا - ۱۹۵۰ء میں مسلم ممالک کی ایک اقتصادی کانفرنس کراچی میں ہوئی ، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم ممالک میں اقتصادی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے - اس کے بعد کراچی میں مؤتمر اسلامی کا قیام عمل میں آیا ، تاکہ مسلم ممالک کے مابین تہذیبی اور ثقافتی رشتے استوار کیے جائیں -

قیام پاکستان کے وقت اکثر عرب ملکوں پر استعماری حکومتوں کا قبضہ تھا - شمالی افریقہ کے مسلم ملک فرانس کے زیر اثر تھے - جب الجیریا ، ٹیونس ، مراکش اور لیبیا نے آزادی کا علم بلند کیا تو پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر ان کی پرجوش حمایت کی - اس میں پاکستانی نمایندے پروفیسر احمد شاہ بخاری نے اقوام متحدہ میں ایسی تقریر کی جو آج بھی اقوام متحدہ کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتی ہے - جب اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں مصر، شام اور اردن پر حملہ کیا تو پورے پاکستان میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی - اس موقع پر پاکستان نے ان ملکوں کی بھی زبردست حمایت کی - صدر کی طرف سے عربوں کے لیے جنگی امدادی فنڈ کھولا گیا جس میں لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا - اس کے علاوہ دوسری قسم کی امداد بھی دی گئی - ہمارے ہاں مسلم ممالک کے سربراہ اور دوسری

شخصیتیں برابر آتی رہتی ہیں ۔ ہمارے ملک کے سربراہ بھی مسلم ممالک کا کئی دفعہ دورہ کر چکے ہیں ۔

کچھ عرصے سے اسلامی دنیا میں شدّت سے یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ انھیں بڑی طاقتوں کے سہارے چھوڑ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے اور اپنا ایک مشترکہ متحدہ محاذ بنانا چاہیے ۔ ایک ایسی دنیا میں ، جہاں بڑی طاقتیں اپنے ذاتی مفاد کے لیے چھوٹے ملکوں کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتیں ۔ چھوٹے ملکوں کو عدم تحفظ کا شدید احساس ہوتا جا رہا ہے ۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۶۹ء میں رباط کی پہلی چوٹی کی اسلامی کانفرنس ہوئی ، جس میں مسلم ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی ۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس جدہ میں ہوئی جس کے فیصلوں کی بنا پر جدّہ میں اسلامی سیکرٹریٹ کا آغاز کیا گیا ۔ حالات کا تقاضہ اس قدر شدید تھا کہ ۱۹۷۰ء ہی میں وزرائے خارجہ کی دوسری کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی ، جس میں ۲۳ مسلم ممالک نے شرکت کی ۔ اس اجلاس میں بعض اہم فیصلے کیے گئے ۔ ان میں زیادہ اہم تجارت و ترقی کے لیے بین الاقوامی اسلامی بنک اور عالمی مسلم خبر رساں ایجنسی کا قیام تھا ۔ فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں مسلم ممالک کی سربراہی کانفرنس ہوئی ۔ اس میں تقریباً ۴۰ ممالک نے شرکت کی ۔

ادارہ برائے تعاون و ترقی (آر ۔ سی ۔ ڈی) :

اقتصادی لحاظ سے دنیا آج دو حصوں میں تقسیم ہے ۔ ایک ترقی یافتہ ملک ہیں ، جہاں قدرتی دولت اور ذرائع کی فراوانی ہے اور دوسرے ترقی پذیر ملک ، جن کے قدرتی وسائل محدود ہیں اور جن کی اقتصادی حالت مخدوش ہے ۔ ترقی پذیر یا کم ترقی یافتہ ملکوں کو ترقی یافتہ ملکوں اور بڑی طاقتوں کا اکثر سہارا لینا پڑتا ہے ۔ مثلاً بھارت میں وسائل کی کمی ہے ، اس لیے اس پر آہستہ آہستہ روس کا اقتصادی اور سیاسی شکنجہ مضبوط ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ اس خطرے

سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ترقی پذیر ملک ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اسی طرح اپنی اقتصادی اور مالی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کریں - آر - سی - ڈی کا ادارہ قائم کر کے پاکستان، ایران اور ترکی نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے - اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ ان تینوں ملکوں کے وسائل کو یک جا کیا جائے اور اس اشتراک سے ایسے صنعتی، تجارتی اور دوسرے ادارے قائم کیے جائیں، جو ان ملکوں کی مشترکہ ضروریات کو پورا کر سکیں - مثلاً پاکستان نے کپڑے کے کارخانوں اور چھوٹی مشینیں بنانے میں بڑی ترقی کی ہے - اس لیے یہاں کپڑے کے کارخانوں کی مشینیں بنائی جائیں گی - ہمارے ہاں کیمیاوی کھاد تیار کرنے کے بھی بہت سے کارخانے ہیں - اس لیے پاکستان، ایران اور ترکی کے لیے یوریا کھاد مہیا کرے گا - ترکی میں المونیم کے مرکبات کے بہت قیمتی ذخیرے ہیں - ایران میں ان سے المونیم دھات تیار کی جائے گی اور پاکستان میں اس سے چادریں بنائی جائیں گی - پاکستان میں چھوٹی مشینیں اور ان کے پرزے بنانے کے بہت اچھے ماہرین موجود ہیں، اس لیے ہمارے ہاں مشینی اوزار، گھومنے والی مشینوں کے لیے بال بیرنگ، نیز ٹرکوں اور بسوں کے بہت سے پارٹ تیار کیے جائیں گے - مشترکہ منصوبوں میں سے ہمارے ہاں یوریا کھاد اور نوٹ چھاپنے کے کاغذ کے منصوبوں میں کام شروع ہو گیا ہے - کراچی میں نوٹ چھاپنے کے کاغذ کا کارخانہ کام کر رہا ہے اور یہ کاغذ ترکی اور ایران کو بھی سپلائی کیا جا رہا ہے - پاکستان نے نوٹ کا کاغذ بنانے اور نوٹ چھاپنے میں بڑی ترقی کی ہے - کئی دوسرے ملکوں کے نوٹ بھی ہمارے ہاں چھپتے ہیں -

ایران کی سب سے اہم معدنی دولت تیل اور پٹرول ہے - ایران اور پاکستان کے اشتراک سے پٹرول سے بننے والی کیمیاوی اشیاء کا ایک کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے جو آر - سی - ڈی ملکوں کی ضروریات کو

پورا کرے گا ۔ معدنیات کے قیمتی ذخائر ترکی میں ہیں ، ان میں سب سے اہم لوہا ، کوئلہ اور ٹنگسٹن کی خام دھاتیں ہیں ۔ ان معدنی سہولتوں کی وجہ سے ترکی نے ڈیزل اور ریل کے انجن بنانے کے کارخانے قائم کیے ہیں ۔ ان کی پاکستان اور ایران کو بھی بہت ضرورت ہے ۔ ترکی، پاکستان اور ایران کے ساتھ مل کر ایسے کارخانے لگائے گا جن سے بحری جہازوں کے ڈیزل انجن ، ٹریکٹر ، بلڈوزر، ٹرک اور بسیں تیار ہوں گی ۔

ان مشترکہ منصوبوں میں سے تیرہ منصوبے مکمل ہو چکے ہیں اور ان کی مصنوعات تینوں رکن ملکوں کو سپلائی کی جا رہی ہیں ۔ ان میں سے چھے کارخانے پاکستان میں کام کر رہے ہیں ۔ یہ کارخانے نوٹ چھاپنے کا کاغذ ، یوریا کھاد ، مشینی اوزار اور ٹرکوں اور موٹرکاروں کے لیے گیئر باکس تیار کر رہے ہیں ۔ ان کے علاوہ سات منصوبے ایسے بھی ہیں ، جن پر بہت تیزی سے کام جاری ہے اور ان کی مصنوعات بھی بازار میں آ رہی ہیں ۔ پاکستان میں مشینی اوزار اور کاروں کے لیے دھکا روکنے والے پارٹ (Shock absorber) تیار ہو رہے ہیں ۔ ایران میں المونیم کے کارخانے میں پیداوار شروع ہو گئی ہے ۔ نیز تینوں ملکوں میں ڈیزل انجن بنانے کے کارخانے بھی تکمیل کو پہنچ رہے ہیں ۔

آر سی ڈی ملکوں نے ہمیں ایسے کارخانوں کو بھی بڑھانے اور پھیلانے میں امداد دی ہے جو پہلے سے قائم تھے ۔ اس ادارے نے ان کارخانوں کی پیداوار کے لیے نئی منڈیاں بہم پہنچا دی ہیں ، مثلاً کراچی میں مشینی اوزاروں کے کارخانے کو توسیع دے کر اس کی پیداواری قوت کو دگنا کر دیا گیا ہے ۔ ایران اور ترکی نے ان کارخانوں سے اپنی جیپ کاروں کے لیے گیئر باکس اور دھرے خریدنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس طرح سے اس کارخانے کی پیداواری قوت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے ۔

ذرائع مواصلات :

ان ملکوں کو زیادہ نزدیک لانے کے لیے ریل، سڑک اور ہوائی سفر کے لیے نئے منصوبوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ کراچی سے انقرہ تک آر ، سی ، ڈی کی شاہراہ بنائی جارہی ہے جو تین ملکوں کے مابین سڑک کے ذریعے نقل و حرکت کو زیادہ آسان بنا دے گی۔ کراچی اور حیدر آباد کے مابین جو سپر ہائی وے یا اعلیٰ شاہراہ بنائی گئی ہے وہ بھی اسی منصوبے کا جزو ہے۔ تینوں ملکوں کو ریل کے ذریعے بھی ملایا جا رہا ہے۔ زاہدان تک پاکستانی ریل پہلے ہی سے موجود ہے۔ ادھر تہران سے کاشان تک ریل کی سروس جاری ہو چکی ہے۔ کاشان اور کرمان تک ریل کی پٹڑی بچھائی جا چکی ہے۔ وہاں سے زاہدان تک کے منصوبے کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ادھر تہران سے انقرہ تک ریل کی سروس شروع ہونے والی ہے۔ اس عظیم ریلوے کا منصوبہ مکمل ہونے پر ان تینوں ملکوں میں سیاحوں اور تجارتی مال کی نقل و حرکت کے لیے اور بھی آسانیاں ہو جائیں گی اور پاکستان کے لوگ اس راستے یورپ بھی پہنچ سکیں گے۔

تینوں ملکوں کے مابین ایک مشترکہ ہوائی سروس کے قیام پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ آر۔ سی۔ ڈی کے تینوں ملکوں نے معمولی ڈاک اور ہوائی ڈاک ، ٹیلی فون اور تار کے نرخوں کو کم کر کے ان نرخوں کے برابر کر دیا ہے جو ہر ملک میں اندرونی ڈاک کے لیے رائج ہیں۔ تینوں ملکوں کے مابین ٹرنک کال ڈائل کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ آر۔ سی۔ ڈی نے تین سالانہ تقریبوں پر ڈاک کے بڑے خوبصورت یادگاری ٹکٹ شائع کیے ہیں ، جن میں تینوں ملکوں کے مشہور تاریخی مقامات ، قدرتی مناظر اور فنون لطیفہ کی تصویریں چھاپی گئی ہیں۔ یہ ٹکٹ اپنے حسن اور خوبصورتی کے لحاظ سے ٹکٹوں کی دنیا میں مایہ ناز اضافہ ہیں۔

انڈونیشیا :

آر - سی - ڈی کی طرح ہم تجارتی اور اقتصادی میدان میں دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ بھی اشتراک کر رہے ہیں - ہم نے انڈونیشیا کے ساتھ مل کر ایک تعاونی ادارے کی بنیاد رکھی ہے ، جس کا نام ''انڈونیشیا اور پاکستان کے اقتصادی اور ثقافتی تعاون کا ادارہ'' ہے۔اس کا صدر دفتر جکارتہ میں ہے۔اس کا اعلیٰ افسر سیکریٹری جنرل کہلاتا ہے - اس ادارے کے مقاصد آر- سی - ڈی کے مقاصد سے ملتے جلتے ہیں - پاکستان نے کپڑا بننے کی صنعت میں کافی ترقی کی ہے - ادھر انڈونیشیا چونکہ جزیروں کا ملک ہے ، اس لیے ان کے ہاں جہاز سازی کے لیے کافی سہولتیں میسّر ہیں۔ دونوں ملکوں کے ماہرین نے باہمی مذاکرات کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ دونوں ملکوں میں اشتراک عمل کی ابتدا کپڑا بنانے کے کارخانے کے قیام اور چھوٹے جہازوں کے بنانے سے کی جائے - انڈونیشیا میں ماہی گیری اور ربڑ کی صنعت کو خاصی اہمیت حاصل ہے - دونوں ملکوں کے ماہرین کی رائے ہے کہ ان کاموں میں مشترکہ منصوبوں کا آغاز کیا جائے چونکہ انڈونیشیا میں معدنیات کی فراوانی ہے ، اس لیے یہ بھی خیال ہے کہ دھاتوں کی صفائی اور ڈھلائی اور چھوٹے ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے بھی لگائے جائیں گے -

ان تمام منصوبوں میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے طبعی اور انسانی وسائل کا پورا پورا استعمال کیا جائے اور اس طرح کے تعاون سے مل جل کر اقتصادی اور ثقافتی رشتوں کو اور مضبوط بنایا جائے -

دونوں ملکوں نے عام اور ہوائی ڈاک کے نرخوں کو یکساں کر دیا ہے - امید ہے کہ مستقبل قریب میں ان نرخوں کو اور بھی کم کر دیا جائے گا - دونوں ملکوں کی جہاز رانی کی کمپنیاں آپس میں مکمل تعاون کر رہی ہیں - چونکہ انڈونیشیا کو ہوائی سفر کی

سہولتوں کی زیادہ ضرورت ہے ، اس لیے ۱۹۶۹ء میں پی آئی اے نے اپنے تین سپر کونسٹی لیشن طیارے خیر سگالی اور دوستی کے طور پر انڈونیشیا کو مفت پیش کیے تھے -

دوسرے مسلم ممالک سے اشتراک :

دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ بھی اس قسم کے مشترکہ منصوبے چلانے کی کئی ایک تجاویز زیر غور ہیں - سعودی عرب سے ہمارے نہایت گہرے تعلقات ہیں - ۱۹۶۸ء میں دونوں ملکوں کی حکومتوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کی طرف سے سعودی عرب میں ایک تجارتی بنک قائم کیا جائے - اس کے ساتھ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سعودی عرب کے تعاون سے آر - سی - ڈی کی طرح ایک ادارہ قائم کیا جائے اور مشترکہ منصوبوں کو اس کے تحت چلایا جائے - سعودی عرب دنیا میں تیل پیدا کرنے والے ممالک میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے - اس وقت وہاں جو غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں وہ محض تیل نکال کر اسے عام شکل میں باہر بھیجتی ہیں - اب پاکستان اور سعودی عرب کی حکومتوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک تو مشترکہ طور پر تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کیا جائے اور دوسرے پٹرول سے مختلف کیمیائی اشیاء بنانے کے لیے پیٹرو کیمیکل (Petro Chemical) کا کارخانہ شروع کیا جائے - سعودی عرب پاکستان کے ساتھ مل کر کپڑا بنانے کا کارخانہ بھی لگا رہا ہے اور جہاز رانی کی مشترکہ کمپنی کا آغاز بھی کر رہا ہے - اسی طرح خلیج فارس کی عرب ریاستوں ، مثلاً کویت نے بھی پاکستان کے ساتھ مل کر اس قسم کے مشترکہ منصوبوں کو شروع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے - ابوظبی کی حکومت بھی پاکستان میں ملتان کے مقام پر تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ لگا رہی ہے -

افغانستان :

بھارت کے اثر کی وجہ سے افغانستان کے ساتھ ہمارے

سیاسی تعلقات میں تھوڑا بہت اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے لیکن اب ہمارے تعلقات اس کے ساتھ مزید بہتر ہونے کی توقع ہے۔ پچھلے دس سال سے ہم نے افغانستان کو جو برآمدات کی ہیں، ان کی مقدار ۱۹۷۰ء میں تقریباً تگنی ہو گئی ہے۔ ہم پاکستان میں فولاد سازی کا جو کارخانہ قائم کر رہے ہیں، اس کے لیے ہمیں افغانستان سے لوہے کی کچی دھات بھی مہیا ہو سکے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ہم افغانستان کے ساتھ مل کر کچھ اور مشترکہ منصوبے بھی چلا سکیں گے۔

ٹیکنیکل امداد اور تربیت:

ہم مسلم ممالک کو ٹیکنیکل امداد بھی دے رہے ہیں۔ ہمارے سیکڑوں ماہرین سعودی عرب، اردن، لیبیا، سومالیہ، کویت، بحرین، ابوظبی وغیرہ میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں انجینئر، مستری، ڈاکٹر وغیرہ سبھی قسم کے کارکن ہیں۔ سعودی عرب اور اردن میں ہمارے ہوا باز، ہوا بازی کی تربیت دے رہے ہیں۔ مسلم ممالک کے فوجی افسر کوئٹہ کے سٹاف کالج اور دوسرے فوجی اداروں میں تربیت پا رہے ہیں۔ ان اداروں میں افریقہ اور جنوبی ایشیا کے ملکوں کے افسر بھی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ ہم مسلم اور دوسرے ممالک کے طلبا کو اپنی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ زراعت، انجنیئرنگ، ڈاکٹری اور دوسرے فنون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ہمارے ماہرین، جن مسلم ممالک اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں جو خدمات انجام دے رہے ہیں، ان ممالک کے سربراہوں نے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مغربی افریقہ میں نائیجریا ایک مسلم ملک ہے۔ اس کے صدر جب پاکستان آئے تو انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "پاکستان کے صنعتی اور دوسرے

ماہرین نے دوسرے ملکوں میں خاص طور پر افریقہ میں اپنے اچھے کام کی وجہ سے بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔"

مسلم ممالک سے ہماری تجارت:

مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے روابط جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اس کا اندازا ان ملکوں کے ساتھ ہماری تجارت کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ مسلم دنیا کے ساتھ ہماری تجارت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم نے ۱۹۶۰ء میں مسلم دنیا کے ساتھ ۳۴ کروڑ روپیہ کے تجارتی مال کا کاروبار کیا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں یہ رقم بڑھ کر نوے کروڑ روپے کے قریب پہنچ گئی۔ گویا اس عرصے میں ہمارے باہمی تجارتی کاروبار میں کوئی اڑھائی گنا اضافہ ہوا۔ اس کاروبار کا خاص پہلو یہ ہے کہ ہم نے مسلم دنیا کے ملکوں کو جو برآمدات کی ہیں، ان میں ۴۰۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے اور ہماری درآمدات محض ۵۰ فی صد بڑھی ہیں۔ اس طرح سے ہمیں اپنی مصنوعات اور تجارتی مال کے لیے ایسی نئی منڈی مل گئی ہے جو یورپ اور امریکہ کے خریدار ملکوں سے ہمیں بے نیاز کر سکتی ہے۔

اگر ہم مسلمان ملکوں کو ایک ایک کر کے لیں تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہماری تجارت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے، مثلاً ہم نے ۱۹۶۴ء میں ترکی کو صرف ۳۰ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ہماری برآمدات ایک کروڑ دس لاکھ روپے کی مالیت کی ہو گئیں۔ ایران کو ہم نے ۱۹۶۴ء میں ایک کروڑ روپے کا مال بھیجا، مگر ۱۹۷۰ء میں اس کی مقدار بڑھ کر اڑھائی کروڑ روپیہ سے زیادہ ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء میں سعودی عرب کے لیے ہماری برآمدات کی مجموعی قیمت ساٹھ لاکھ روپے تھی۔ آج ان کی قیمت چار کروڑ روپے کے قریب ہے۔

عرب ملکوں کی مجموعی تعداد ۲۲ ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ ہماری تجارت میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ان ملکوں

کے ساتھ ہم نے ۲۳ کروڑ روپے کا کاروبار کیا۔

پاکستان کی جغرافیائی حالت :

جس طرح مصر کو دریائے نیل کا تحفہ کہا جاتا ہے ، اسی طرح پاکستان دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کا تحفہ ہے۔ یہاں کے لہلہاتے کھیت اور باغات کی شادابی ان دریاؤں کے پانیوں سے ہے۔ بلکہ علم الارض کے ماہر تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ دریا نہ ہوتے تو پاکستان کے میدان بھی نہ ہوتے۔ یہ دریا لاکھوں سال سے پہاڑوں سے مٹی لاتے رہے ہیں اور ان میدانوں میں بچھاتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس حقیقت کے آثار پائے جاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں ہمارا میدانی علاقہ سمندر کے پانی میں تھا۔ دھریالہ ضلع جہلم میں سمندری نمک کی جمی ہوئی تہیں پائی گئی ہیں۔ ایک قدیم سائنس دان البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ سمندر کے نیچے تھا۔ ہمارے دریا لاکھوں سال سے اس سمندر میں مٹی کی تہہ بچھاتے رہے اور اس میدان کو بناتے رہے۔ سندھ طاس کے بالائی میدان کو تو کئی دریاؤں نے مل کر بنایا ہے۔ لیکن اس کے زیریں میدان کو بنانا دریائے سندھ کا ہی کام تھا۔ یہاں دریا کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے اور اس کی تہہ میں مٹی کثرت سے بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے دریا کے پانی کو روکنے کے لیے دونوں طرف بند باندھے جاتے ہیں۔

پاکستان کو جغرافیائی لحاظ سے سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) شمال کا پہاڑی سلسلہ (۲) مغربی سرحد کے پہاڑ (۳) پوٹھوار کی سطح مرتفع اور کوہستان نمک (۴) دریائے سندھ کے طاس کا بالائی میدان (۵) دریائے سندھ کے طاس کا زیریں میدان۔ (۶) بلوچستان کی سطح مرتفع (۷) تھر کا صحرا۔

ہمارے شمال میں کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ ہے۔ کوہستان ہمالیہ کے پیچھے قراقرم کا کوہستانی سلسلہ ہے۔ اس کی اوسط بلندی ۲۰ ہزار فٹ

ہے اور اس کی سب سے بلند چوٹی K-2 ہے جس کی بلندی ۲۸۲۵۰ فٹ ہے ۔ نانگا پربت کی چوٹی بھی ان ہی پہاڑوں میں واقع ہے ۔ مغربی سرحد پر کوہ ہندوکش اور کوہِ سلیمان کے سلسلے ہیں ۔ کوہِ ہندوکش میں سب سے اونچی چوٹی ترچ میر کی ہے ۔ جس طرح ہمارے دریاؤں نے پاکستان کے میدان بنائے ہیں اسی طرح شمالی پہاڑوں کا بھی ہماری آب و ہوا بنانے میں بڑا حصہ ہے ۔ اگر یہ شمالی پہاڑ نہ ہوتے تو ٹنڈرا کی برفانی ہوائیں سیدھی ہمارے میدانوں تک پہنچتیں اور ہماری آب و ہوا میں شدت کی سردی پیدا کر دیتیں ۔ پھر پہاڑوں کا یہ سلسلہ خلیج بنگال سے اٹھنے والی ان ہواؤں کو روکتا ہے ، جو نمی سے لدی ہوئی آتی ہیں اور ان پہاڑوں کے دامن میں بارش برساتی ہیں ۔ ہندوکش کے کوہستانی سلسلے کی مغرب میں تین شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ ان کی وادیوں میں سوات پنج کوڑا اور چترک کنہار کے دریا بہتے ہیں ۔ دریائے سوات کی فراخ وادی ہمارے ہاں کی بہترین سیر گاہوں میں سے ہے ۔ اس کے پانی سے پن بجلی بھی تیار کی جاتی ہے ۔ دریائے کابل پر وارسک کا مشہور بجلی گھر ہے ۔ دریائے کابل کے جنوب میں درہ خیبر ہے جس کی چکر کھاتی ہوئی شاہراہ سے قوموں کے قافلے برصغیر کی سر زمین پر اترتے رہے ہیں ۔ یہ درہ جمرود سے شروع ہوتا ہے جو پشاور سے دس میل کے فاصلے پر ہے اور تورخم پر ختم ہوتا ہے ، جو افغانستان کی سرحد پر واقع ہے ۔ درہ خیبر کی کل لمبائی ۲۳ میل کے قریب ہے ۔ مغربی سرحد کے پہاڑ ان گرد باد ہواؤں کو روکتے ہیں ، جو سردیوں کے موسم میں بحیرۂ روم کے خطے سے اٹھتی ہیں ۔ ان ہواؤں کی وجہ سے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے شمال مغربی پہاڑوں میں سردیوں کے موسم میں بارش ہوتی ہے ۔ یہاں رومی آب و ہوا کے پھل پائے جاتے ہیں ۔ کوہستان نمک ضلع جہلم کے قریب سے شروع ہوتا ہے ۔ کچھ فاصلے تک تو اس کا رخ جنوب مغرب کو ہوتا ہے ۔ اس کے بعد اس کا رخ شمال مغرب کو ہو جاتا ہے اور

یہ دریائے سندھ کے پار بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے ضلعوں میں نکل جاتا ہے۔ اس میں نمک، جپسم اور کوئلے کے بڑے بڑے ذخائر ہیں۔ کھیوڑہ کی کان سے تو نمک سینکڑوں سال سے نکالا جا رہا ہے ان کانوں میں کام کرنے والوں کے خاندان، یہاں سینکڑوں سال سے کام کرتے چلے آئے ہیں۔ انھوں نے نمک کی کٹائی میں بڑی خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ کہیں خوبصورت گیلریاں اور ستون ہیں، کہیں کمرے اور کہیں نمک کے زینے بنے ہیں۔ ہمارے ہاں کا نمک سب سے اعلیٰ قسم کا ہے اور چونکہ بھارت میں کان کا نمک نہیں پایا جاتا، اس لیے سکھ لوگ جو یہاں مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے آتے ہیں، اسے تحفے کے طور پر ساتھ لے جاتے ہیں۔

کوہستان نمک کے شمال میں پوٹھوار کی سطح مرتفع ہے، جس کی بلندی ۲ ہزار فٹ ہے۔ اگر آپ کو کبھی لاہور سے راولپنڈی جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں کہ آپ کی گاڑی ایک عرصے تک تو ہرے بھرے ہموار میدانوں میں سے گزرتی جائے گی لیکن جہاں دریائے جہلم کا پل گزریں گے تو اس کے بعد گاڑی اونچای پر چڑھنے لگے گی۔ ہرے بھرے میدان دور نیچے رہ جائیں گے۔ یہاں آپ کے چاروں طرف خشک اونچی زمین ہے جس میں ہر طرف خشک جھاڑیاں ہیں۔ زمین میں ہر جانب دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی سطح کو تیزی سے بہتے ہوئے پانی نے ہر طرف کٹاؤ کر دیا ہے۔ یہ پوٹھوار کی سطح مرتفع ہے۔ اس کے معنی ہیں اونچی سطح۔ یہ نیچے کے میدانوں سے کہیں دو ہزار فٹ اونچی ہے اور کہیں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس میں کہیں کہیں پہاڑیاں بھی ہیں جو زیادہ اونچی نہیں۔ سطح مرتفع پر بارش ہوتی ہے تو زیادہ نیچائی ہونے کی وجہ سے پانی اس زور سے بہتا ہے کہ اس کی سطح میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ پانی سطح کے اوپر کی زرخیز مٹی کو بہا کر لے جاتا ہے اور زمین میں کٹاؤ پڑ جاتے ہیں۔ زمین کے اندر پانی کی نمی نہیں

رہتی اس لیے خشک اور بنجر ہو جاتی ہے۔ سوائے چھوٹی جھڑ بیریوں کے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بارش کا پانی بیکار بہہ جانے کی بجائے روک لیا جاتا تو ایسے علاقے میں جہاں پانی کی پہلے ہی کمی ہے، یہ لوگوں کے کام آتا۔ پھر اس کی وجہ سے زمین کے اندر نمی بھی رہتی اور اس کی سطح پر گھاس، پودے اُگ آتے۔ اب حکومت ایسے منصوبوں پر کام کر رہی ہے جس کے تحت سطح مرتفع میں مناسب جگہوں پر بند بنا کر پانی کو روک لیا گیا ہے اور اس پانی کو زراعت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

پوٹھوار کی سطح مرتفع کے بعد ہم نیچے میدانوں میں آتے ہیں یہ دریائے سندھ کے طاس کا میدان ہے۔ اس طاس کا بالائی میدان مٹھن کوٹ تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد اس طاس کا زیریں میدان آتا ہے اگر آپ کوٹری سے گاڑی کے ذریعے کوئٹے جائیں تو کچھ دیر تک آپ کی گاڑی میدانی علاقے میں سے گزرتی ہے، یہ زیریں میدان کا حصہ ہے۔ اس کے بعد کچھ اسی قسم کی چڑھائی آتی ہے جیسے جہلم کے پاس آئی تھی۔ یہ بلوچستان کی سطح مرتفع ہے۔ یہ سطح مرتفع پورے بلوچستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ہر طرف خشک پہاڑیاں ہیں، ان کا رخ شمال مغرب سے جنوب مغرب کو ہے۔ سطح مرتفع کو افغانستان سے توبہ کاکڑ اور چاغی کے پہاڑی سلسلے علاحدہ کرتے ہیں، اس کے وسط میں بروہی اور مکران کے پہاڑی سلسلے ہیں، مکران کا سلسلہ جنوب میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ سطح مرتفع کے شمال مغرب کے پہاڑ بہت اونچے ہیں۔ ان پر برف بھی پڑتی ہے اور سردیوں کا موسم بھی بہت شدید ہوتا ہے۔ توبہ کاکڑ کے پہاڑ کا نام ہی اس لیے پڑا کہ پرانے زمانے میں ایک مرتبہ یہاں کاکڑ قبیلہ شدید سردی میں گھر گیا تھا جہاں سے اسے 'توبہ توبہ' کر کے نجات ملی، اس لیے اس پہاڑ کا نام توبہ کاکڑ پڑ گیا۔ بلوچستان کی سطح مرتفع میں ہمیں جگہ جگہ آتش فشاں پہاڑوں کے آثار ملتے ہیں

اس آتش فشانی کی وجہ سے زمین کے نیچے کی معدنیات سطح کے قریب آگئی ہیں، اس لیے کوہ سلطان میں گندھک کے وسیع ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ اس کا شمال مغرب کا پہاڑی سلسلہ معدنیات کے لحاظ سے بہت اہم ہے، یہاں کوئلہ لوہا اور کرومائیٹ کے قیمتی ذخیرے ملتے ہیں۔ یہ پہاڑ پاکستان کی معدنی دولت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اس علاقے میں کوئٹہ اور دریائے ژوب کی وادیاں بھی ہیں۔ جو گرد باد، بحیرہ روم کے علاقے سے اٹھتے ہیں، وہ سردیوں کے موسم میں یہاں تک پہنچتے ہیں اور بارش برساتے ہیں سردیوں کی اس بارش کی وجہ سے ان وادیوں میں بحیرۂ روم کی آب و ہوا کے پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا بہترین انگور بھی یہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سردے، سیب اور انار بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں ایک ایسی معدنی دولت بھی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ہاں کے چولہے جلتے ہیں، بجلی تیار ہوتی ہے اور کیمیائی کھاد بنائی جاتی ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی سب سے قیمتی پیداوار ہے۔ یہ ہے سوئی کے مقام سے نکلنے والی قدرتی گیس۔ ہمارے ہاں کے قدرتی گیس کے میدان کا شمار دنیا کے دس بڑے گیس کے میدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف بھی اتفاق سے ہو گیا، ہمارے ہاں ماہرین معدنیات کی ایک ٹیم تیل کی تلاش کے لیے زمین میں گہرا سوراخ کر رہی تھی کہ سوئی کے مقام پر بہت زوروں سے گیس نکلی اسے آگ دکھائی گئی تو اس کا شعلہ آسمان کی خبر لانے لگا۔ آج کی دنیا میں تیل اور گیس کی قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی ہیں اور یورپ اور امریکہ جیسے امیر ممالک کو بھی ان کے فراہم کرنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس قیمتی پیداوار کا بہتر سے بہتر استعمال کریں اور اس سے زیادہ سے زیادہ کیمیائی اشیا تیار کر کے غیر ملکی زرمبادلہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

صوبہ سندھ کے جنوب مشرق حصے میں تھر کا صحرا بھی ایک

علیحدہ جغرافیائی علاقہ ہے جو آگے چل کر بھارت کے صحرائے راجپوتانہ مل جاتا ہے ۔ اس کے نشیب میں کہیں پرانے زمانے میں نمکین پانی کی جھیلیں ہوتی تھیں، اب یہ خشک ہو چکی ہیں اور اس کی سطح کے نیچے نمک کی چھ چھ فٹ موٹی تہہ جمی ہوئی پائی جاتی ہے ۔ صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے جنوب میں دریائے سندھ کا ڈیلٹا شروع ہوجاتا ہے ۔ یہاں دریا بے حد سست رفتار ہو جاتا ہے اور اس کی تہہ میں مٹی کی بڑی مقدار بیٹھنے لگتی ہے ۔ جہاں مٹی کی سطح زیادہ اونچی ہو جاتی ہے، وہاں دریا کا دھارا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح سیکڑوں سال سے دریا کا دھارا شاخوں میں تقسیم ہوتا رہا ہے اور ڈیلٹا کے علاقے میں ندی نالوں کا جال سا بچھ گیا ہے ۔ جب سمندر سے مدو جزر کی اونچی لہر آتی ہے تو یہ پورا علاقہ زیر آب ہو جاتا ہے، اس کی پوری سطح ایک دلدل ہے جس میں ہر طرف جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں ۔

آب و ہوا

آب و ہوا کے لحاظ سے پاکستان میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں دنیا کے گرم ترین مقامات بھی ہیں اور سب سے سرد جگہیں بھی ہیں ۔ جیکب آباد اور سبی کے ضلعوں میں اکثر گرمیوں میں درجہ حرارت ایک سو بیس درجے سے بھی بڑھ جاتا ہے ۔ یہاں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ایک سو چھبیس ڈگری تک جا چکا ہے ۔ شمالی پہاڑوں میں درجہ حرارت درجہ انجماد سے بھی کم رہتا ہے ۔ میدانی علاقے میں گرمیوں کے موسم میں درجہ حرارت ۱۱۰ سے ۱۱۲ ڈگری تک رہتا ہے ۔ اس زمانے میں زمین تپنے لگتی ہے اور بدن سے پسینہ چھوٹتا ہے ، لیکن ساحل کے قریبی علاقوں میں نسیم بحری چلتی ہے ۔ چونکہ یہ ہوا سمندر سے آتی ہے ، اس لیے موسم گرما کی شدت کو کم کر دیتی ہے ۔ سندھ کے صوبے میں یہ ہوا حیدر آباد تک بلکہ اس سے شمال میں آگے تک چلتی ہے ۔ اس لیے

وہاں گھروں کی چھتوں پر "ہوا گیر" لگے ہوتے ہیں - یہ ہوا گیر نسیم بحری کی رو کا رخ کمروں کے اندر کی طرف موڑ دیتے ہیں جس سے مکان ٹھنڈا رہتا ہے - سردیوں کا موسم پاکستان میں نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور اوسط درجہ حرارت چالیس سے پچاس درجے تک رہتا ہے -

پاکستان میں وہ ہوائیں بارش برساتی ہیں جو خلیج بنگال سے نمی کے ساتھ لدی ہوئی آتی ہیں اور شمالی پہاڑوں سے ٹکراتی ہیں - ان پہاڑوں کے دامن میں بارش کا سالانہ اوسط ۵۰ انچ تک ہوتا ہے - لیکن گلگت کا علاقہ جو ہمالیہ کے سلسلے کے عقب میں واقع ہے وہاں بارش کا اوسط ۶ انچ سالانہ رہ جاتا ہے -

جوں جوں جنوب کو جاتے ہیں تو ان ہواؤں کی نمی کم ہوتی جاتی ہے اور بارش کی سالانہ اوسط بھی گھٹتی جاتی ہے - عام طور پر بارش کی اوسط ۳۵ انچ سالانہ سے ۵ انچ سالانہ تک ہے - بلوچستان کے علاقے میں سب سے کم بارش ہوتی ہے -

صوبہ سرحد اور بلوچستان کے شمال مغرب کے پہاڑوں میں بارش ان گردبادوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو بحیرہ روم کے علاقے سے اٹھتے ہیں اور سردیوں کے موسم میں ان پہاڑوں سے ٹکرا کر بارش برساتے ہیں -

سردیوں کی اس بارش کی وجہ سے یہاں بحیرہ روم کے خطے کی آب و ہوا پائی جاتی ہے - اس لیے یہاں اعلیٰ قسم کے پھل مثلاً انگور سیب، ناشپاتی، سردہ وغیرہ بہت ہوتے ہیں -

چونکہ ہمارے ہاں درجہ حرارت اور سالانہ بارش کی اوسط کا اس قدر تنوع ہے، اس لیے ہمارے ہاں کی نباتات میں بھی ہر قسم کا تنوع پایا جاتا ہے -

نباتات کا تنوع

اگر ہم شمالی پہاڑوں کی نباتات کو ہی لیں تو ہمیں نباتات کے اس تنوع کا کافی اندازا ہو سکتا ہے - شمالی پہاڑوں کے علاقے کو

نباتات کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے تین ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے پھلاھی ، کاؤ ، چنار اور جنگلی زیتون کے جنگل ہیں ۔ اس سے اوپر نرم لکڑی کے سدا بہار درخت مثلاً دیودار وغیرہ ہیں ۔ پہاڑوں کی ان ڈھلانوں پر جہاں زیادہ بارش ہوتی ہے اور آب و ہوا زیادہ شدید نہیں، وہاں چوڑے پتوں کے درخت پائے جاتے ہیں ، مثلاً شاہ بلوط اور اخروٹ کے درخت ۔ پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک لمبی سوئیوں والے پائن کے درخت اور ۵ ہزار فٹ سے ۶ ہزار فٹ کی بلندی تک منطقہ معتدلہ کی آب و ہوا کی نباتات پائی جاتی ہے ، جس میں نیلے پائن کے درخت بھی شامل ہیں ۔ اس علاقے میں سدا بہار قسم کا اوک کا درخت بھی ملتا ہے ۔ ۶ ہزار فٹ کی بلندی سے ۷ ہزار فٹ تک اوک اور پائن کے علاوہ پوپلرفیر اور میپل کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔

سات ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر فر کا درخت عام ہے ۔ لیکن جوں جوں بلندی بڑھتی جاتی ہے تو سردی کی شدت کی وجہ سے یہ درخت ٹھنٹھ بن کر رہ جاتے ہیں ۔ اس لیے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے نو ہزار فٹ تک سفید چھال والا برچ کا درخت ملتا ہے ۔ نو ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر کے علاقے میں زیادہ ایلپس پہاڑ جیسی چراگاہیں ہیں جن پر پہاڑی پھول کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔ سوات اور کاغان کے علاقے اسی خطے میں شامل ہیں ۔

سرد خطوں کی اس نباتات کے علاوہ ہمارے ہاں بحیرہ روم کے خطے کی آب و ہوا بھی پائی جاتی ہے ۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے شمال مغربی پہاڑوں میں ایسے اعلیٰ قسم کے پھل پائے جاتے ہیں جو خود بحیرہ روم کے خطے میں کم ملتے ہیں ۔ ہمارے میدان کے شمالی حصوں میں جہاں بارش کم ہوتی ہے ، گرم ملکوں کی نباتات پائی جاتی ہیں ۔ بلوچستان اور مکران کی آب و ہوا صحرائی ہے اور وہاں نہایت عمدہ قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس طرح سے

آب و ہوا کی رنگا رنگی کی وجہ سے ہمارے ہاں ہر قسم کی آب و ہوا کی پیداوار موجود ہے زرعی پیداوار کے اس تنوع ہی نے ہماری اقتصادی حالت کو استحکام بخشا ہے -

پہاڑی علاقے اور سطح مرتفع کے علاوہ پاکستان کا پورا علاقہ ایک وسیع و عریض میدان ہے، جس کے شمالی حصے کی اونچائی سطح سمندر سے ۵۰۰ فٹ سے ۷۰۰ فٹ تک ہے - اس میدان میں دریاؤں پر بڑے بڑے بند بنا کر نہریں نکالی گئی ہیں - پاکستان کی نہروں کے نظام کا شمار دنیا میں انہار کے مشہور ترین نظاموں میں ہوتا ہے - ہمارے دریا اونچے پہاڑوں سے آتے ہیں - پہاڑوں کے دامن میں ان پر ڈیم تعمیر کر کے ان کے پانی کو بڑی بڑی جھیلوں میں جمع کر لیا گیا ہے جن سے پانی گرا کر لاکھوں کلو واٹ پن بجلی تیار ہو رہی ہے ، اس وجہ سے پاکستان میں نیا صنعتی انقلاب آ گیا ہے - ان میں سب سے مشہور بند منگلا ، تربیلا ، وارسک وغیرہ ہیں -

پاکستان کے میدان میں مٹی نہایت بھربھری اور زرخیز ہے - نہروں کے نظام کی مدد سے ہم اپنی زراعت کو روز بروز ترقی دے رہے ہیں - ہم برابر نئی قسم کی فصلیں تیار کر رہے ہیں اور نئی نئی اجناس کے تجربے کر رہے ہیں - ہماری زراعت آج کل مشینی دور میں سے گزر رہی ہے - پاکستان میں ۲۰ ہزار سے لے کر تیس ہزار تک ٹریکٹر اور دوسری مشینیں کام کر رہی ہیں - ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں - مصنوعی کھاد تیار کرنے کے بہت سے کارخانے لگائے جا چکے ہیں - گندم چاول اور مکی کی نئی قسموں کی کاشت سے ہم ایک حد تک غلے کے معاملے میں خود کفیل ہوتے جا رہے ہیں - ہمارے کسانوں کی محنت اور سوجھ بوجھ کی تعریف دنیا کے مشہور زرعی ماہر ڈاکٹر بارلوگ (Barlagus) نے بھی کی ہے ، جنھوں نے گندم اور چاول کی نئی قسمیں ایجاد کی ہیں - ان کے کہنے کے مطابق ”دنیا میں جو لوگ غلے

کی پیداوار کے اضافے سے ''سبز انقلاب'' لا رہے ہیں اور اس طرح ترقی پذیر ممالک جن کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، ان کی خوراک کا مسئلہ حل کرنے میں امداد دے رہے ہیں۔ ان میں پاکستانیوں کا شمار صف اول میں کیا جا سکتا ہے۔''

زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں ایک نیا صنعتی انقلاب بھی رونما ہو رہا ہے۔ کراچی سے پشاور تک ہر شہر میں کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں نظر آتی ہیں جن میں لاکھوں مزدور کام کر رہے ہیں۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں پاکستان کو صرف فوجی بھرتی اور زرعی پیداوار کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہاں کارخانے برائے نام تھے اور یہاں کی زرعی پیداوار زیادہ تر انگلستان یا بھارت میں بمبئی اور احمد آباد کے کارخانوں میں بھیجی جاتی تھی، لیکن اب ہم اپنی پیداوار کو اپنے ہی کارخانوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ شروع میں ہم زیادہ تر ملکی استعمال کی چیزیں بناتے تھے لیکن اب ہمارے کارخانے ایسی اشیا تیار کر رہے ہیں، جن کو ہم دور دور کے ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ ہمارے تجارتی مال کے لیے نئی منڈیاں کھلتی جا رہی ہیں اور ہماری صنعتی پیداوار کو بیرونی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

ہماری سیر گاہیں :

پاکستان میں سیر و تفریح کے لیے بہت اچھے مقامات ہیں۔ ہمارے ہاں دریائے سوات کی وادی یورپ کے سیاحوں کو سوئزر لینڈ کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں اسی قسم کی سرسبز اور شاداب وادیاں، پھولوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑیوں کے دامن میں ہیں۔ وادی کے بیچوں بیچ دریائے سوات کا جھاگ اٹھتا اور شور مچاتا ہوا پانی ہے۔ چاروں طرف برفانی چوٹیوں والے پہاڑ بہت دلچسپ نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اکثر ملکوں میں سیاح کے لیے ایک ہی قسم کی تفریح گاہیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کی سیرگاہوں میں آب و ہوا

کے تنوع کی وجہ سے بڑی ہمہ گیری اور رنگا رنگی ہے - سوات کی طرح گلگت کا علاقہ بھی قدرتی نظاروں سے مالا مال ہے - یہاں برفانی چوٹیوں والے اونچے اونچے پہاڑ ہیں ، جن پر قسمت آزمائی کرنے کےلیے ہر سال کوہ پیماؤں کی جماعتیں آتی ہیں - ان پہاڑوں میں K-2 کی چوٹی ہے - یہ اونچائی کے لحاظ سے دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے - اس طرح نانگا پربت کی چوٹی دنیا کی چھٹی سب سے بلند چوٹی ہے - گلگت میں گلیشر یا برف کے میدان بھی ہیں جو سردیوں کے موسم کے لیے کھیلوں کے لیے بہترین مواقع مہیا کرتے ہیں - سوئٹزر لینڈ کی طرح ہمارے ہاں اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی حسین جھیلیں ہیں جن کے قریب حکومت نے ریسٹ ہاوس بنا کر قیام و طعام کی آسانیاں فراہم کر دی ہیں - ان میں وادی کاغان کی جھیل سیف‌الملوک اور سکاردو کی ست پرا اور کچورا کی جھیلیں ہیں - جھیلوں اور ندی نالوں میں مچھلی کے شکار کے لیے بھی سہولتیں ہیں - گلگت میں سیاحوں کے لیے ایک اور تفریح پولو کا کھیل بھی ہے - یہاں پولو قدیم زمانے سے کھیلی جاتی ہے - پاکستانیوں کو اس کھیل میں خاص مہارت حاصل ہے اور اس کھیل میں ہمارے ہاں کے کھلاڑی دنیا بھر میں مشہور ہیں - بعض سیاح گلگت میں پولو کھیلنے کے لیے بھی جاتے ہیں -

ہمارے ہاں تفریح گاہوں میں پہنچنے کی بہت آسانیاں ہیں - ویسے تو گلگت کا سفر ہفتوں لیتا ہے لیکن پی - آئی - اے کے طیارے کے ذریعے سے مسافر راولپنڈی سے اڑان کرتے ہیں تو تھوڑے سے وقت میں گلگت پہنچ جاتے ہیں -

راولپنڈی سے چالیس میل کے فاصلے پر مری کا صحت افزا مقام ہے جہاں گرمیوں میں تفریح کرنے والوں کی بہت ریل پیل رہتی ہے - اس کی بلندی ۷۵۰۰ فٹ ہے - اس کے قریب گلیوں یا تنگ وادیوں میں کئی ایک اور صحت افزا مقام بھی ہیں - ان میں سے تین گلیوں کو ملا کر ایوبیہ کے نام سے ایک نیا صحت افزا مقام بنایا

گیا ہے ۔ اس سیر گاہ میں سیاحوں کے لیے قیام اور سیر و سیاحت کی سب آسانیاں موجود ہیں ۔ ان گلیوں کی پہاڑیوں کے دامن شاداب جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں اور ہر طرف پائن کے درختوں کی لپٹ آتی ہے ۔

جو لوگ زیادہ اونچے پہاڑوں کی سیر کرنا چاہتے ہیں ، ان کے لیے ہمارے ہاں کاغان کی وادی ہے ۔ اس کی بلندی ۱۳۵۸۹ فٹ تک ہے یہ وادی ۹۵ میل لمبی چلی گئی ہے ۔ نیچے گہری وادی میں دریائے کنہار چٹانوں سے ٹکراتا اور شور مچاتا بہہ رہا ہے ۔ اوپر چٹانوں کے ساتھ ساتھ ایک سڑک ہے جو آگے چل کر گلگت کو نکل جاتی ہے ۔

دنیا میں ایسی سیر گاہیں بہت کم ہیں جہاں قدرت کے دل فریب مناظر بھی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخی دلچسپی کی یادگاریں بھی ہوں ۔ ہمارے ہاں سوات کی وادی میں یہ دونوں آسانیاں موجود ہیں ۔ یہاں پر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سیاح بدھ مت کی یادگاریں ، ان کی پرانی خانقاہیں اور ان قلعوں اور شہروں کے آثار دیکھ سکتا ہے جن کے خلاف سکندر اعظم نے جنگیں لڑی تھیں ۔

ایسے سیاحوں کے لیے جنھیں جنگلی جانوروں اور پرندوں سے دلچسپی ہو ہمارے ہاں بہت مواقع ہیں ۔ پاکستان کے جنگلوں میں بعض ایسے جانور پائے جاتے ہیں جو دوسری جگہ کم ملتے ہیں ۔ ان میں مار خور بکرا ، اڑیال ، گورال ، اور نیلی بھیڑیں ، کہیں کہیں چیتے ، بھورے ریچھ اور ہمالیہ کے سیاہ ریچھ بھی ملتے ہیں ۔ جنوبی علاقوں میں ہرن اور نیلے بھی پائے جاتے ہیں ۔

سوالات

۱ ۔ ایشیا میں پاکستان کے محل وقوع کی اہمیت پر نوٹ لکھیے ۔

۲ ۔ پاکستان کے مسلم ممالک سے جو سیاسی اور تجارتی تعلقات ہیں ان کو وضاحت سے بیان کیجیے ۔

۳ ۔ آر ۔ سی ۔ ڈی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ؟ مشترکہ مفاد کے لیے اس ادارے نے جو کام کیے ہیں ان پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے ۔

باب ۱۳

پاکستان کے لوگ

پاکستان کے علاقوں کے لوگ ہزاروں سال سے اپنی بہادری ، جواں مردی اور جرأت کے لیے مشہور چلے آتے ہیں - وہ ہمیشہ سے سپاہیانہ عزم اور حوصلہ مندی کی زندہ مثال رہے ہیں - سکندر اعظم ایک دنیا کو فتح کرتا چلا گیا لیکن جب اسے ان علاقوں کے جوانوں سے سابقہ پڑا تو اسے ایک ایک قلعہ فتح کرنے میں مہینوں لگ گئے -

موریہ خاندان کا بانی چندر گپت موریا یہاں ہی کی فوج کی امداد ہی سے برصغیر میں پہلی عظیم سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا - انگریز اس علاقے کو برصغیر کے بازوئے شمشیر زن سے تعبیر کیا کرتے تھے - سرحد کے قبائلی مجاہد آخر تک ان کے خلاف برسوں تک جہاد کرتے رہے اور انگریز کی عسکری قوت ان کے جذبۂ آزادی کو ختم نہ کر سکی -

پاکستان کے علاقوں میں ہندو مذہب اور اس کے ذات پات کے عقیدہ کا اثر بہت کم رہا - آریہ ورت یا اصل بھارت کے رہنے والے ان علاقوں کو ہمیشہ غیر ملکی سمجھتے رہے - یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں بدھ مت کو خاص فروغ حاصل ہوا -

بدھ مت نے سب سے پہلے برہمنوں کے اقتدار اور ذات پات کے نفرت انگیز نظام کے خلاف آواز اٹھائی - برہمنوں نے آہستہ آہستہ بدھ مذہب کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ، لیکن مشرقی بنگال میں اب بھی اس مذہب کے نام لیوا موجود ہیں - پاکستان میں سندھ

کا صوبہ محمد بن قاسم کے وقت سے اسلام کے زیر اثر رہا ہے ۔ اسی لیے یہاں کے ہندوؤں پر ذات پات کا زیادہ اثر نہ ہوا اور وہ ہندو دھرم کے عقیدے کے خلاف سمندر پار کی بندر گاہوں میں تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے ۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں اسلام کا ہمیشہ سے گہرا اثر رہا اور توحید اور اسلامی مساوات کے اثر سے اس سر زمین نے گورونانک جیسے توحید پرستوں کو جنم دیا ۔

ڈارڈ :

پاکستان میں اگرچہ کئی ایک نسلی اور لسانی گروہ آباد ہیں لیکن یہ سبھی گروہ اسلام کے رشتہ اخوت میں منسلک ہیں شمال میں گلگت اور بلتستان کے علاقے ہیں، یہاں کے لوگ ڈارڈ نسل کے ہیں ۔ یہ لوگ ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں لیکن جب انگریز نے کشمیر کے علاقے کو ڈوگرہ راجا کے ہاتھ فروخت کر دیا تو ڈوگروں نے اس علاقے پر بھی قبضہ کر لیا ۔ یہاں کے لوگ اپنی آزادی کے لیے برابر جدوجہد کرتے رہے ۔ پاکستان بنا تو ان لوگوں نے متحدہ جدوجہد کے بعد آخر کار ان غاصبوں کو اپنے علاقے سے نکال باہر کیا ۔ چونکہ انھیں آزادی کی نعمت سال ہا سال کی کشمکش کے بعد حاصل ہوئی تھی ، اس لیے وہ اس کی قدر جانتے ہیں ۔ انھیں پاکستان سے سچی محبت ہے اور وہ ہمیشہ اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے ہیں ۔

گلگت اور بلتستان اونچے پہاڑوں کے علاقے ہیں ۔ یہاں کے پہاڑ چھے سے نو ماہ تک برف سے ڈھکے رہتے ہیں ۔ کوہ قراقرم کے اس سلسلے میں وہ درے واقع ہیں ، جن سے ہو کر چین کو راستہ جاتا ہے ۔ پچھلے دنوں اس علاقے میں ایک شاہراہ بنائی گئی ہے ، جسے ”شاہراہ ریشم“ کہتے ہیں ۔ پرانے زمانے میں چین سے ریشم کا کپڑا اسی راستے سے آتا تھا ۔ خدوخال کے اعتبار سے یہ لوگ منگول نسل سے ملتے جلتے ہیں ۔ یہاں اسلام ترکستان سے آیا ۔ برصغیر سے ان کا تعلق اس وقت ہوا جب یہاں کے ایک حکمران کی بہن کی شادی مغلیہ

خاندان کے بادشاہ جہانگیر سے ہوئی - اس کے بعد یہاں فارسی زبان کا رواج ہوا -

یہ علاقہ گرمیوں کے موسم میں سیاحوں کے لیے تفریح گاہ کا کام دیتا ہے - یہاں کے پہاڑوں کی چوٹیاں زیادہ تر برف سے ڈھکی رہتی ہیں ، لیکن جب موسم بہار آتا ہے تو وادیاں سبزے اور پھولوں سے ڈھک جاتی ہیں ، درختوں پر شگوفے پھوٹتے ہیں - اس موسم میں جشن بہار منایا جاتا ہے - لہلہاتی کھیتیاں اور سر سبز و شاداب باغات نظر آتے ہیں ، جن کے درختوں کی ڈالیاں سیب ، خوبانی اور آلوچے سے جھک جاتی ہیں - یہاں کے لوگ پھولوں اور موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں - اس علاقے میں پولو پرانے زمانے سے کھیلی جاتی ہے - اس کا انتظام علاقے کا راجا یا سردار کرتا ہے - جب کھیل شروع ہوتا ہے تو باجے کی ایک خاص دھن بجائی جاتی ہے - جب کوئی کھلاڑی گیند کو زور سے چوٹ مارتا ہے تو سازندے ساز کو اور بھی جوش سے بجانے لگتے ہیں - کشمیر کے 'ڈوگرہ راج' میں یہاں کے لوگ غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے - پاکستان بننے کے بعد سے ان کی زندگی کی نئی رو رواں دواں ہے اور یہ علاقہ تعلیمی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی کر رہا ہے -

کشمیری :

گلگت اور بلتستان کے جنوب میں کشمیری رہتے ہیں - ان کے قد لمبے ، ناک ستواں اور رنگ صاف ہوتا ہے -

کشمیریوں میں اسلام کا پیغام سب سے پہلے حضرت عبدالرحمان بلبل شاہ نے پھیلایا اور کشمیر کا راجا ان کے ہاتھ پر اسلام لایا - ان کے بعد سید میر علی ہمدانی اپنے ایک سو مریدوں کے ساتھ کشمیر آئے اور ان کے مرید کشمیر کے کونے کونے میں پھیل گئے - ہندوؤں کے زمانے میں عوام کی زبان ملیچھوں کی بولی سمجھی جاتی تھی ، لیکن مسلمان صوفیا نے اپنا پیغام اسی زبان میں عوام تک پہنچایا -

انھوں نے اس زبان میں اشعار اور دوہے بھی لکھے اور اس طرح کشمیری زبان کو بہت ترقی دی ۔ کشمیر، مسلمانوں کے زمانے میں علم و فضل کا بڑا مرکز رہا ہے ۔ یہاں کے بعض علما سیالکوٹ میں آگئے تھے جن کی وجہ سے یہ شہر بھی مدتوں اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا ۔ مسلمانوں نے یہاں کئی قسم کی دستکاریوں اور نئے نئے پھل‌دار اور پھول‌دار پودوں کو رواج دیا ۔

کشمیری لوگ بڑے محنتی اور بہت اچھے دستکار ہوتے ہیں ۔ مسلمانوں نے یہاں بھیڑوں کی بہت اچھی نسل کو رواج دیا ۔ اس کی اُون سے کشمیری لوگ شال بناتے ہیں، جو اپنی نفاست اور خوبصورتی کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے ۔ یہاں کے قالین باف بڑے اچھے دستکار ہیں ۔ یہاں کے کاریگر اخروٹ کی لکڑی پر نقش و نگار کا بڑا خوبصوت کام کرتے ہیں ۔

کشمیری لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں ۔ ان کے ہاں جاؤ تو سماوار گرم ہو گا ۔ اس میں سبز چائے اُبل رہی ہے ۔ کمرے میں خوبصورت نمدوں اور قالین کا فرش بچھا ہے ۔ کمرے کے بیچ میں اخروٹ کی لکڑی کا منقش میز ہے ۔ کونے میں کٹے ہوئے گتے کے بنے ہوئے رنگین گلدان ہیں ۔ مہمان کو چھوٹی چھوٹی خوبصورت پیالیوں میں سبز چائے پیش کی جاتی ہے، اس چائے کی خوشبو سے پورا کمرہ مہک اٹھتا ہے۔ کشمیری اسلام کے شیدائی اور نماز روزے کے بڑے پابند ہیں ۔

پٹھان :

برصغیر میں اسلام محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ آیا لیکن کابل کی فتح اس سے پہلے ہو چکی تھی ۔ راجا داہر مسلم فوج کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا لیکن کابل کے حکمران نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اس طرح اسلام کا پیغام اس علاقے میں بہت پہلے پہنچ چکا تھا ۔ پشتو زبان کے پہلا شاعر امیر کروڑ کے بارے میں کہا جاتا

ہے کہ وہ دوسری صدی ہجری میں گزرا ہے ۔ اس کی بعض جنگی نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاندان عباسیہ کے اُس لشکر میں شامل تھا جس کے زور بازو سے مرکزی ایشیا کے علاقے فتح ہوئے ۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پٹھانوں میں اسلامی روایات بہت پرانی رہی ہیں ۔ انھوں نے اسلام کی آواز پر ایک جان ہو کر لبیک کہا اور سب کے سب مل کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے ۔ پٹھان لوگ سادہ لوگ دل اور بڑے مخلص ہوتے ہیں ۔ انھوں نے جب اسلام قبول کیا تو اُن کے علاقے میں ایک بھی غیر مسلم نہیں رہا ۔ آج بھی اُن کے ہاں مذہب کا بہت گہرا اثر ہے اور قبائلی زندگی میں علما کی حیثیت قبیلے کے بزرگوں اور رہنماؤں کی ہوتی ہے ۔ انگریزوں کے پورے دورِ حکومت میں حکومت کے خلاف قبائلی جہاد کی رہنمائی ہمیشہ وہاں کے ملا" لوگ کرتے رہے ہیں ۔

برصغیر کے مسلم دور میں پٹھانوں نے ہمیشہ جہاد میں حصہ لیا اور مسلم حکومت کی سرحدوں کی سینکڑوں سال تک پاسبانی کرتے رہے ہیں ۔ ان کا گہرا مذہبی جذبہ ان کے قدرتی ماحول کی پیداوار بھی ہے ۔ اس سنگ لاخ پتھریلی سر زمین میں وہ جب پہاڑوں کی سر بہ فلک چوٹیوں اور سنگ لاخ چٹانوں کو دیکھتے ہیں تو انھیں خدا کی ذات کا احساس ہوتا ہے ۔ پشتو کا ایک پرانا شاعر پہاڑوں کو دیکھ کر پکار اُٹھتا ۔

"عظیم خدا ! عظیم خدا ! تیری خدمت میں ہر جگہ پہاڑ تعظیم کے لیے کھڑے ہیں ۔ الحاح و زاری کر رہے ہیں"۔ جب حضرت سید احمد بریلوی اور اسماعیل شہید نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں مسلمانوں کو ایک مرتبہ سنبھالنے کی کوشش کی تو انھوں نے اپنا مرکز پٹھانوں ہی کے علاقے کو بنایا ۔ انھوں نے پٹھانوں ہی کی امداد سے سکھوں کے خلاف جہاد کیا ۔ ان کے بعد بھی پٹھان انگریزی حکومت کے خلاف برابر جہاد کرتے رہے ہیں ۔ ان کے بچوں

کی لوریاں اور ان کے ٹپے کے گیتوں میں جہاد ہی کا سبق سکھایا جاتا ہے - پشتو زبان کا ایک شاعر رحم داد خاں ، مالا کنڈ کے علاقے کا رہنے والا تھا - اس کی تمام عمر انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے میں گزری ہے - وہ اپنے ایک ٹپے میں کہتا ہے -

رحمداد لہو میں نہایا ہوا آیا
بہنوں نے کہا شاید بھائی سرخ پھول لایا ہے -

پٹھان، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے میں رہتے ہیں - یہ قد آور اور گٹھے ہوئے بدن کے ہوتے ہیں - سر پر کلاہ اور لنگی پہنتے ہیں - بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا کرتا اور شلوار ہوتی ہے - کرتے کے اوپر ایک واسکٹ ہوتی ہے ، جس کے حاشیے پر بہت خوبصورت کڑھائی کا کام ہوتا ہے - پاؤں میں عام جوتے کی بجائے چپل پہنتے ہیں - واسکٹ کے اوپر کارتوسوں کی پیٹی اور کندھے سے بندوق لٹکی ہوتی ہے - یہ لباس نہ صرف سادہ اور آرام دہ ہے بلکہ چستی اور مستعدی کے کاموں کے لیے بھی موزوں ہے -

پٹھانوں کی معاشرتی زندگی کے دو بڑے اصول ہیں - ایک مہمان نوازی اور دوسرے عربوں کی طرح پناہ لینے والے کی حفاظت - اگر کوئی شخص کسی قبیلے کی پناہ میں آ جائے تو اس کی حفاظت کے لیے پورا قبیلہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے - پٹھان اسلام کے بڑے شیدائی ہیں - ان کے لیے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز اسلام کے نام پر جان دینا ہے - اسی لیے برصغیر میں صرف ان لوگوں نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور پٹھان قبائل نے انگریزی حکومت کے خاتمہ تک علم آزادی بلند رکھا - اس جہاد میں قبائل کے ملا اور علما نے ہمیشہ ان کی رہنمائی کی - اس لیے انگریزوں کو ان کے علاقے میں بہت سی فوجی چھاؤنیاں قائم کرنا پڑیں اور ان کی زمینی اور ہوائی فوج ہمیشہ ان کے خلاف مستعد رہی ، مگر اس کے باوجود ان قبائل نے ہمیشہ آزادی کی مشعل کو روشن رکھا -

پاکستان بننے سے پہلے وہ انگریزی فوج میں بہت کم بھرتی ہوتے تھے، لیکن یہ صورت حال اب بدل گئی ہے۔ آج یہ لوگ پاکستان کے محب وطن شہری اور اس کی سرحدوں کے سرفروش محافظ ہیں۔ پٹھان پاکستانی فوج کے بڑے جیالے اور جوان مرد سپاہی ہیں۔ انھوں نے ملک کی حفاظت کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ قبائلی علاقے کے کسی گاؤں میں جائیں تو آپ کو دور ہی سے گاؤں کے برج نظر آئیں گے جن کی دیواروں میں بندوق چلانے کے سوراخ بنے ہوتے ہیں۔

پٹھان بڑے ماہر نشانہ باز ہوتے ہیں۔ بچپن ہی سے ان کو بندوق چلانے اور نشانہ بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔ گاؤں کے اندر داخل ہوں تو ہر مکان کے اندر دیواروں پر ہتھیار سجے ہوئے نظر آئیں گے مہمانوں کا استقبال حجرے میں کیا جاتا ہے۔ ان حجروں میں داستان گو، قصے سناتا ہے۔ نوجوان، قبیلے کی جرأت اور جنگی کارناموں کے گیت سنا کر دلوں کو گرماتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رباب بجاتے ہیں۔ جب جوانوں کا جوش اوج کمال کو پہنچتا ہے تو سب مل کر خٹک ناچ ناچتے ہیں۔ یہ جنگ جو اور تلوار زن لوگوں کا ناچ ہے اور اب تو یہ ناچ سارے پاکستان میں اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ اس کا مظاہرہ ہر قومی تقریب میں کیا جاتا ہے۔

پنجابی :

پنجاب کے شمال مغرب میں کوہستان نمک کی پہاڑیوں اور شمال میں کوہ ہمالیہ کا دامنی علاقہ ہے۔ لیکن اس علاقے میں سینکڑوں میل تک وسیع اور سرسبز میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ فصل کے موقع پر یہ پورا علاقہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا سبز سمندر بن جاتا ہے۔ اس کے بیچ میں کہیں کہیں گاؤں ایسے معلوم ہوتے ہیں، جیسے سمندر کے ہرے پانیوں میں کوئی جزیرے ہوں۔ پنجاب کا صوبہ اس شاہراہ کے راستے میں واقع ہے، جس سے مختلف نسلوں کے لوگ

برصغیر پاک و ہند میں آتے رہے ، اس لیے یہاں ملی جلی نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن ان سب کی زبان پنجابی ہے ۔

پنجاب کے لوگ قد و قامت کے لمبے اور قدرے گندمی رنگ کے ہوتے ہیں ۔ ان کے شانے چوڑے اور کولھے مضبوط ہوتے ہیں ۔ ان کا عام پیشہ زراعت اور خاص پیشہ سپہ گری ہے ۔ انگریز کے زمانے سے پنجاب کو ہندوستانی فوج کا بازوئے شمشیر زن کہا جاتا ہے ۔ پنجاب کے لوگ اسلام کے بڑے شیدائی ہیں اور اس کے نام پر جان نثار کرنے کو اپنے لیے فخر سمجھتے ہیں ۔ دست کاری اور صنعت کے کام میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں ۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں انگلستان ، افریقہ اور عرب ملکوں میں جاتے ہیں اور اپنی محنت اور جفاکشی کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔

پنجابی زبان کے گیتوں میں بڑی مٹھاس ہوتی ہے اور یہ گیت اپنی شیرینی کی وجہ سے پاکستان بھر میں بڑے مقبول ہیں ۔

پنجابی کسان بڑا محنتی اور جفاکش ہوتا ہے ۔ وہ دن بھر کھیتوں میں ہل چلاتا اور دوسرے کام کرتا ہے ۔ نہری علاقوں میں جب رات کو کھیتوں میں پانی دینے کی باری آتی ہے تو رات بھر آنکھوں میں گزار دیتا ہے ۔ گاؤں کا تکیہ کسانوں کا 'کلب گھر' ہے ۔ یہاں لوگ درختوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے بیٹھتے ہیں ۔ حقے کا دور چلتا ہے ۔ ریڈیو سے خبریں سنی جاتی ہیں گاؤں کے مسائل پر گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں ، کبھی کبھی کوئی چلتا پھرتا گویا آ جاتا ہے تو ہوا میں اکتارے کی تانیں اڑنے لگتی ہیں اور لہک لہک کر ہیر رانجھا کے گیت گائے جاتے ہیں ۔

گاؤں کے جوہڑ پر بھی بڑی رونق رہتی ہے ۔ ایک طرف کسان بھینسوں کو نہلا رہے ہیں ، دوسری طرف عورتیں کپڑے دھو رہی ہیں ۔ کہیں بطخیں ڈبکیاں لگاتی ہیں ، کہیں بچے تیر رہے ہیں ۔ مسجد

گاؤں کی زندگی کا روحانی مرکز ہے۔ گاؤں کی مسجد مکتب کا کام بھی دیتی ہے۔

فصل کی کٹائی کے بعد جب کسانوں کو فرصت ہوتی ہے تو اس زمانے میں عرسوں اور میلوں کو دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ عرسوں کے موقع پر لوگ جب گاؤں سے گروہ بنا کر نکلتے ہیں تو راستے بھر متعلقہ پیر کی مداح میں گیت گاتے ہوئے چلتے ہیں۔ کسان بھڑک دار رنگوں کے بڑے شوقین ہیں۔ سر پر طرّہ دار پگڑی اور بدن پر لمبا کرتا اور شلوار یا لاچا پہنتے ہیں۔ مختلف علاقوں کے لوگ پگڑی اپنے انداز سے باندھتے ہیں اور پگڑی کے پیچ اور اس کے انداز سے پہنچانے جاتے ہیں کہ وہ کس علاقے کے رہنے والے ہیں۔ کسان لوگ مردانہ کھیلوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ میلوں یا نمائش کے موقعہ پر پہلوانوں کے دنگل ہوتے ہیں۔ کبڈی، فٹ بال کے میچ منعقد کیے جاتے ہیں، بعض علاقوں میں لوگ گھوڑے پالتے ہیں، وہاں گھڑ دوڑ اور نیزہ بازی وغیرہ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ گاؤں کی عورتیں بھی بہت محنتی ہوتی ہیں اور ہر کام میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں، لڑکیاں گیتوں کا بہت شوق رکھتی ہیں۔ چاندنی رات میں کھلے میدان میں نکل آتی ہیں۔ کبھی مل کر گیت گاتی اور لڈی اور جھومر کے ناچ ناچتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقوں پر ڈھولک کے گیت گاتی ہیں۔ ان میں ایک لڑکی گھڑا بجاتی ہے اور باقی لڑکیاں مل کر گاتی ہیں۔ کبھی کبھی لڑکیاں مل کر چرخہ کاتنے کا مقابلے کرتی ہیں اس موقعہ پر چرخے کے گیت گائے جاتے ہیں، اس کو 'ترنجن' کہتے ہیں۔

گاؤں کے لوگوں کو جب فرصت کا وقت ملتا ہے تو آپس میں مل بیٹھ کر وقت گزارتے ہیں۔ ان علاقوں میں جہاں کنوؤں سے آب پاشی ہوتی ہے، وہاں کنوؤں پر بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ ہر کنویں پر درختوں کی گھنی چھاؤں ہوتی ہے۔ آس پاس کے کسان ان کے سائے میں آ بیٹھتے ہیں۔ کوئی سَ رسی بناتا ہے، کوئی

اوزاروں کی مرمت کرتا ہے۔ لوگ کنویں کے چوبچے میں نہاتے ہیں، عورتیں کپڑے دھوتی ہیں۔

کسانوں میں آپس میں مل جل کر کام کرنے کا بڑا جذبہ ہوتا ہے۔ جب فصل کی کٹائی ہوتی ہے تو اکیلے کسان کے لیے کٹائی کا کام مشکل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے ساتھیوں سے "منگ" مانگتا ہے۔ اس طرح سے ہر کنبے میں سے کٹائی کے لیے ایک آدمی آ جاتا ہے۔ کٹائی والے فصل کاٹتے ہیں، ان کے پیچھے عورتیں اور بچے فصل کے گٹھے باندھتے چلے جاتے ہیں۔ دوپہر کے وقت کھیت کے مالک کی طرف سے سب کی ضیافت کی جاتی ہے۔ اس طرح جب کسی اور کے ہاں کٹائی کا کام شروع ہو گا تو اس کھیت کا مالک بھی اس کا ہاتھ بٹائے گا۔ اس طرح کام بھی جلد ہو جاتا ہے اور مل جل کر کام کرنے سے آپس میں محبت بھی بڑھتی ہے۔ اس طرح کوئی شخص مکان بناتا ہے تو شہتیروں کے چڑھانے اور دوسرے کاموں میں بھی گاؤں والے اس کی امداد کرتے ہیں۔ آج کل تو گاؤں والے مل جل کر سکول کی عمارتیں بناتے، گاؤں کے لیے سڑکیں تیار کرتے، پانی کی کھالیں صاف کرتے اور اس طرح کے اور بھی بہت سے کام کرتے ہیں۔

سندھی:

اسلام سب سے پہلے سندھ میں آیا، اس لیے یہاں کے باشندوں پر اسلام کا گہرا اثر ہے۔ سندھ میں عرب کی طرح کھجور کا درخت اور اونٹ عام ہیں۔ اونٹوں کے کارواں صوبے کے دشوار گزار حصوں میں نقل و حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ سندھیوں میں اسلامی روایات بہت پرانی ہیں۔ یہاں سیکڑوں سال سے مسلمان صوفیا نیکی اور محبت کا درس دیتے رہے ہیں اور ان کا اثر دور دور تک پھیلتا رہا ہے۔ پنجاب میں حضرت بلھے شاہؒ اور حضرت میاں میرؒ کے خاندان سندھ ہی سے آئے تھے۔ چونکہ یہاں عربی زبان کا رواج بہت قدیم زمانے سے

رہا ہے، اس لیے پاکستان کی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ سب سے پہلے سندھی زبان میں ہی کیا گیا۔ اس صوبے میں اسلام کے لیے سرفروشی کا جذبہ اب تک زندہ اور تابندہ ہے۔ سندھی لوگ دراز قامت اور جسم کے مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ ڈھیلی ڈھالی لمبی قمیص اور شلوار پہنتے ہیں۔ سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ سندھ کے لوگ شوخ رنگوں کے بڑے شوقین ہیں۔ عورتیں 'سوسی' کا استعمال کرتی ہیں۔ سندھ میں یہ کپڑا بہت عمدہ بنایا جاتا تھا اور سمندر کے راستے یورپ تک جاتا تھا۔ سندھ کے علاقے میں کپڑے میں چھوٹے چھوٹے شیشوں کے ٹانکنے کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اس کام کی بنی ہوئی ٹوپیاں پاکستان بھر میں بے حد مقبول ہیں۔

سندھی لوگ بزرگوں اور اولیائے کرام سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے عرس بہت خلوص اور دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کسانوں کی ٹولیاں دور دور سے آتی ہیں اور راستے بھر مل کر متعلقہ پیر کی مداح میں گیت گاتی ہیں۔ سندھی گیت اپنے رسیلے پن کی وجہ سے سارے پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ یہاں کے گانے والوں کا سب سے اثر انگیز ساز الغوزہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈھولک کا ٹھیکہ چلتا ہے۔ رات کی خاموشی میں جب اس سے تانیں اڑتی ہیں تو سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔

بلوچی:

سندھ پر حملہ کرنے کے لیے محمد بن قاسم کو بلوچستان سے گزرنا پڑا۔ بلوچستان کے بعض علاقے اس زمانے میں خلافت اسلامیہ میں شامل تھے۔ اس لیے بلوچ لوگوں کا اسلام سے بہت پرانا تعلق ہے۔ اس کے جنوبی حصے کا صحرائی علاقہ ریگستان عرب سے زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں کھجوروں کے جھنڈ اور نخلستان پائے جاتے ہیں۔ بلوچی لوگ لق و دق صحراؤں میں اونٹوں کے کارواں لے جاتے ہیں۔ یہاں کے خانہ بدوش، اونٹ، گھوڑے اور دوسرے جانور شوق سے

پالتے ہیں۔ خانہ بدوش چراگاہوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔ ان کے مرد بھیڑ بکریاں اور اونٹ چراتے ہیں۔ عورتیں دن بھر خیموں میں کام کرتی ہیں۔ یہ بہت محنتی ہوتی ہیں۔ کئی کئی میل سے پینے کا پانی سر پر اٹھا کر لاتی ہیں۔ دن بھر اون اور بکری کے بالوں سے نمدے اور قالین بناتی ہیں۔ بلوچی عورتیں کشیدہ کاری بھی خوب جانتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کپڑے پر شیشوں کے ٹکڑے بھی لگاتی ہیں۔ بلوچیوں کو اچھے جانور پالنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ گھڑ دوڑ اور اونٹوں کی دوڑ کے بھی بہت شوقین ہیں۔ بلوچی لوک گیتوں اور نغموں کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جرأت اور جیالے پن کے لیے بھی مشہور ہیں، اس لیے ان کو فوج میں بھرتی کے لیے خاص طور پر موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی بلوچ رجمنٹ اپنی مستعدی اور فرض شناسی کے لیے خاص شہرت رکھتی ہے۔

بلوچ عام طور پر ایک جگہ جم کر قیام نہیں کرتے۔ان کی بڑی دولت ان کے بھیڑوں کے گلے اور جانوروں کے ریوڑ ہوتے ہیں۔ ایک جگہ گھاس یا پانی کم ہو گیا تو خیمے اکھاڑ کر ساز و سامان کو اونٹوں اور گدھوں پر لاد لیتے ہیں اور نئی چراگاہوں کی تلاش میں چل کھڑے ہوتے ہیں۔ دن کے وقت ان کے ڈیرے میں جا کر دیکھو تو مرد پہاڑی کی ڈھلانوں پر بھیڑوں کے گلے چرا رہے ہیں اور عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف ہیں۔ خیمے میں ایک طرف بھیڑوں کی اون پڑی ہے۔ ان کے پاس ہی رنگین دھاگوں کے گچھے ہیں، دوسری طرف قالین بنانے کا کرگھا لگا ہے۔ اس پر ایک عورت قالین بن رہی ہے۔ اس میں رنگا رنگ اون کے دھاگے عجیب بہار دکھا رہے ہیں۔ ایک طرف کچھ نمدے بھی پڑے ہیں۔ جب اون کو تہہ در تہہ رکھ کر اس کو دباتے اور کوٹتے ہیں، تو نمدہ بن جاتا ہے۔ اسے خیمے کے فرش پر بچھانے کے کام میں لاتے ہیں۔

ایک بچی کپڑے پر کشیدہ کاری کر رہی ہے،اس کے پاس شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں ۔ وہ ان ٹکڑوں کو دھاگے کے ساتھ بڑی صفائی سے کپڑے میں ٹانکتی جاتی ہے ۔ ایک بچے نے شیشے کے کام کی بنی ہوئی جیکٹ پہنی ہوئی ہے ۔ بچہ دھوپ میں کھیلتا ہے تو شیشوں سے اس کی واسکٹ جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہے ۔ خیمے کے ایک کونے میں تین لکڑیاں گڑی ہیں جن کے سرے آپس میں اوپر جا کر مل گئے ہیں ۔ ان کے سرے سے دودھ کی ایک مشک لٹکی ہوئی ہے ۔ بچی کبھی کبھی اس مشک کو ہلا دیتی ہے ۔ لٹکی ہوئی مشک ہلتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کا دودھ بلویا جا رہا ہے ۔ بلوچ لوگ دودھ سے مکھن اسی طرح بناتے ہیں ۔ اس خیمے کی چادریں اور ان کے رسے بھی ان عورتوں نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں ۔ آج اسی ڈیرے میں شادی کی ایک تقریب ہے ۔ قبیلے کی عورتیں مل کر لاڈوک کے گیت گا رہی ہیں ۔ ان گیتوں میں وہ بتاتی ہیں کہ دولہا کس قدر بہادر شجاع ہے ۔ وہ تلوار کا دھنی ہے ۔ غیر لوگ ان کی چراگاہ پر حملہ کر رہے ہیں ۔ دولہا کے ہاتھ میں ایک ولایتی بندوق ہے ۔ وہ ایک شہزادے کی آن بان سے ان کے مقابلے میں نکل رہا ہے ۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا ۔ تھوڑی دیر میں قبیلے کا گویا آئے گا ۔ اس کے پاس رباب ہو گا ۔ وہ ڈھولک کے تان پر قبیلے کی بہادری کے گیت گائے گا ۔ گیتوں میں کسی پرانے بہادر کی داستان سنائے گا کہ اس نے قبیلوں کی باہمی جنگ میں مردانگی کی داد کیسے دی ۔ اپنی چراگاہوں کو دشمن کے حملوں سے کیسے بچایا ۔ رات کو ڈیرے کے لوگ ہالو گیت گائیں گے ۔ گانے والے ایک دھمال کی تال پر ایک ساتھ مل کر ناچیں گے اور بہادری کی داستانوں سے سننے والوں کے دلوں کو گرمائیں گے ۔

ڈیرہ کے نزدیک ایک پہاڑی پر کسی بزرگ کا مزار ہے ۔ اس کا عرس ہوتا ہے تو لوگ دور دور سے آتے ہیں ۔ گانے والوں کے

دو گروہ آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں ۔ ایک شخص گیت میں سوال کرتا ہے ، دوسرا اس کا جواب دیتا ہے ۔ سوال جواب کے ان گیتوں کو ''سورو'' کہتے ہیں ۔

ان میں اکثر لوگ ساربانوں کا کام کرتے ہیں ۔ یہ لوگ کاروانوں میں سفر کرتے ہیں ۔ کبھی لق و دق صحراؤں میں سفر کرتے ہیں راستے پر کہیں کہیں اونٹوں کی ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں ۔ یہ جانور سفر کی سختی کا شکار ہو گئے ہیں ۔ رات کو پڑاؤ کرتے ہیں کتے ساتھ ہیں جو پاسبانی کا کام کرتے ہیں ۔ آگ جلائی جا رہی ہے ۔ کھانا تیار ہو رہا ہے ۔ سالم بکرے کو کباب کیا جا رہا ہے ۔ کھانا ختم ہوا تو گانے کی محفل جمی ہے ۔ رباب کی تانیں اٹھتی ہیں اور گیتوں کے بول دور دور تک سنائی دیتے ہیں ۔ اس علاقے میں سردی کا موسم بہت سخت ہوتا ہے ۔ اونچے پہاڑوں پر تو برف باری بھی ہوتی ہے ۔ برف پگھلتی ہے تو زمین پر سبز سبز گھاس کا فرش بچھ جاتا ہے ۔ درخت سبز کونپلوں کا لباس پہن لیتے ہیں ۔ پہاڑیوں کے دامن پھولوں کی خوشبو سے سہک اٹھتے ہیں ۔

اس وقت کارواں دور دور کے علاقوں میں تجارت کے لیے نکلتے ہیں اور عورتیں موسم بہار کے گیت گاتی ہیں ۔ ان کو ''لیکو'' گیت کہتے ہیں ۔

براہوی :

براہوی زیادہ تر قلات اور کوہ کرتھار کے علاقے میں آباد ہیں ۔ یہ بہت پرانی نسل کے لوگ ہیں ۔ ان کی بولی بھی بلوچی زبان سے مختلف ہے ۔ یہ لوگ کئی ہزار سال پہلے اس صوبے میں آباد ہوئے ۔ بلوچستان میں بعض پرانے ٹیلوں کی کھدائی سے پتا چلا ہے کہ تین چار ہزار سال پہلے یہاں بے شمار گاؤں آباد تھے ، جن کے باشندوں نے دیہی تمدن میں بہت ترقی کی تھی ۔ براہوی لوگ طرز زندگی اور لباس میں بلوچیوں سے زیادہ مختلف نہیں ۔ ان کے گیت بہت رسیلے ہوتے ہیں ۔ پاکستان بننے کے بعد براہوی زبان کے ادب نے بہت ترقی کی ہے ۔

مکرانی :

یہ لوگ بلوچستان کے اس حصے میں آباد ہیں جو ایران سے ملتا ہے ۔ ان کی زبان مکرانی ہے جو بلوچی زبان کی ہی ایک شاخ ہے ۔ اس پر فارسی زبان کا گہرا اثر ہے ۔ چونکہ بحیرہ عرب کا ساحل ان کے علاقے کے ساتھ ساتھ ہے اس لیے مکرانی بہت اچھے ملاح ہیں ۔ یہاں کے نڈر اور بے خوف ماہی گیر سمندر کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے اور بادبانی اور موٹر کشتیوں میں دور دور تک نکل جاتے ہیں ۔ ان کے پاس نائیلون کے بنے ہوئے بڑے بڑے جال ہوتے ہیں ۔ وہ کئی کئی روز سمندر میں رہ کر کشتیوں کو مچھلیوں سے بھر کر واپس لوٹتے ہیں ۔ مکرانی لوگ کشتی رانی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں ۔ پاکستانی جہازوں میں اکثر یہی لوگ خدمات انجام دیتے ہیں ۔ یہ لوگ بہت محنتی اور گٹھے ہوئے جسم کے ہوتے ہیں اور کراچی جیسے شہروں میں محنت مزدوری بھی کرتے ہیں ۔

ان لوگوں کے علاوہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد ہے ، جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں یہ لوگ پاکستان کے سبھی علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں ۔ پاکستان کی ترقی اور خوشحالی میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے ۔ بمبئی اور کاٹھیاواڑ کے لوگ پرانے زمانے سے تجارت کرتے چلے آئے تھے ۔ مغلیہ دور تک ہندوستان کی بیرونی تجارت زیادہ تر ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی ۔ ان لوگوں نے پاکستان کی تجارت اور صنعت کو بڑھانے اور پھیلانے میں بڑا کام کیا ہے ۔ انھوں نے سرمایہ کاری اور نئے کارخانے لگانے میں ملک کی بڑی خدمت کی ہے ۔ ہمارے ہاں ہندوستان کے بعض علاقوں سے بہت اچھے دستکار بھی آئے ۔ برصغیر میں بہت سی دستکاریوں کو مسلمانوں ہی نے فروغ دیا تھا ۔ یہ لوگ جب پاکستان آئے تو انھوں نے ان دستکاریوں کو یہاں بھی رواج دیا ۔ ان میں بنارسی کپڑا ، دھات کی ظروف سازی اس پر نقشین کام گوٹہ کناری

کی دستکاری وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ۔ ان لوگوں نے پاکستان میں اردو زبان اور ادب کی ترقی کے لیے بھی بہت کام کیا ہے، چونکہ یہ پاکستان کے تمام علاقوں میں آباد ہیں ، اس لیے ان کی وجہ سے ملک بھر میں زبان لباس اور ثقافت کی یکسانیت کو ترقی دینے میں امداد مل رہی ہے ۔

اگرچہ مختلف گروہوں کے مابین چھوٹے موٹے علاقائی فرق ہوتے ہیں لیکن اسلام اور قومی احساس کے سامنے یہ اختلافات ختم ہو جاتے ہیں ۔ یہ سب گروہ تاریخی روایات کے ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں اور سب ایک ہی سنہری سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ تحریک پاکستان نے ان سب کے دل میں اس سر زمین کی محبت کا جذبہ نکھار دیا ہے ۔

ان سب کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ انہوں نے اس سر زمین کو ایک عظیم جنگ آزادی کے بعد حاصل کیا ہے اور اس کے تحفظ اور ترقی کے لیے ان سب کو مل جل کر کام کرنا ہے

پاکستان میں مختلف رنگوں اور نسلوں کے گروہ آباد ہیں ان میں ایسے گروہ بھی ہیں ، جن کی بولیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ جن کے لباس اور رسم و رواج بھی علیٰحدہ ہیں لیکن یہ سب پاکستان کے فدائی ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر پاکستان قائم ہے تو ان کا وجود بھی قائم ہے ۔ ان کی آزادی اور ان کی معاشرتی ترقی پاکستان کے دم قدم سے قائم ہے ۔

ان میں سے زیادہ لوگ ایک خدا اور ایک رسولؐ کے ماننے والے ہیں، ان کا کلمہ بھی ایک ہے ان کی امیدیں اور امنگیں ، زندگی کی تمنائیں اور آرزوئیں بھی ایک سی ہیں ۔ ان کے ہاتھ ایک ہی دعا کے لیے اٹھتے ہیں ۔ ان کی آوازیں ایک ہی نعرہ بلند کرتی ہیں اور وہ نعرہ ہے ، ’’پاکستان زندہ باد ، پاکستان پائندہ باد ۔‘‘

ہمارے ہاں مسلمانوں کے علاوہ جو اقلیتیں ہیں وہ بھی اپنے وطن

کی شیدائی ہیں - مسلمانوں کے ساتھ مدتوں رہنے سے ان میں بھی وہی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں جو اسلام کی روح و رواں ہیں۔ ترانہ ملی گانے کے لیے ان کی آوازیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ پورے جوش اور ولولے سے اٹھتی ہیں اور ان کے دل بھی اپنے آپ کو وطن پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت بے قرار رہتے ہیں -

سوالات

۱ - پاکستان میں کون کون سے لوگ آباد ہیں ؟ وضاحت سے بیان کیجیے -

۲ - ہر علاقہ کے لوگوں کی خوبیوں پر الگ الگ مضمون لکھیے -

۳ - سندھ میں اسلامی اثرات کیوں زیادہ نظر آتے ہیں -

۴ - اگر آپ نے پٹھانوں کا خٹک ناچ دیکھا ہے تو اس کے تاثرات کو ایک مضمون کی صورت میں لکھیے -

باب ۱۴

قومی اور علاقائی زبانیں

پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔ اُردو زبان کو آج دنیا میں بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بے شمار مقامی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف اس علاقے کو ایک مرکزی حکومت عطا کی، بلکہ اردو زبان کے ذریعے پورے برصغیر میں ایک لسانی وحدت پیدا کر دی۔ انھوں نے برصغیر کے طول و عرض میں ایک ایسی زبان کو رواج دیا، جسے یہاں کے چھوٹے بڑے بخوبی سمجھتے تھے، اس عظیم کارنامے میں ان اولیا اور صوفیا کا بڑا ہاتھ ہے، جنھوں نے اس زبان کے ذریعے برصغیر کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔

اردو کا آغاز اسلامی عہد کے ابتدائی دور ہی سے ہو گیا تھا اور اس کے سب سے پہلے شاعر امیر خسرو تھے۔ اس زبان نے آہستہ آہستہ اتنی ترقی کی کہ انگریزوں کے زمانے تک اسے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنا لیا اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں میں بھی بہت اچھے شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے۔ اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو نے اپنے الفاظ کا ذخیرہ صرف عربی اور فارسی ہی سے نہیں لیا بلکہ اس نے ہر زبان کے کارآمد الفاظ اپنے اندر سمو لیے۔ اردو کے معنی ہیں کیمپ کی زبان۔ مغل بادشاہوں کی فوج میں ہر علاقے کے لوگ بھرتی ہوتے تھے، اور وہ فوجی کیمپوں میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ بعد میں جب انگریزوں نے مسلمانوں

کے مقابلے میں ہندوؤں کو آگے بڑھانا شروع کیا تو ہندوں نے اردو کے مقابلے میں ہندی کو ترقی دینے کی کوشش کی ۔ اس کام میں انگریزی حکومت نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا ۔ لیکن ہندوؤں میں تنگ نظری گھر کر چکی تھی ۔ انھوں نے اس زبان کی ترقی کے لیے سنسکرت کے سہارا لیا اور اس طرح انھوں نے ہندی زبان کے ایسے ہزاروں الفاظ کی بجائے ، جو عوام کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے ، سنسکرت کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ ٹھونسنے شروع کر دیے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئی زبان ، بھارت کے سرکاری دفتروں کے سوا کہیں رائج نہ ہو سکی اور وہاں کے عوام عام بول چال میں اردو زبان ہی استعمال کرتے ہیں ۔

پاکستان میں اردو زبان ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی ان علاقوں میں اس زبان کی مقبولیت کی یہ کیفیت تھی کہ اردو کے سب سے زیادہ اخبار پنجاب ہی سے شائع ہوتے تھے ۔ پنجاب ، سرحد اور سندھ میں اس زبان کے بڑے بڑے شاعر ہو گزرے ہیں ۔ پنجاب میں حضرت بابا فرید شکر گنج ؒ نے سادہ اردو زبان میں ایک مناجات لکھی جو نہایت اثر انگیز ہے ۔ اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہوا ۔

لیکن چونکہ یہ زبان ہر صوبے میں مقبول تھی اس لیے ہر علاقے کے لوگوں کا یہی خیال ہے کہ اردو زبان نے پہلے پہل ان کے صوبے میں ہی جنم لیا ۔ اہل سرحد کا دعویٰ ہے کہ اردو زبان کا آغاز صوبہ سرحد سے ہوا ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ہندکو زبان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ پشتو کے مشہور شعرا خوش حال خان خٹک اور رحمان بابا کے کلام میں بھی اردو کے اشعار ملتے ہیں ۔ سندھیوں کا دعویٰ ہے کہ اردو زبان سندھ سے نکلی ہے اور اس کے سب سے پہلے بڑے شاعر میر محمد فیض بھکری ہو گزرے ہیں ۔

سچل سرمست کے دیوان میں بھی اردو اشعار موجود ہیں۔ اسی طرح سندھ میں اردو زبان کے پہلے اور دوسرے دور کے شعراء اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

بنگال تو ایک لحاظ سے اردو نثرنگاری کا گہوارہ رہا ہے۔ سب سے پہلے اردو میں نثر کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوئیں بنگال کے نواب اردو زبان کے بڑے قدردان رہے اور ان کے صدر مقام مرشد آباد میں بھی، اردو کے بہت اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ بنگال میں اردو زبان کی ترویج کے مرکز، دینی تعلیم کے وہ مدرسے رہے ہیں، جن کا ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے۔ اس طرح سے اردو زبان وسیع معنوں میں ہماری قومی زبان ہے۔

پشتو:

پشتو زبان کا ادب سینکڑوں سال سے چلا آ رہا ہے، اس زبان کا سب سے پہلا مشہور شاعر امیر کروڑ تھا جو آج سے ایک ہزار سال پہلے ہو گزرا ہے۔ ابتدائی زمانے کے شاعر یا تو اسلام کی عظمت کے گیت گاتے تھے یا بہادری اور جوان مردی کے افسانے نظم کرتے تھے۔ جب شہاب الدین غوری نے برصغیر پر حملہ کیا تو اس کے لشکر میں پشتو زبان کے رجز یا جنگی گیت گائے جاتے تھے۔ اس زمانے کے شاعروں میں ملک یار غرشین نے ایک رجز لکھی۔ اس رجز میں اس نے اس فتح کا ذکر کیا ہے جو شہاب الدین غوری نے ملتان کے قریب پائی تھی۔ اس جہاد میں ملک غرشین خود بھی شریک تھا اور اس رجز میں اس طریق جنگ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس سے سلطان نے اس موقعہ پر کام لیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کی فوج ہمیشہ دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی، اس لیے اسلامی مجاہد اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر لیتے تھے۔ ہر ایک گروہ ایک دائرہ بنا لیتا تھا۔ جو زخمی

ہو جاتا تھا اُس کو دائرے کے اندر لے لیتے تھے۔ اس جنگی گیت کی بحر ایسی ہے کہ اسے مجاہد لوگ مل کر گاتے ہوں گے۔ شاعر اس رجز کو اللہ کے نام سے شروع کرتا ہے۔

"اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اب ہماری یلغار ہے۔ یہ دیس پرایا ہے۔ اے غازیو ہوشیار اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اگر ہم ثابت قدم رہے تو جیت ہماری ہے، کیونکہ ہم اللہ کے شیر ہیں۔ اسلام ہمارے پاس ہے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اے غازیو آؤ سب گھیرا ڈال لو۔ شہاب کی حمایت کرو۔ دشمن کو لہولہان کر دو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

ایسے جنگی گیت مجاہدین کے دلوں میں جہاد اور سرفروشی کے جذبے کو آگ کی طرح بھڑکا دیتے اور وہ تلواریں سونت کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ شہاب‌الدین غوری کے دربار کے ایک اور شاعر مشتکار ندوی نے بھی سلطان کے جہاد کی تعریف میں ایمان افروز بدے لکھے ہیں وہ کہتا ہے۔

"غور کا امیر ہندوستان پر حملہ کر رہا ہے وہ دریا کو عبور کر رہا ہے۔ اس کے دبدبے اور دہشت سے جنگل میں شیر لرز رہے ہیں۔"

"اٹک ہر سال اسے خوش آمدید کہتا ہے اور اپنے نرم ریت کو کناروں پر پھیلا دیتا ہے اس کے لشکری یا تو فتحمندی کے جھنڈے ہندوستان میں گاڑ دیں گے، اپنا سر اس مہم میں دے دیں گے یا بت پرستوں کے بت خانے ویران کر دیں گے یا شہروں کو خون سے لالہ زار بنا دیں گے۔"

"اے دین کے شہاب تیرا نام ہمیشہ روشن رہے اور تیرا ذکر ہمیشہ مسجدوں کے منبروں پر ہوتا رہے، تاکہ تیری تلوار سے ہندوستان کے چاروں کونے روشن ہو جائیں اور بت خانے دنیا میں کم ہو جائیں۔"

بعض بادشاہوں اور مجاہدین نے خود بھی رزمیہ شاعری میں حصہ لیا ہے ، مثلاً احمد شاہ درّانی تلوار کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی دھنی تھا ۔ اس کے زمانے میں پشتو ادب کو بہت ترقی ہوئی ۔ اس سے پہلے پشتو کی شاعری حجروں اور خانقاہوں تک محدود تھی ۔ احمد شاہ کی حوصلہ افزائی سے اس کو دربار میں بھی رسائی ملی ۔ احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ بھی جو اس کے بعد بادشاہ ہوا ، اچھا شاعر تھا ۔ احمد شاہ ابدالی ایک رزمیہ نظم میں کہتا ہے ۔

"اے احمد شاہ تلوار کی چمک کے نیچے زندگی بسر کر
ہر ملک کی طرف فاتحانہ یلغار کر
مجھے خدا نے رقیبوں پر غالب کر دیا ہے
اب ہندوستان کی سیر کا ارادہ ہے"

سرحد کے علاقے میں رزمیہ یا میدان جنگ کے گیت ہمیشہ مقبول رہے اور جب انگریزوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو پورا علاقہ ان رزمیہ گیتوں سے گونج اٹھا ۔ انگریزوں کے خلاف قبائل اور علما نے بڑی بے جگری سے جہاد کا حق ادا کیا ۔ پہاڑوں کی چوٹیوں یا درّوں کی گہرائیوں میں جب شام کے اندھیرے گہرے ہونے لگتے تو ماں اپنے بچے کو جھولا جھلاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اسے لوری دیتی تھی ۔ "سو جا ، سو جا ، تیرا باپ لڑائی پر گیا ہوا ہے ۔ اچھی تیز تلوار کمر میں لٹکا کر ، وہ وطن کی عزت کی خاطر اپنا سر دے دے گا ۔ کیونکہ وطن پر فرنگی نے چڑھائی کردی ہے ۔ سو جا ، سو جا میرے لال تو شہسوار بن ۔ دشمن سے منہ نہ پھیر انگریزوں کو ملک سے نکال دے ، سو جا ، سو جا ۔"

پشتو زبان میں نثر کی کتابوں کو بایزید انصاری نے رواج دیا ۔ یہ بزرگ مشرقی پنجاب میں جالندھر کے رہنے والے تھے ۔ انھوں نے سرحد میں فرقہ روشنیہ کی بنیاد ڈالی ، جہاں ان کے ہزاروں مرید ہوگئے ۔ وہاں ان کے اثر سے پشتو ادب پر تصوّف کا رنگ چھانے لگا ۔

مغلیہ سلطنت کے زمانے میں پشتو کا سب سے مشہور شاعر خوش حال خان خٹک ہو گزرا ہے۔ وہ ایک مرد مجاہد تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی جہاد میں بسر کر دی۔ خوش حال خان کو عربی اور دینی علوم پر بھی قدرت حاصل تھی۔ وہ سیالکوٹ کے مشہور عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے بھی خط و کتابت رکھتا تھا۔ علامہ اقبال اس کی شاعری کی بہت قدر کرتے تھے۔ انھوں نے اس کے بعض اشعار کا اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

مغلیہ زمانے کے ایک اور شاعر رحمان بابا ہیں۔ ان کی حیثیت ایک دینی بزرگ کی تھی۔ ان کی شاعری میں محبت الٰہی کا کیف و سرور جھلکتا ہے۔ وہ رزمیہ نظمیں بھی خوب کہتے تھے اور ایسے شعر بھی لکھتے، جنھیں دامن کوہ کا رہنے والا ایسی لہک سے پڑھتا کہ پوری وادی گونج اٹھتی تھی۔ اس لیے آج بھی جب شام کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں تو گاؤں کے حجرے میں کسان اکٹھے ہو جاتے ہیں اور گاؤں کا کوئی خوش آواز نوجوان رباب کے ساتھ رحمان بابا کے اشعار الاپتا ہے۔

پشتو ادب میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو اسے پاکستان کا مشترکہ سرمایہ بناتی ہیں۔ دوسری پاکستانی زبانوں کی طرح اس میں بھی دینی علوم کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کی نظم اور نثر میں وہی قصے ہیں، جو پاکستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہیں۔ پشتو کا رسم الخط بھی قرآنی ہے۔ اس لیے اس کا پڑھنا تمام پاکستانیوں کے لیے زیادہ مشکل نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد پشتو ادب نے بہت ترقی کی ہے۔ اس میں اچھے اچھے شاعر اور نثر نگار پیدا ہو رہے ہیں۔ پشتو اکادمی بھی اس کی ترقی کے لیے بہت کام کر رہی ہے۔ پشتو کے گیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ہر پاکستانی کے دل میں جوانمردی اور عالی حوصلگی کی ایک نئی جوت جگاتے ہیں۔

پنجابی :

سنسکرت کی سب سے پہلی کتاب برصغیر کے اس حصے میں لکھی گئی جو آج کل پاکستان میں شامل ہے ۔ ہندو مذہب کی سب سے پہلی کتاب "رگ وید" کے گیت پنجاب میں بنائے گئے ۔ یہ گیت سنسکرت زبان میں تھے ۔ برہمنوں نے عام لوگوں کے لیے اس زبان کے سیکھنے کے دروازے بند کر دیے اور اس طرح انھیں مذہبی اور دوسرے علوم سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ۔ برہمن لوگ عوام کی بولی کو جسے شروع میں پراکرت کہتے تھے، ناپاک زبان تصور کرتے تھے لیکن جب گیارھویں صدی عیسوی میں اسلام کے نام لیوا پنجاب میں آئے، تو انھوں نے یہاں کی عوام کی بولی کو گلے لگایا ۔ غزنوی عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان نے یہاں کی زبان میں شاعری کی ۔ مسلمان بزرگوں اور اولیائے کرام نے یہاں ہی کی زبان میں لوگوں کو اسلام اور انسان دوستی کا سبق پڑھایا ۔ اس زبان کے پہلے شعرا میں سے بابا فرید شکر گنجؒ کا نام آتا ہے ۔ ان کے بعد ان کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ ابراہیم فرید نے بھی اسی زبان میں شاعری کی ۔ انھوں نے اپنے کلام میں نیکی اور محبت کا ایسا دل نشین درس دیا کہ ان کے کلام کو سکھوں کے پیشوا گورو نانک نے اپنی مذہبی کتاب "گرنتھ صاحب" میں شامل کر لیا ۔ ان کے بعد آنے والے صوفی شعرا نے اس زبان کو اور بھی ترقی دی ۔ ان میں مادھو لال حسینؒ ، سلطان باہوؒ اور بلھے شاہؒ کے نام مشہور ہیں ۔ مادھو لال حسینؒ اور بلھے شاہؒ کی کافیاں آج بھی مذہبی محفلوں میں ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں ، جو لوگوں کو نیکی اور خلوص کا سبق دیتی ہیں ۔ پنجاب کے شہروں کی نسبت دیہات کی زبان میں بہت لوچ اور شیرینی ہے ۔ اس کے سب سے بڑے شاعر وارث شاہ نے اپنی کتاب "ہیر رانجھا" میں یہاں کی روز مرہ زندگی کا رنگین نقشہ کھینچا ہے ۔ گاؤں کی چوپال یا ڈیرے میں آج بھی لوگ رات کی خاموشی میں جمع ہو جاتے ہیں اور

'ہیر رانجھا' گانے والے اکتارہ اور چمٹے کی چھنکاہٹ کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو گرماتے ہیں ۔ پنجاب دریاؤں اور گیتوں کا دیس ہے ۔ اس زبان میں شادی ، بیاہ ، برسات اور فصل کی کٹائی ، چاندنی راتوں میں لڑکیوں کے کھیل ، جھومر کے ناچ وغیرہ کے موقعوں کے لیے الگ الگ گیت ہیں ۔

پنجابی زبان کے ادب میں ، ایک نمایاں عنصر وہ علمی ذخیرہ ہے جو پاکستان کا مشترکہ سرمایہ ہے ۔ اس میں سب سے اہم مذہبی علوم کا ادب ہے ۔ یہاں کے پرانے بزرگوں اور اولیاء نے اس زبان کو عوام کی دینی تعلیم کا ذریعہ بنایا ۔ انھوں نے اس زبان میں اسلام پر کتابیں لکھیں ۔ ان کتابوں کو قرآن کے رسم الخط میں لکھا جاتا ہے ۔ اس ادب میں انبیاء اور اولیاء کے قصے ، کربلا کے واقعۂ شہادت اور دوسرے ایسے ہی موضوع شامل ہیں ۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی داستان پنجاب کے بہت سے شاعروں نے نظم کی ہے ۔ ان نظموں کو جنگ نامہ کہتے ہیں ۔ محرم کے ایام میں گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں اور مرد ان جنگ ناموں کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں ۔ یہ جنگ نامے بچوں اور بڑوں میں جہاد کا شوق بیدار کرتے ہیں اور ان کے دل میں یہ ولولہ پیدا کرتے ہیں کہ دین اور بلند اصولوں کی خاطر انسان کو ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ پنجابی زبان میں رسول کریمؐ کی نعت اور توصیف کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ اس زبان میں اس ادب کی کئی قسمیں ہیں ۔ میلاد نامہ یا نور نامے میں حضورؐ پاک کی ولادت کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ معراج نامہ میں معراج کے سفر کا حال بیان کیا جاتا ہے ۔ حلیہ شریف کی نظموں میں حضورؐ کے سراپا اور حسن و خوبی کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ سلام میں حضورؐ پر درود و سلام پڑھا جاتا ہے ۔ پنجابی شاعروں کو رسول کریمؐ سے والہانہ عشق اور لگاؤ تھا ۔ اس کے اظہار کے لیے بھی کئی قسم کی نظمیں اور بیت لکھے جاتے تھے ۔ اشتر نامے یا جھوک

میں شاعر ان تکالیف کا ذکر کرتا ہے ، جنھیں وہ مدینے کے سفر میں شوق و ذوق سے برداشت کرتا ہے - مدینے پہنچ کر کبھی تو اپنے آپ کو دربارِ رسولؐ میں ایک جاروب کش کے طور پر پیش کرتا ہے - رسولؐ کریم کے فراق میں کبھی وہ سہ حرفی لکھتا ہے - کبھی بارہ ماہ گاتا ہے - کبھی ست وار کے بیت الاپتا ہے - پنجابی کے الف ب میں کل حروف کی تعداد تیس ہوتی ہے - اس کو سی حرفی یعنی تیس حرفوں والی نظم کہتے ہیں - اس میں ہر شعر نئے حرف سے شروع ہوتا ہے - اس طرح یہ نظم تیس اشعار میں پوری ہوتی ہے - اس طرح بہت سے شاعروں نے بارہ ماہ بھی لکھے ہیں - ان میں شاعر ہجر اور فراق کی داستان بیان کرتا ہے اور سال کے ہر مہینے میں اس پر جو کیفیت گزرتی ہے ، اسے بیان کرتا ہے - بارہ مہینوں کی مناسبت سے اس نظم میں بارہ بند ہوتے ہیں - اسی طرح وہ ہفتے کے ہر دن کی کیفیت بھی علیٰحدہ علیٰحدہ نظم کرتا ہے ، اسے ست وار کہتے ہیں - اس میں سات بند ہوتے ہیں -

پنجاب کے لوگ ہمیشہ سے تلوار کے دھنی رہے ہیں ، اس لیے یہاں جنگی یا رزمیہ نظمیں بھی بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں - رزمیہ نظموں کو پنجابی میں وار کہتے ہیں - یہ لمبی لمبی نظمیں میراسیوں اور بھانڈوں کو زبانی یاد ہوتی ہیں اور یہ انھیں چوپال یا تکیہ کے مجمع میں بہت لہک لہک کر پڑھتے ہیں - ان میں نجابت کی نادر شاہ کی وار بہت مشہور ہے ، جس میں دہلی پر نادر شاہ کے حملے کا ذکر ہے - اس میں شاعر ہندوستانیوں کے باہمی نفاق پر خون کے آنسو روتا ہے اور انھیں شرم دلاتا ہے کہ ان کی آپس کی نا اتفاقیوں نے ملک کا کیا حال کر دیا ہے - ایک اور شاعر شاہ محمد کی وار بھی بہت مشہور ہیں -

پنجابی زبان کے لوک گیت بہت رسیلے ہوتے ہیں - اور ان میں عوامی جذبے اور امنگوں کی پھوہاریں چھوٹتی ہیں - ان کی بحریں

چھوٹی اور ان کی دھنیں بڑی تیز ہوتی ہیں ۔ یہ گیت پاکستان کا مشترکہ سرمایہ ہیں اور پاکستان کے سب علاقوں میں بہت مقبول ہیں ۔ پنجابی زبان کے بعض قصے ، ہیر رانجھا ، سسی پنوں ، سیف الملوک اور یوسف زلیخا تمام پاکستانی زبانوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں ۔ سسی پنوں کا قصہ پنجاب میں بھی اتنا ہی مقبول ہے ، جتنا سندھ میں ۔ سیف الملوک اور یوسف زلیخا کے قصے بنگالی ادب میں بھی موجود ہیں ۔ پنجابی زبان پر غزنوی سلطنت کے زمانے سے ہی فارسی اور عربی کا بہت گہرا اثر رہا ہے ۔ اس کے بہت سے الفاظ اور محاورے اردو زبان میں بھی پائے جاتے ہیں ، بلکہ بعض تحقیقات کرنے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ اردو کا آغاز سب سے پہلے پنجاب ہی میں ہوا ، جس کے بعد یہ زبان دہلی اور دکن میں پہنچی ۔ آج کل پنجابی زبان کو بہت ترقی دی جا رہی ہے ۔ اس کے لیے پنجابی اکادمی اور دوسرے ادارے قائم کیے گئے ہیں جو نئے مصنفوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ نئے لکھنے والے اس زبان میں غزل ، ڈرامہ ، افسانے اور ناول لکھ رہے ہیں ۔ جس رفتار سے یہ زبان ترقی کر رہی ہے اس سے امید کی جاتی ہے کہ یہ زبان مستقبل قریب ہی میں اعلیٰ ادبی معیار پر پہنچ جائیگی

سندھی :

پاکستان کے تمام صوبوں میں سندھ ایسا خطہ ہے ، جہاں تحریری زبان ، سب سے پہلے وجود میں آئی ۔ موئن جوڈرو کے پرانے کھنڈروں سے جو مہریں ملی ہیں ، ان پر ایسے حروف کندہ ہیں ، جو اب تک پڑھے نہیں جا سکے ۔ لیکن یہ ہمیں آج سے چار ہزار سال پہلے کے رسم الخط کی کہانی سناتے ہیں ۔ اسلامی ادب کا آغاز سب سے پہلے سندھ ہی میں ہوا ۔ محمد بن قاسم کی آمد سے یہاں عربی زبان و ادب کا اتنا رواج ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہاں اچھے شاعر ، محدث اور علما پیدا ہونے لگے ۔ یہاں کے شعرا نے عربی شاعری میں ایسی استعداد حاصل کر لی کہ انھیں بصرے اور بغداد کی علمی

محفلوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا ۔ یہاں کے ایک شاعر نے تو خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر فضل بن یحیٰی کی مدح میں ایک شاندار عربی قصیدہ بھی لکھا تھا ۔ سندھی شعرا نے عربی زبان میں اپنے وطن کی تعریف میں بھی بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں ۔ اس طرح سے یہاں عربی رسم الخط کا رواج ہو گیا اور سندھی زبان بھی عربی حروف میں لکھی جانے لگی ۔ اس رسم الخط کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سندھی زبان پاکستان کے ہر حصے میں آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے ۔

سندھی زبان میں شاعری کا آغاز صوفیا سے ہوا ۔ تاریخ میں اس کے سب سے پہلے دو شعر حیدر آباد کی ایک محفل سماع میں پڑھے گئے ، جن کو سن کر اس زمانے کے ایک بزرگ مخدوم احمد شاہ بھٹی پر ایسا وجد طاری ہوا کہ وہ واصل بحق ہو گئے ۔ صوفیانہ شاعری کو شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اوج کمال پر پہنچایا اور حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ صاحب نے شاعری کی ہر صنف کو ترقی دی ۔ وہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے اور اپنے کلام سے ان کے دلوں کو نئی زندگی بخشتے تھے ۔ شاہ صاحب کو غریب طبقے سے بے انتہا لگاؤ تھا ۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اُن کے لیے بڑی محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے ۔ سچل سرمست نے شاہ عبداللطیف کا آخری زمانہ پایا ۔ اُن کی شاعری میں بہت سر مستی اور والہانہ پن ہے ۔ ان بزرگوں کا بڑا مقصد محبت الٰہی کے جذبات کو لوگوں تک پہنچانا تھا ۔ وہ اس کے لیے ہر طریقہ اور ہر ذریعہ کام میں لاتے تھے ۔ سچل سرمست نے سندھی زبان میں ہی نہیں بلکہ فارسی ، ہندی اور سرائیکی زبان میں بھی اشعار کہے ہیں ۔

سندھی ادب میں ، مذہبی علوم کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ اس میں مولود ، کلمے ، مرثیے ، جنگ نامے سبھی شامل ہیں ۔ سندھ کے عوام میں منظوم قصے کہانیاں بھی بہت مقبول ہیں ۔ ان میں سے سسی پنوں کا قصہ خاص طور پر مشہور ہے ۔ یہ قصہ

پاکستان کے ہر صوبے میں مقبول ہے اور اسے پنجابی زبان کے شاعروں نے بھی نظم کیا ہے۔ سندھی زبان کے گیت سارے پاکستان میں پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کے گانے والے، سندھی طرز کے، رنگارنگ کے مخصوص لباس میں ہوتے ہیں اور ان کے الغوزوں کی دھنیں ہر علاقے میں پسند کی جاتی ہیں۔ سہوان شریف کے قلندر صاحب کی مدح کا مشہور گیت "دما دم مست قلندر" پاکستان کے تمام علاقوں میں بے حد مقبول ہے اور اب تو اس کی مقبولیت بین الاقوامی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سندھی ادب نے بہت ترقی کی ہے اور اس میں ہر قسم کی کتابیں لکھی جانے لگی ہیں۔ اس زبان کو اب تعلیم کے اعلیٰ درجوں تک ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا ہے۔ حکومت نے اس کی ترقی کے لیے سندھی ادبی بورڈ بنایا ہے، جس کی کوششوں سے اس کے ادب میں گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

بلوچی زبان:

بلوچی زبان ایسے علاقے کے لوگوں کی بولی ہے، جو اپنی جرأت اور بہادری کے لیے مشہور ہیں۔ اس زبان کا ادب ان جیالے لوگوں کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔ بلوچی ماں جب اپنے بچے کو لوری دیتی ہے تو کہتی ہے "میرا پھول سا بچہ جب جوان ہو گا تو اپنے کندھے پر بندوق رکھ کر رواں ہو گا۔ میرا ننھا جوان"

بلوچ لوگ شروع ہی سے اپنے قبیلے کے بہادروں اور جیالوں کی جنگ آزمائی اور ان کے کارناموں کے گیت گاتے چلے آئے ہیں۔ پہلے زمانے میں قبیلوں میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر قبیلے کے اپنے شاعر اور اپنے داستان گو ہوتے تھے، جو اپنے جنگ ناموں یا رزمیہ نظموں میں قبیلے کے کارنامے بیان کرتے تھے۔ رند اور لشاری قبیلوں کی باہمی لڑائیوں کو ان کے شاعروں نے طویل نظموں میں بیان کیا ہے۔ شاعر، میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں کو اس طرح

سے جان کی بازی لگانے پر ابھارتا ہے۔ "ہم تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہیں۔ ہم دشمن پر پہاڑی کی بلندی سے حملہ کرتے ہیں۔ کبھی وادی سے، کبھی ہم اس کو دونوں طرف سے گھیرتے ہیں۔ دشمن سامنے سے ایسے بھاگ رہے ہیں، جیسے جنگلی گدھوں کا گلہ ہو۔ وہ چھپنے کے لیے گڑھوں اور زمین کے کونوں کھدروں کی تلاش کر رہے ہیں۔" جب مغلیہ خاندان کے بادشاہ ہمایوں نے، دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو بلوچی قبیلوں نے اس کی امداد کی تھی۔ ان کے شاعروں نے ہمایوں کی فتوحات کے گیت بھی گائے ہیں۔ جب قبیلہ فتح اور کامرانی کے بعد واپس لوٹتا تھا تو قبیلے میں چراغاں ہوتا اور ڈھول کی تال پر فتح کے گیت گائے جاتے تھے۔ ان کو "ہالو گیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بلوچستان کا صوبہ وسیع میدانوں اور پتھریلے علاقوں کا دیس ہے۔ اس کے دشوار گزار راستوں پر چلنے والے، اپنے سفر میں ساربانوں کے گیتوں سے دل بہلاتے ہیں۔ بلوچستان کے لوگ گانے کے بہت شوقین ہیں۔ داستان گوؤں کے چھوٹے چھوٹے گیت، بلوچی نے، یا نڑی کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ بعض گیتوں میں پہیلیاں یا معمّے ہوتے ہیں۔

بلوچی زبان کے گیت، ہمارے ہاں ریڈیو اور ٹی۔وی پر بہت مقبول ہیں۔ بلوچی زبان ہمارے پاکستانی ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ادب پاکستان کے بہادر لوگوں کے کردار کا آئینہ دار ہے۔

بلوچی زبان میں، اسلام کے بلند اصولوں اور انبیا اور اولیا کی اخلاق آموز داستانیں بھی محفوظ ہیں۔ بلوچستان کے لوگوں کا عرب اور ایران سے بھی بہت پرانا رشتہ رہا ہے۔ یہاں کی بعض پرانی نظموں میں عربی قصیدوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کی طرح اس زبان پر بھی فارسی کا گہرا اثر ہے۔ اس کے پچاس فی صد الفاظ فارسی زبان ہی سے لیے گئے ہیں۔ بلوچی زبان میں

بہت سی ایسی داستانیں ہیں ، جو پاکستان میں ہر جگہ مقبول ہیں ۔ ان میں سب سے مشہور "لیلیٰ مجنوں" کی داستان ہے ۔ پاکستان بننے کے بعد بلوچی زبان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی جا رہی ہے اور ادبی انعامات کے ذریعے اچھے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ۔

بلوچی زبان کی دو بولیاں سلیمانی اور مکرانی ہیں ۔ سلیمانی بولی شمالی اور مشرقی حصے میں بولی جاتی ہے اور مکرانی جنوبی اور مغربی حصوں میں ۔ قلات کی زبان بروہی ہے اور اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت پرانی ہے ۔

اگرچہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں رائج ہیں ، لیکن ان سب زبانوں کا پس منظر ایک ہی ہے ۔ ان سب زبانوں میں عربی اور فارسی کے ایسے ہزاروں الفاظ موجود ہیں ، جن کو ہر پاکستانی سمجھ سکتا ہے ۔ ان زبانوں پر اسلام اور اسلامی عقائد کا بہت گہرا اثر ہے ۔ اولیا کے قصے ، مسلمان نام آوروں کے کارنامے ، مذہبی علوم کے ذخیرے ، بلکہ عوامی داستانیں بھی سب زبانوں میں ایک سی ہیں ۔ یہ زبانیں ہمارے اتحاد اور اخوت کی آئینہ دار ہیں ۔ اس اتحاد کا ایوان ، قرآن کی تعلیم اور اسلام کی سنگین بنیادوں پر استوار ہے ۔ ان تمام زبانوں میں قرآنی رسم الخط رائج ہے ۔ ہمارے قومی نعرے ہر صوبے میں ایک ہیں ۔ جب ہم قائداعظمؒ زندہ باد ، پاکستان پائندہ باد کہتے ہیں تو ہماری آواز کی کڑک اور ہمارے دلوں کا سوز و ساز ایک سا ہوتا ہے ۔

ہمارا عظیم پاکستانی ادب اور اس کے نغمے ایک ایسے آرکسٹرا یا بینڈ باجے کی طرح ہیں ، جس میں بیسیوں قسم کے ساز اور موسیقار ہیں ، جن کی آواز ایک ساتھ اٹھتی ہے اور فضاؤں کو اپنے مردانہ زیر و بم سے ارتعاش میں لے آتی ہے ۔ بولیوں کے اختلاف کے باوجود ہم سب ایک ہی مادر وطن کے سپوت ہیں اور ایک ہی آواز میں

اس کی محبت کے نغمے اور اس کی حفاظت اور دفاع کے ترانے گاتے ہیں ۔

سوالات

۱ - پاکستان کی صوبائی زبانوں میں ، کون کون سی چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں ؟

۲ - اردو زبان میں کیا خوبی ہے اور اسے کیوں قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے ؟

۳ - ہماری صوبائی زبانوں میں عام طور پر کس قسم کی کتابیں لکھی گئیں ؟

۴ - عربی اور فارسی نے ہماری مقامی زبانوں پر جو اثر ڈالا ہے ، اس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے ۔

باب ۱۵

پاکستان اور اسلام

قائد اعظم نے تحریک پاکستان کے مقصد کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی ، ''مسلمان ایسے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات ، اپنے تہذیبی ارتقا ، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔'' ان کی رائے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیب میں بنیادی فرق تھا۔ ان کے الفاظ میں ''ہندو اور مسلمان ہر چیز میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں - ہم مذہب میں مختلف ہیں - تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں - تاریخ ، زبان ، طرز تعمیر قانون معاشیات اور لباس میں ، غرض کہ ہر بات میں ان سے مختلف ہیں -''

دونوں قوموں کے اس اختلاف کو قائد اعظمؒ کے علاوہ بعض مغربی مصنفین نے بھی بہت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے - جین بوتھ ول کے کہنے کے مطابق ''دنیا میں اور کہیں آپ کو دو ایسے مذہب نہیں ملیں گے جو ہندو مت اور اسلام کی طرح ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ متضاد ہوں ، مسلمان خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں ، مگر ہندوؤں کے سینکڑوں دیوی دیوتا ہیں - اسلام انسانی مساوات اور جمہوریت پر زور دیتا ہے مگر ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز نے ان میں بہت سے مختلف طبقے بنا دیے ہیں - یہ نظام معاشرت ہر شخص کو دائمی طور پر ادنیٰ یا اعلیٰ معاشرتی درجے میں بانٹ دیتا ہے اور وہ کبھی اپنے گروہ سے باہر نہیں نکل سکتا -''

توحید پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں حاکمیت صرف خدا اور اس کے قانون یعنی شریعت کو حاصل ہے اس میں

چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں ، انسان کا درجہ محض اس کے نائب یعنی خدا کے قانون کو نافذ کرنے والے کا ہے ۔ لٰہذا فطری طور پر اسلامی معاشرے کی بنیاد مساوات اور جمہوریت پر قائم ہے ۔ اس معاشرے کا ہندوؤں پر بھی گہرا اثر ہوا ۔ ان کی ذات پات کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے ۔ برہمنوں کی اجارہ داری کم ہو گئی ۔ برہمنوں کی علمی زبان سنسکرت کی جگہ مقامی بولیوں نے لینا شروع کی اور علوم و فنون کی روشنی نچلے طبقوں میں بھی پھیلنے لگی ۔ اچھوتوں اور نچلی ذاتوں پر روحانی زندگی کے دروازے بند تھے ۔ صوفیائے کرام کے اثر سے ہندوؤں میں بھی بھگتی تحریک کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہندو عوام کے لیے بھی روحانی ترق کے راستے کھل گئے ۔ اس طرح سے ہندو سماج کی کال کوٹھری کی دیواروں میں ایسے روزن اور دریچے کھل گئے جن کے راستے مذہبی ، علمی ، اقتصادی اور فنی مساوات کی روشنی اندر آنے لگی ۔

مسلمانوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر انگریزوں کے جانے کے بعد بالا دستی ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گئی تو ان کا طبقہ وارانہ اور غیر جمہوری نظام ایک بار پھر ملک پرچھا جائے گا اور اس طرح مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ ہندو عوام اور ان کے نچلے طبقوں کو بھی نقصان پہنچے گا ۔ انھوں نے پاکستان کا مطالبہ اس خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے کیا تھا ۔ مسلمان جو نئی اقدار اور نیا معاشرہ اپنے ہمراہ لائے ، اس کا بنیادی اصول انسان کی عظمت تھا ۔ اس کے مطابق ہر انسان میں عظیم صلاحیتیں پنہاں ہیں اور ایک اچھے معاشرے کا مقصد یہ ہے کہ انھیں بروئے کار لانے میں مدد دی جائے ۔ اس اصول کی بہترین مثال مسلمانوں کا پہلا حکمران خاندان تھا ، جسے خاندان غلاماں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ اس خاندان کے افراد یا تو غلام تھے یا غلاموں کی اولاد ۔ مسلم معاشرے میں انسانی عظمت کے اس بلند عقیدے ہی نے غلاموں کو

تاج سلطانی سے سرفراز کیا۔

مسلمان حکمران شریعت کی بالا دستی کو تسلیم کرتے تھے اور شریعت کی نظر میں شاہ و گدا کی ایک ہی حیثیت تھی، اسی لیے جب رعایا کا کوئی فرد سلطان کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ کرتا تھا تو سلطان کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں راجا کو دیوتا سروپ یا خدا کا اوتار مانا جاتا تھا اور اصل حاکمیت اس کو حاصل تھی۔ وہ خود قانون بنانے والا اور خود ہی اس کا نافذ کرنے والا تھا۔

اسلام میں امیر کا انتخاب باہمی مشورے سے کیا جاتا ہے۔ برصغیر کے اکثر سلاطین کا انتخاب امرا، وزرا، علما اور صوفیا کرتے تھے، جس کی تصدیق عوام کرتے تھے اور نالائق حکمرانوں کو باہمی مشورے سے ختم بھی کیا جا سکتا تھا، مثلاً مسلم عہد حکومت میں التتمش، بلبن، جلال الدین خلجی، غیاث الدین تغلق کا انتخاب باہمی مشاورت سے کیا گیا تھا۔

سلطانہ رضیہ کے بھائی آرام شاہ کو دہلی کے عوام نے اس موقعے پر معزول کیا، جب رضیہ نے جمعے کے دن جامع مسجد میں اس کے خلاف تقریر کی اور دہلی کے عوام نے ہی اس کی جگہ رضیہ کے انتخاب کی تصدیق کی۔ سلطان سے انتخاب کی تصدیق کی باقاعدہ رسم، بیعت کہلاتی تھی، جو اراکین سلطنت اور علما سے لی جاتی تھی۔

انسانی مساوات کے اصول کا فطری نتیجہ عدل و انصاف کی بالا دستی ہوتا ہے۔ مسلم عہد حکومت کے حکمران اور ان کے قاضی اپنے بے لاگ عدل و انصاف کے لیے تاریخ میں مشہور رہے ہیں عدل و انصاف کے معاملے میں اکثر حکمرانوں نے شاہی خاندان کے افراد، اراکین سلطنت، ارباب اختیار اور عام شہریوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ التتمش اور جہانگیر دونوں نے اپنے محل میں زنجیر عدل لگانے کا حکم دیا تھا۔ یورپ کے سیاحوں کے قول کے

مطابق مغلیہ زمانے کے قاضی دو باتوں کے لیے مشہور تھے ۔ ایک تو وہ کبھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے ، دوسرے مقدموں کا فیصلہ کرنے میں بلاوجہ تاخیر نہیں کرتے تھے ۔

مسلمانوں کے عہد میں ، برصغیر میں ایک مضبوط اور منظم انتظامیہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی ۔ اس کی خوبیوں کا اندازا اس کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے ، ایک مضبوط مرکزی حکومت کی وجہ سے برصغیر منگولوں کے عالمگیر حملوں سے محفوظ رہا اور ملک میں سینکڑوں سال تک امن و امان رہا ۔

اسلامی معاشرے میں فلاحی مملکت کا تصور شروع سے ہی کار فرما رہا ہے اور ابتدائے اسلام میں امیر اپنے آپ کو ہر شہری کی فلاح و بہبود کا ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھتا تھا ۔ برصغیر میں مسلمانوں کے حکمران طبقے نے فلاحی مملکت کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کی ۔ ہندوؤں کے زمانے میں کسان سے پیداوار کا $\frac{9}{10}$ حصہ تک بھی بطور لگان وصول کر لیا جاتا تھا ۔ مسلم عہد حکومت میں لگان کا بوجھ بہت کم تھا ۔ کسانوں کو تقاوی اور دوسری رعایتیں دی جاتی تھیں ۔ پرانے زمانے میں عوام سے بے شمار قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے ۔ مسلمانوں کے زمانے میں ان میں بہت سے ٹیکس ختم کر دیے گئے ۔ بعض سلاطین نے قیمتوں کے کنٹرول کی بھی کامیاب کوشش کی ۔ محتسب کی طرف سے برابر روزانہ بازاروں کے نرخ اور باٹوں کی چھان بین کی جاتی تھی ۔ طلبا کی امداد کے لیے بیش قرار اوقاف قائم تھے اور ان کو وظائف دیے جاتے تھے ۔ غریب طبقے کی امداد کے اتنے ذرائع تھے کہ کوئی شہری، ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا تھا ۔

پاکستان نے ریاست کے بنیادی اصولوں اور عدلیہ اور انتظامیہ کی شاندار روایات کو ورثے میں پایا تھا اور پاکستان بنانے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ان روشن اور درخشاں روایات کو دوبارہ زندہ

کیا جائے۔

قائد اعظمؒ نے پاکستان بنانے کے لیے پیہم اور مسلسل جدوجہد کی تھی اور جب سالہا سال کی کشمکش کے بعد، انھیں ساحل مراد نظر آنے لگا تو ان کے سامنے اس مملکت کے خد و خال بھی اجاگر ہونے لگے، جو وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بنانا چاہتے تھے انھوں نے اپنی متواتر مساعی اور بلند تصور کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

''پاکستان کی سرگزشت گوناگوں مشکلات کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے، لیکن جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ ہمت ہارنے نہیں دی وہ خدائے قدوس پر پختہ ایمان، قومی یک جہتی ہے اور ہمارا یہ مضبوط ارادہ ہے کہ ہم اپنے ملک کو دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہونے نہیں دیں گے۔ ہم سخت ترین طوفان سے گزر چکے ہیں اور ساحل مراد، گو دور سہی، مگر اب نظروں کے سامنے ہے۔

''آئیے! ہم سب مل کر پاکستان کو ایک طاقت‌ور اسلامی مملکت بنائیں اور اپنی ذاتی اغراض کو وسیع تر قومی مقاصد پر قربان کر دیں۔ اسی میں ہماری بھلائی اور قوم کی نجات ہے۔"

قائد اعظمؒ کے ذہن میں اسلام کا تصور ایک عالمگیر وسعت لیے ہوئے تھا۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں اس نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی۔

"انسان کو قرآن میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے خطاب سے موسوم کیا گیا ہے اور اگر یہ آیت ہمارے لیے کوئی معنی رکھتی ہے تو ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم قرآن کی پیروی کریں اور دوسروں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ انسانیت کے ساتھ رکھتا ہے۔ اپنے وسیع مفہوم میں اس کا مطلب دوسروں سے محبت کرنا اور ان کے ساتھ بردباری کا رویہ رکھنا ہے۔ میری رائے

میں یہ محض فریضہ نہیں، بلکہ ایک گہرا اثباتی پہلو رکھتا ہے۔ اگر ہم خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ، خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہو، بردباری کا برتاؤ کرنے میں عقیدہ اور لگاؤ رکھتے ہیں تو ہمیں اس عقیدے پر اپنی روزمرہ زندگی کے ہر مادی اور روحانی پہلو میں عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یہ کوئی معمولی نظریہ نہیں۔ اس کے لیے ہمیں بڑی قربانی اور جد و جہد کی ضرورت ہوگی"۔

اس تقریر سے پتا چلتا ہے کہ قائد اعظمؒ کے ذہن میں اسلام کا تصور، منفی اور تنگ نظری پر مبنی نہیں تھا، بلکہ یہ تصور اپنے اندر کائنات کی وسعتیں سمیٹے ہوئے تھا۔ قرار دادِ مقاصد میں بھی، اسلام کو انہی وسیع معنوں میں لیا گیا ہے۔

قرار داد مقاصد کا آغاز اسی تصور سے ہوتا ہے کہ "حاکمیت صرف خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہے اور ریاست محض اس قانون کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہے۔" قائد اعظم پاکستان میں ایک ایسا نظام حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جو بانی اسلام کے دستوری تصورات کا سچا نمونہ ہو اور جس کی بنیادیں جمہوریت کے اصول پر استوار ہوں۔ ان کے اپنے الفاظ میں "ہمیں قرآن کے قانون کی عملی صورت رسول کریمؐ نے دی ہے، اس لیے ہماری نجات اسی اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں"۔ جمہوریت کے ساتھ ساتھ قائد اعظم نے اسلامی نظریۂ حیات پر بھی زور دیا۔ جب مسلم لیگ کو انتخابات میں فتح ہوئی تو انھوں نے کہا تھا "اس ووٹ نے تاریخی حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ پاکستان تمام مسلمانوں کے دلوں کی تمنا اور ان کے مستقبل کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ پاکستان کا قیام، اسلامی نظریۂ حیات کی ایک عظیم فتح ہے۔"

اسلامی نظریۂ حیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ریاست کے

کام کی بنیاد باہمی مشاورت پر ہو ۔ اسلام میں شروع سے ہی امیر کا انتخاب باہمی مشورے سے ہوتا رہا ہے اور یہ اصول برصغیر کے مسلم عہد میں ایک حد تک برابر کار فرما رہا ہے ۔ سربراہ کا انتخاب اس کی ذاتی خوبیوں ، دیانت داری اور اس کے اخلاص کی بنا پر کیا جاتا تھا ، نہ کہ اس کے ذاتی اقتدار ، خاندان اور وراثت کے اعتبار سے ۔

پاکستان کا ایک مقصد اسلامی کلچر اور ثقافت کا تحفظ بھی تھا ۔ بقول قائد اعظمؒ پاکستان بنانے کا ایک مقصد یہ ہے ”کہ ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیت کے مطابق ترقی کر سکیں ، جہاں اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کو آزادی سے بر سر عمل آنے کا موقع مل سکے ۔“

قائد اعظمؒ کے نزدیک ثقافت کا تصور بھی اپنے اندر عالمی وسعت لیے ہوئے تھا ۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ”عظمت کی روح سے مراد کوئی پتھروں ، ستونوں ، مصوّری یا شان و شوکت کی ثقافت نہیں ، بلکہ اس کی اصل روح انسانیت کی اور مساوات کی ثقافت ہے اور اگر مذہب سے کسی شخص کی مراد کسی ثقافتی ورثے پر ہٹ دھرمی اور اس سے ذاتی منفعت ہے تو یقیناً ایسا انسان انکسار اور تہذیب کے جذبات سے قطعاً عاری ہو گا ۔“

پاکستان بنانے کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایسا خطہ ارض حاصل کیا جائے ، جہاں وہ اپنی زندگیوں کو قرآن اور سنت کے سانچے میں ڈھال سکیں اور اپنی ثقافت اور تہذیب کو پروان چڑھا سکیں ۔ اس مقصد میں اقلیتوں کا تحفظ بھی شامل تھا ۔ چونکہ مسلمانوں کو خود اقلیت کی حیثیت سے ناخوشگوار حالات سے سابقہ پڑا تھا ، اس لیے وہ اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں اور بھی حساس تھے ۔

آج دنیا میں ہر جگہ اقلیتوں کا مسئلہ خطرناک اور بعض حالات

میں تشویش ناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے ۔ اسلامی معاشرے نے ہمیشہ اقلیتوں کو پورا پورا تحفظ دیا ہے ، بلکہ بعض حکومتوں میں تو ان کو اتنی آزادی دی گئی ہے ، جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے ۔ یورپ کی تاریخ میں یہودیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا رہا ، وہ مذہبی تعصب کی بدترین مثال ہے ۔ ان کو دنیا میں اگر کہیں پناہ ملی تو وہ اسلامی ممالک تھے ۔ اس طرح پاکستان نے بھی ہمیشہ اقلیتوں کی حفاظت کی ہے ۔ جب کبھی بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا ، اس وقت ہمارے ہاں اقلیتوں کے تحفظ پر اور بھی زیادہ توجہ دی گئی ۔ اقلیتوں کے تحفظ کو قائداعظم ہمیشہ بہت اہمیت دیتے رہے ۔ انھوں نے گورنر جنرل بننے کے بعد شروع ہی میں اقلیتوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "پاکستان میں آپ اپنے مندروں ، گرجوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے بالکل آزاد ہیں ۔" مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں سے بھری پڑی ہے ، جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے ۔ پاکستان کا پرچم بھی اس رواداری کی ایک روشن مثال ہے ۔ ہمارے پرچم کا سفید رنگ اقلیتوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔

قائد اعظمؒ کے پیش نظر ایک مسلم معاشرے کا قیام ہی نہیں تھا ، بلکہ ایک ایسے عالمی معاشرے کا تصور بھی تھا ، جس میں تمام قومیں آپس میں صلح اور آشتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں ۔ ایسے معاشرے کا نمونہ خود بانی اسلام نے پیش کیا ۔ آپ نے مدینے کے یہودیوں اور بحران کے عیسائیوں سے جو بین الاقوامی معاہدے کیے وہ ایک عالمی معاشرے کے ڈھانچے کا پیش خیمہ تھے ، جو احترام قومیت ، بقائے باہمی اور آپس میں صلح و امن کے اصولوں پر مبنی تھے ۔

پاکستان کی بنیاد چونکہ اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی ،

اس لیے فلاحی ریاست کی تعمیر اس کے دستور کا بنیادی اصول قرار دی گئی ہے۔ اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے فلاحی ریاست کی بے نظیر مثال پیش کی تھی۔ اسلام فرد کی بنیادی ضروریات کی کفالت کی مکمل ضمانت لیتا ہے اور اسلامی فقہ اسے ہر قسم کے استحصال سے تحفظ دیتی ہے۔ پاکستان میں شروع ہی سے فلاحی ریاست کا تصور کار فرما رہا ہے جو آہستہ آہستہ تکمیل پاتا جا رہا ہے۔ کچھ عرصے سے اس مقصد کو عملی شکل دینے کی کوششیں اور بھی تیز ہو گئی ہیں اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چند ہی سالوں میں پاکستان ایک مکمل فلاحی مملکت کی صورت اختیار کر لے گا۔

سوالات

۱۔ وہ کیا مقاصد تھے جن کے تحت برصغیر ہند میں قیام پاکستان کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۲۔ قائد اعظمؒ پاکستان میں کیسی حکومت بنانا چاہتے تھے؟

۳۔ مسلمان حکمرانوں اور ہندو حکمرانوں کا طریق انتخاب کیا تھا؟

۴۔ فلاحی مملکت سے کیا مراد ہے؟ اس پر وضاحت سے روشنی ڈالیے۔

باب ۱۶

پاکستان شاہراہ ترقی پر

تعلیمی ترقی :

پاکستان کو آج ایسی تعلیم کی ضرورت ہے ، جس کی مدد سے ہم اپنے بے پناہ زرعی ، معدنی اور انسانی وسائل کو کام میں لا سکیں ، اپنی زراعت اور صنعت و تجارت کو فروغ دے سکیں اور اپنی قومی زندگی کے معیار کو اتنا بہتر بنا سکیں کہ ہر پاکستانی کو زندگی کی ضروری اشیا بآسانی میسر آ سکیں ۔ اس کے لیے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر خاص توجہ دینی ہو گی اور تعلیم کو عملی شکل دینا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کو بہتر بنایا جا رہا ہے ۔ سائنس پر نئی نصابی کتابیں تیار کی جا رہی ہیں اور ایسے پائلٹ (Pilot) سکول اور کومپری ہنسو (Comprehensive) ہائی سکول کھولے جا رہے ہیں ، جن میں ٹیکنیکل کام کی ورکشاپیں بھی قائم ہیں ۔ ان کے علاوہ پولی ٹیکنیک (Polytechnic) اداروں کی تعداد میں بھی برابر اضافہ کیا جا رہا ہے ۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے سائنس کالجوں کا قیام بھی عمل میں لایا جا رہا ہے ۔ ٹیکنیکل تعلیم کی اعلیٰ ڈگریوں کے لیے انجنیرنگ اور زرعی یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں ۔

کسی ملک کی سب سے بڑی دولت اس کے شہری ہوتے ہیں ۔ اس لیے ہمیں زرعی اور معدنی وسائل کے ساتھ ساتھ انسانی وسائل کو بھی زیادہ سے زیادہ کام میں لانا چاہیے اور ہر شہری کو ایسی

تعلیم و تربیت مہیا کرنی چاہیے ، جس سے وہ ملک کی دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر کے قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے ۔

ہمارے بچوں کی بڑی تعداد سکولوں میں نہیں جاتی۔ بالغوں میں بھی ناخواندہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ لہٰذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مڈل تک ہر بچے کو مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۴ء کے بعد میٹرک تک سب بچوں کے لیے تعلیم مفت ہو جائے گی ۔

تعلیمی اصلاحات :

نئی تعلیمی پالیسی جس کا اعلان ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو صدر مملکت نے کیا ، اس کے تحت تمام پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے ۔ آیندہ چل کر پبلک سکول بھی سرکاری تحویل میں لے لیے جائیں گے ۔ دو مرحلوں میں میٹرک تک تعلیم مفت کر دی جائے گی ۔ اس پالیسی کی چند ایک اہم باتیں یہ ہیں ۔

ا ۔ تعلیم کو دسویں جماعت تک دو مرحلوں میں مفت اور عام کیا جائے گا ۔ یعنی اکتوبر ۱۹۷۲ء آٹھویں جماعت تک اور ۱۹۷۴ء دسویں جماعت تک ۔

ب۔ بغیر کسی معاوضہ کے پرائیویٹ سکول اور کالج حکومت اپنی تحویل میں لے لے گی ۔

ج ۔ پرائیویٹ مدارس میں تعلیم دینے والے اساتذہ کو ملازمت کا تحفّظ دیا جائے گا اور تنخواہیں سرکاری مدارس کے برابر کر دی جائیں گی ۔

د ۔ سیدو شریف ، راولپنڈی ،گوجرانوالہ ، بہاول پور اور خیرپور میں پانچ نئے بورڈز آف انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری ایجوکیشن قائم کیے جائیں گے ۔

ہ ۔ سیدو شریف۔ ملتان اور سکھر میں تین نئی یونیورسٹیاں قائم

کی جائیں گی ۔

و ۔ ۱۹۸۰ء تک کئی یونیورسٹیوں میں دگنی توسیع کی جائے گی ۔

ز ۔ این ۔ ای ۔ ڈی انجنیئرنگ کالج کراچی اور سندھ یونیورسٹی انجنیئرنگ کالج جام شورو کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے گا ۔

ح۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن قائم کی جائے گی ۔

ان کے علاوہ چند ایک مزید اصلاحات بھی کی ہیں ۔

۱ ۔ انتظامی معاملات میں اساتذہ ، طلبا اور ان کے والدین کو نمائندگی دی جائے گی ۔

۲۔ ۱۹۸۰ء تک تعلیم بالغاں اور فنی تربیت کے دس ہزار تربیتی مراکز قائم کیے جائیں گے ۔

۳۔ دیہات اور شہروں میں پچاس ہزار لائبریریاں قائم کی جائیں گی ۔

۴۔ طلبا کو بلا سود تعلیمی قرضے دے جائیں گے ۔

۵۔ طلبا کے وظائف کی تعداد چار گنا کر دی جائے گی ۔

۶۔ فنّی اور سائنسی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جائے گی ۔

اس تعلیمی پالیسی میں دینی تعلیم کو بھی خاص اہمیت دی جائے گی ۔

اس سکیم کے تحت سارے ملک میں میٹرک تک تعلیم مفت ہو گئی ہے۔ بلوچستان میں نئی یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے اور اس صوبے میں میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے لیے ایک تعلیمی بورڈ بھی مقرر کر دیا گیا ہے ۔ پرائیویٹ تعلیم کے لیے ایک ہوائی یا ریڈیائی یونیورسٹی بھی قائم کر دی گئی ہے ۔ اس کا مرکز اسلام آباد میں ہے ۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن قائم کر دی گئی ہے اور اس کے تحت بچوں اور بڑوں کے لیے بہت سی کتابیں چھاپ دی گئی ہیں ۔ اس ادارے کا ایک کام ، کالج کے طلبا کو سستی

کتابیں فراہم کرنا ہے۔ طلبا کے لیے وظائف کی تعداد اور مالیت دونوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہر سکول میں زرعی اور ٹیکنیکل تعلیم کا انتظام چھٹی جماعت سے شروع کر دیا گیا ہے۔

چونکہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، للہذا بچوں کو لازمی طور پر ایسی اسلامی تعلیم دی جائے گی کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال سکیں۔ پاکستان کو آج سب سے بڑی ضرورت ملکی اتحاد کی ہے۔ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے گی، جس سے ان کے دلوں میں پاکستان سے والہانہ محبت پیدا ہو اور وہ اپنے ملک کے سب حصوں کو متحد رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ ہو سکیں۔

پاکستان ایک جمہوری ملک ہے۔ بچوں کو ایسی تربیت دی جائے گی کہ وہ ایک جمہوری معاشرے کے قیام اور اس کی حفاظت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بن سکیں۔ نئی پالیسی کے تحت ہر غریب اور امیر بچے کو ایسی سہولتیں مہیا کی جائیں گی کہ وہ اپنی محنت اور استعداد کے بل پر زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکے۔ تعلیم کا نصاب اس طرح مرتب کیا جائے گا کہ بچہ کتابی کیڑا یا محض کلرک بننے کی بجائے ملکی وسائل کو کام میں لانے اور انھیں بڑھانے میں پوری تن دہی اور مستعدی سے کام کر سکے۔ نصاب میں کتابی تعلیم کی بجائے اس کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا جائے گا، مثلاً سائنس یا زراعت جیسے مضامین عملی طور پر پڑھائے جائیں گے۔ عام سکولوں میں ٹیکنیکل ورکشاپ کھولے جائیں گے۔ اس طرح بچے ملکی دولت کو بڑھانے میں ایک فعال کارکن کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

تعلیم بالغاں

چھوٹے بچے تو ملکی دولت میں اضافہ کا کام بڑے ہو کر ہی کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں کروڑوں کی تعداد میں ایسے ناخواندہ

بالغ موجود ہیں ، جنھیں اب تک کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں دی جاسکی، جس کی مدد سے وہ ملکی دولت میں کوئی خاطر خواہ اضافہ کر سکیں ۔ نئی پالیسی کے تحت ان کے لیے ایسی تعلیم بالغان کا انتظام کیا جا رہا ہے ، جس کی مدد سے وہ اپنے کاموں کو بہتر طور پر انجام دے سکیں گے ۔ ہم زراعت اور صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے سرمایہ کاری کرتے ہیں جس سے ہمیں منافع ملتا ہے ۔ بالغوں کی تعلیم پر روپیہ لگانا انسانیت کی سرمایہ کاری ہے ۔ ان پڑھ بالغوں کی عملی تعلیم میں سرمایہ لگانے سے ہمیں اسی طرح کا قومی منافع ملے گا جیسا ہم دوسرے ذرائع سے حاصل کرتے ہیں ۔

شروع شروع میں تعلیم بالغاں کا کام خاص گروہوں کے لیے کیا جائے گا ، مثلاً ہمارے دیہی علاقوں میں زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بعض منصوبے چلائے جا رہے ہیں ۔ ان علاقوں کے لیے تعلیم بالغاں کا ایسا منصوبہ بنایا جا رہا ہے ، جس سے لوگوں میں ان منصوبوں کو بنانے اور ان سے کام لینے کی سوجھ بوجھ پیدا ہو گی ۔ مثلاً بعض علاقوں میں زراعت کے 'سبز انقلاب' کے منصوبے زیر عمل ہیں ۔ وہاں لوگوں کو فارم گائیڈ تحریک کے ذریعے زراعت کے نئے اصولوں کی تعلیم دی جائے گی ۔ تعلیم بالغاں کا تجربہ سب سے زیادہ کارخانوں کے مزدوروں کے لیے کامیاب رہے گا ۔ نئی پالیسی کے تحت پرانے کارخانوں میں ، جن میں دو سو مزدور کام کرتے ہوں ، ہفتہ میں ۳ دن تعلیم بالغاں کا انتظام کیا جائے گا ۔ تعلیم کا وقت مزدوروں کے اوقات کار میں شمار ہو گا اور انھیں کارخانے کی طرف سے اس وقت کی اُجرت ملے گی ۔ ان جماعتوں میں ان کو ایسی تعلیم دی جائے گی ، جس سے وہ اپنے پیشے میں اچھے کارکن ، اچھے شہری اور اچھے باپ کی تربیت حاصل کر سکیں گے ۔ اس طرح وہ اپنے روزمرہ کے کام کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کر سکیں گے ۔

ہمارے ہاں ، بڑی عمر کے ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد موجود

ہے - جنھوں نے مدرسے میں داخلہ تو لیا ، لیکن کسی وجہ سے اپنی تعلیم پوری نہ کر سکے - تعلیم بالغاں کے ذریعے ان کی تعلیم مکمل کرنے کا بندوبست بھی کیا جائے گا -

پاکستان میں اب تک تعلیم بالغاں کا کام ڈھنگ سے نہیں ہوا - بعض قوموں نے قلیل عرصے میں اپنی پوری آبادیوں کو خواندہ بنا لیا ہے - ان میں چین اور ڈنمارک کے تجربے بہت کامیاب رہے ہیں - ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں بھی تعلیم بالغاں کا کام بڑی تیزی سے جاری ہے - وہاں اس کے لیے فوجیوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے - ہماری حکومت کا بھی ارادہ ہے کہ وہ بھی زمانۂ امن میں فوجیوں کی ایک قومی تعلیمی کور یا دستہ تیار کرے ، جو تعلیم بالغاں کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے سکے -

طلبا کی بہبود سے متعلق بعض دیگر سکیمیں بھی حکومت کے زیر غور ہیں - طلبا کو سستے داموں کتابیں مہیا کی جا رہی ہیں - بعض جگہ ان کے لیے کتابوں کے بنک یا ذخیرے بھی بنائے جا رہے ہیں جہاں سے وہ کتابیں مستعار لے سکتے ہیں - ہمارے ہاں طلبا کو ان کی لیاقت کی بنا پر بیرون ملک تعلیم کے لیے بھی وظائف دیے جا رہے ہیں - طلبا کی ہمت افزائی کے لیے ہر سال صدر مملکت کی طرف سے کچھ انعامات بھی دیے جاتے ہیں -

مفت اور لازمی تعلیم ، فنی اور عملی علوم کی تربیت ، تعلیم بالغاں اور اساتذہ کی تربیت ، ہمارے ابھرتے ہوئے ایوان تعلیم کے سنگ بنیاد ہیں -

سائنس اور ٹیکنالوجی :

پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کے صوبوں میں سائنسی

تحقیقات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی - پورے پاکستان میں یا تو لائل پور میں زرعی تحقیقات کا کام ہوتا تھا یا پنجاب یونیورسٹی میں علم کیمیا پر ریسرچ ہو رہی تھی - لہٰذا قیام پاکستان کے بعد اس ضرورت کا شدّت سے احساس کیا گیا کہ اس میدان میں تیزی سے قدم بڑھایا جائے - انگریزی حکومت کے دور میں پاکستان محض فوجی بھرتی کا علاقہ اور انگلستان اور بھارت کے لیے گیہوں اور کپاس پیدا کرنے کا زرعی فارم تھا - یہاں کی معدنی دولت کی دریافت کے لیے بھی بہت کم کوشش کی گئی تھی - پاکستان کی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ ہم اپنی زرعی اور معدنی پیداوار کو صنعت و حرفت کے کام میں لائیں اور اس طرح نہ صرف اپنے لیے ضرورت کی اشیا تیار کر سکیں ، بلکہ دوسرے ملکوں میں ان کی برآمد بھی کر سکیں - اس کے لیے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ریسرچ کی ضرورت تھی - چونکہ خوراک کا مسئلہ فوری اہمیت رکھتا تھا ، اس لیے شروع میں خوراک اور زرعی ریسرچ کی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا - کچھ عرصے کے بعد صنعتی کونسل کی بنیاد رکھی گئی -

صنعتی تحقیقات میں اِہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی زرعی اور معدنی پیداوار کو قومی صنعتوں میں کیسے استعمال کریں ؟ اس پر تحقیقات کرنے کے لیے پاکستان سائنسی اور صنعتی ریسرچ کونسلوں کا قیام عمل میں لایا گیا ، جس کے تحت کراچی ، لاہور اور پشاور میں لیبارٹریاں بنائی گئیں - ان اداروں کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں خام پیداوار کو صنعتی استعمال میں لانے کے طریقوں پر کام کریں اور علاقے کے صنعت کاروں کو جو مسائل در پیش ہیں ، ان کو حل کرنے میں امداد دیں - مثال کے طور پر پشاور کے علاقے میں پھل ، اون ، معدنیات اور دواؤں کے لیے جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں - پشاور کے معمل میں ان پر تحقیقات کی جا رہی ہے - مقامی جڑی

بوٹیوں سے بعض ایسی دوائیں تیار کی گئی ہیں جو غیر ملکوں میں بھی مقبول ہیں ، کیونکہ ایسے پودے دوسری جگہ نہیں پائے جاتے۔

لاہور کے معمل میں خام دھات کو صاف کرنے ، شیشہ سازی اور چینی کے ظروف وغیرہ کی صنعت پر تحقیقات کی جا رہی ہے -

سائنسی اور صنعتی ریسرچ کونسل ، اب تک مختلف قسم کے خام مواد کو صنعتی کام میں لانے کے دو سو طریقوں کو معلوم کر چکی ہے - ان میں سے ٤٦ طریقے صنعتی اداروں میں کامیابی سے استعمال کیے جا رہے ہیں - ان طریقوں سے اب تک ہماری صنعتی پیداوار میں چھے کروڑ روپے کی قیمت کی اشیا کا اضافہ ہو چکا ہے اور اس سے ٤ ٦ کروڑ روپے کا زر مبادلہ کما چکے ہیں -

ریسرچ کونسل کے سامنے اس وقت سب سے اہم کام یہ ہے کہ بطور ایندھن استعمال ہونے والی معدنیات کو بہتر طریق پر استعمال میں لایا جائے - مثلاً کوئلے کو انجنوں میں کیسے استعمال کیا جائے۔ ہمارے ہاں تیل اور پٹرول کی کمی ہے - کونسل اس مسئلہ پر بھی تحقیق کر رہی ہے کہ سوئی گیس کو موٹر گاڑیوں میں تیل یا پٹرول کی جگہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے - ہمارے ہاں بہت سی دھاتیں نا صاف حالت میں ملتی ہیں - کونسل ، لوہے اور سرمے کی خام دھات کو صاف کرنے کے طریق تلاش کر رہی ہے - ہمارے ہاں گندھک بھی ناصاف حالت میں ملتی ہے ، اس کو صاف کرنے کا طریق بھی معلوم کر لیا گیا ہے - اگر ہم اسی طرح سائنسی تحقیقات کا کام کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں ، جب ہم اپنی زرعی اور معدنی پیداوار کو صنعتی کاموں میں لا سکیں گے اور ہمیں اپنی خام پیداوار کو دوسرے ملکوں کے ہاتھ سستے داموں بیچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی -

پاکستان میں طاقت پیدا کرنے کے بے شمار وسائل ہیں ، لیکن ہم برابر نئے وسائل کی تحقیقات میں سر گرم ہیں - آج طاقت کا سب سے بڑا سر چشمہ ایٹم ہے - آئندہ سالوں میں ایٹمی توانائی ، طاقت کے

دوسرے تمام وسائل کو مات کر دے گی ۔ اس سے جو بجلی پیدا ہو گی ، اس پر بہت کم لاگت آئے گی ۔ مرکزی حکومت نے ایٹمی توانائی کا ایک کمیشن بنایا ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازا اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کمیشن کی سربراہی کا کام صدر مملکت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے ۔ کراچی میں ایٹمی توانائی کا ایک سٹیشن قائم کیا گیا ہے جو عنقریب چالو ہو جائے گا ۔ کراچی اور لاہور میں بھی ایٹمی توانائی کے مراکز ہیں ۔ ایٹم کے پھاڑنے سے ایسی شعاعیں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں جو پودوں کی نشو و نما میں بہت امداد دے سکتی ہیں ۔ اس کے لیے ٹنڈو جام کے زرعی ادارے کے ساتھ زراعت کا ایک ایٹمی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے ۔ بعض عناصر کی شعاعیں خاص قسم کے امراض کے جراثیم کو مارنے میں مؤثر ثابت ہوئی ہیں جن کو آئی سو ٹوپ (Isotop) کہتے ہیں ۔ یہ مرکز ہسپتالوں کے لیے آئی سو ٹوپ بھی تیار کر رہے ہیں ۔

اگر کسی موٹے عدسے یا عینک کے موٹے شیشے کو سورج کے سامنے رکھا جائے تو سورج کی شعاعیں اس میں سے گزر کر ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہیں ۔ اگر اس جگہ کوئی سیاہ کپڑا رکھ دیا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد اس میں آگ لگ جائے گی ۔ اس طرح ہم نے سورج کی شعاعوں سے بھی حرارت پیدا کر لی ہے ، اس حرارت سے توانائی بھی حاصل کی جا سکتی ہے ۔ ہمارے ہاں سارا سال خوب دھوپ پڑتی ہے اور طاقت کا یہ سرچشمہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ۔ بلوچستان کے ساحل پر گوادر کی بندر گاہ میں پینے کے پانی کی بہت کمی ہے ۔ اب وہاں شمسی توانائی کا ایک سٹیشن قائم کیا جا رہا ہے جو سمندر کے نمکین پانی سے صاف اور شیریں پانی تیار کرے گا ۔ تیز ہوا بھی طاقت کا نہ ختم ہونے والا سر چشمہ ہے ۔ ہمارے ہاں ساحل کے قریب ہر وقت تیز ہوا چلتی ہے ۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ طاقت کے سرچشمے کو 'ہوا چکیوں' کے ذریعے استعمال میں لایا جائے ۔

زراعت :

پاکستان بہت زرخیز علاقہ ہے - ہماری سب سے قیمتی دولت ہماری زرعی پیداوار ہے - ہم اس سے ۷۳ فی صد زرمبادلہ کماتے ہیں - ہم اپنی پیداوار کو صنعت و حرفت میں استعمال کر کے اپنی اندرونی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں -

ہماری زراعت میں سبز انقلاب آ رہا ہے - ہم نے گندم ، چاول ، مکئی کی نئی قسموں کی فصلیں آگانے میں بہت شوق اور محنت سے کام کیا ہے جس کی غیر ملکی ماہرین نے بڑی تعریف کی ہے - اری پاک چاول کا آغاز اصل میں فلپائنز کے جزیروں سے ہوا تھا ، لیکن وہاں اس کی فی ایکڑ پیداوار کی مقدار ۱۳۹ من سے زیادہ نہ بڑھ سکی ، لیکن ہمارے ہاں ایک مخصوص علاقے میں ۱۸۶ من فی ایکڑ کی پیداوار سے نیا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے - میکسی پاک گندم کی وجہ سے بھی ہمارے ہاں پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے - اس کے ایک پودے میں ۱۶ شاخیں اور ایک سٹے میں دانوں کی تعداد ۱۰۸ تک ہوتی ہے - ۷۲-۱۹۷۱ء میں ہمارے ہاں تقریباً پونے چونسٹھ لاکھ ٹن گندم پیدا ہوئی - ۷۳-۱۹۷۲ء میں اس کی مقدار سوا تہتر لاکھ ٹن ہوگئی - توقع ہے کہ ۷۴-۱۹۷۳ء میں گندم کی پیداوار ۸۵ لاکھ ٹن ہو گی -

پیداوار بڑھانے کے لیے مشینی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں - فصلوں کے لیے کیمیائی کھاد کا استعمال روز بروز بڑھ رہا ہے - دس سال پہلے ہم کیمائی کھاد باہر سے منگواتے تھے - آج ہمارے کارخانے کافی مقدار میں کھاد تیار کر رہے ہیں - کیڑے مکوڑوں کو مارنے والی دوائیں تیار کرنے کے کارخانے بھی قائم ہو چکے ہیں - زمینداروں کے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کا استعمال کرکے ان کو بڑے کھیتوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے - کسانوں کو آپس میں مل جل کر امداد باہمی کی انجمنیں بنانے کی ترغیب دی جا رہی ہے - سیم اور تھور

کے روکنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جہاں نہروں کا پانی نہیں ملتا وہاں بڑی تعداد میں ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں اور جن علاقوں میں پانی کی بہت ہی کمی ہے، وہاں خشک فارمنگ کے تجربے کیے جا رہے ہیں ۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم غلے کے بارے میں ایک حد تک خود کفیل ہو گئے ہیں ۔

گندم :

پاکستان بننے سے پہلے یہ علاقہ، برصغیر میں گندم کا گودام کہلاتا تھا ۔ یہ علاقہ برصغیر کے دوسرے علاقوں کو گندم بہم پہنچاتا تھا ۔ کراچی کی بندرگاہ سے یہاں کی گندم انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھی بھیجی جاتی تھی ۔ پاکستان بنا تو بھارت میں گندم کی کمی ہو گئی ۔ اب اسے کروڑوں من غلہ باہر سے منگوانا پڑتا ہے ۔ پاکستان بننے کے بعد شروع میں ہمارے ہاں بھی کچھ عرصے کے لیے گیہوں کی کمی ہو گئی تھی، کیونکہ بھارت نے ہماری ان نہروں کا پانی روک دیا تھا جو بھارت کے علاقے سے نکلتی تھیں ، لیکن ہم نے دریائے جہلم اور سندھ پر نئے بند بنا کر پانی کی اس کمی کو پورا کر لیا ہے ۔ ہمارے ہاں لائل پور کا زرعی کالج جو اب ایک یونیورسٹی بن گیا ہے ، پاکستان بننے سے پہلے ہی گیہوں اور گنے کی نئی نئی قسموں کے تیار کرنے میں بہت مشہور تھا ۔

یہاں زرعی تحقیقات میں بہت اچھا کام ہوا اور یہاں سے پورے برصغیر میں گیہوں اور گنے کی نئی نئی قسموں کا رواج بھی ہوا ۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے زرعی تحقیقات کا کام اور بھی مستعدی سے جاری رکھا ۔ ہم نے میکسی پاک اور دوسری قسم کی گندم کو رواج دیا، جس سے ایک ایکڑ میں پہلے سے دوگنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ گندم پیدا ہونے لگی ۔ ہمارے کسانوں نے بھی نئی قسم کی گندم کی فصلیں تیار کرنے میں بڑے شوق اور محنت سے کام کیا ۔

اس طرح ایک حد تک گندم میں ہم خود کفیل ہو گئے ہیں اور ہمیں کروڑوں روپیہ کے زرمبادلہ کی بچت بھی ہو گئی ہے۔

چاول کے لیے گرم آب و ہوا اور زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پودا اس وقت پھولتا پھلتا ہے، جب اس کی جڑ پانی میں ہو اور اس کا سرا چمکتی ہوئی دھوپ میں۔ بوتے وقت اس کے پودے کو پانی کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ کھیت میں کافی پانی کھڑا رہے۔

پاکستان میں یہ دونوں آسانیاں موجود ہیں، اس لیے یہاں عمدہ قسم کا چاول افراط سے ہوتا ہے۔ اچھا چاول پنجاب میں گوجرانولہ اور شیخوپورہ کے ضلعوں میں اور سندھ کے نہری علاقوں میں ہوتا ہے۔

پاکستان میں لاکھوں ایکڑ زمین ایسی ہے، جہاں ابھی تک نہر کا پانی نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی وہاں ٹیوب ویل لگ سکے ہیں۔ ایسی زمینوں کے لیے ہم فصل اگانے کے ایسے طریقوں پر کام کر رہے ہیں، جہاں پانی کی بہت تھوڑی مقدار سے ہی فصل پیدا ہو سکتی ہے، اس کو خشک فارمنگ کہا جاتا ہے۔ جس وقت ہمارے ہاں یہ طریق کامیاب ہو گیا تو ہم ہر سال اتنی گندم پیدا کر سکیں گے، جسے ہم اپنی ضرورت کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کر سکیں گے۔

گندم کو سردیوں کے شروع میں بویا جاتا ہے، اسے بونے کے وقت نمی اور ٹھنڈے موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی کٹائی گرمیوں کے شروع میں کی جاتی ہے۔ پاکستان کا موسم اس فصل کے لیے بہت موزوں ہے۔

یہاں سردیوں میں ایک آدھ بارش بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کا پودا اور بھی پھولتا پھلتا ہے۔

گندم پنجاب کے تمام علاقوں میں اور سندھ کے نہری علاقوں

میں پیدا ہوتی ہے -

چاول :

پاکستان کا چاول اپنی لذّت ، خوشبو اور خوبصورتی کے لیے تمام دنیا میں مشہور ہے اور اسے عرب اور افریقہ کے ملکوں میں بڑی مقدار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے - اگر آپ چاول کی فصل کے موقعے پر حیدر آباد سے پنجاب کا سفر کریں تو آپ کو بعض علاقوں میں دونوں طرف دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آئیں گے - اس کے پودے پانی میں اور ڈنٹھل دھوپ میں چمک رہے ہوں گے - سندھ اور پنجاب میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے - چونکہ پاکستان کے باشندے چاول زیادہ نہیں کھاتے ، اس کے لیے اس کی بیشتر مقدار برآمد کر دی جاتی ہے - ہم نے چاول کی نئی نئی قسموں کا رواج دے کر چاول کی پیداوار میں بہت اضافہ کیا ہے - اب یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ ایک فصل کی بجائے سال میں چاول کی دو فصلیں تیار کی جائیں - اس سے چاول کی پیداوار میں مزید اضافے کی امید ہے -

کپاس :

پاکستان میں کپاس کا پودا ہزاروں سال سے کاشت کیا جا رہا ہے - موئن جوڈرو میں جو پرانے بت اور مورتیاں ملی ہیں ، ان کے لباس نہایت مہین اور نفیس سوتی کپڑے کے ہیں - دو ہزار سال قبل ، سکندر اعظم کے ساتھ جو لوگ یہاں آئے ، انھوں نے لکھا ہے کہ "اس ملک کے لوگ جادو کے ماہر معلوم ہوتے ہیں ، جو اون کو درختوں پر اگانے کا فن جانتے ہیں -" بات یہ ہے کہ اس وقت تک یونان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگ نہیں جانتے تھے کہ کپڑا اون کے علاوہ روئی سے بھی بنایا جا سکتا ہے -

ہمارے ہاں کپاس کی نئی نئی قسموں کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے جن میں امریکن کپاس زیادہ مشہور ہے - اس سے

ہمیں ایسا ریشہ حاصل ہو رہا ہے جو مہین بھی ہے اور لمبا بھی۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں مصری کپاس کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ اس کا ریشہ بھی بہت لمبا ہوتا ہے اور اس کی دنیا کی منڈیوں میں بہت مانگ ہے۔ ان سے ہمارے کارخانوں میں عمدہ سوتی کپڑا تیار ہوتا ہے، جس کی عرب ممالک، افریقہ اور یورپ میں بہت مانگ ہے۔

ہمارے ہاں مکئی کی کاشت پر بھی خاصی توجہ دی جا رہی ہے اور امریکی مکئی کی نئی قسموں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

گنا:

گنے کی کاشت کو بھی بہت ترقی دی جا رہی ہے۔ ہم گنے کی نئی نئی قسموں سے تجربے کر رہے ہیں۔ نئی قسموں کا گنا موٹا اور لانبا ہوتا ہے اور اس میں رس بھی بہت ہوتا ہے۔ کسان گنے سے گڑ اور دیسی شکر بناتے ہیں۔ جن علاقوں میں چینی کے کارخانے ہیں، وہاں اسے کارخانے کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے۔ گنا پنجاب اور سندھ کے نہری علاقوں اور پشاور کے میدان میں زیادہ کاشت کیا جاتا ہے۔ پچھلے پانچ سال میں گنے کی پیداوار میں تقریباً ڈیڑھ گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں روز بروز چینی کے کارخانوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اب ہم چینی کے معاملے میں خود کفیل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہاں تیل نکالنے والے بیجوں کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور بناسپتی گھی تیار کرنے والے کارخانوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں سویا بین کی کاشت کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ تیل نکالنے کے لیے سورج مکھی کی کاشت پر بھی تجربے کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بہترین قسم کا تمباکو پیدا ہوتا ہے اور امریکہ کے ورجینیا تمباکو کی کاشت میں ہمیں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ پچھلے ۵ سال میں اس کی کاشت میں تقریباً دس گنا اضافہ ہوا ہے، جس سے تمباکو اور سگرٹوں کی برآمد میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔ ویسے تو کسان اپنی ضرورت کے لیے تمباکو کی فصل ہر جگہ

تیار کرتے ہیں لیکن بعض علاقے ، مثلاً کیمبل پور کا ضلع ، اچھے تمباکو کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔

پھل :

ہمارے ہاں صوبہ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بحیرہ روم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں دنیا کے بہترین پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ان دونوں صوبوں میں پھلوں کو محفوظ کرنے کے کارخانے بھی کام کر رہے ہیں۔ پھلوں کی برآمد آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ ہمارے ہاں نہایت اعلیٰ قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان مالٹا اور موسمّی جیسے رسدار (Citrus) پھلوں کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس لیے امید ہے کہ ان کی برآمد مزید بڑھے گی۔

جنگلات کی پیداوار :

پاکستان میں جنگلات کی کمی ہے ، لیکن مری کے پہاڑی علاقے ، ہزارہ ، امب ، دیر اور باجوڑ میں سرد ملکوں کے درختوں کے جنگل موجود ہیں۔ جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے ، وہاں نوکیلے پتوں اور نرم لکڑی کے درخت ہوتے ہیں ، جن میں دیودار ، کیل ، چیڑ اور صنوبر شامل ہیں۔ جہاں بارش کم ہوتی ہے ، وہاں چوڑے پتوں والے درخت مثلاً شاہ بلوط اور اخروٹ کے درخت ملتے ہیں۔ بلوچستان میں چلغوزے کے درخت اور جونیپر پائن پایا جاتا ہے۔ اس سے پنسلیں بنائی جاتی ہیں۔ دیا سلائی کی تیلی نرم لکڑی سے بنائی جاتی ہے۔ پاکستان میں چونکہ ایسی لکڑی کم ملتی ہے اس لیے یہاں گنے سے دیاسلائیاں بنائی جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاں گتے کے کئی کارخانے ہیں جن سے ہم اپنی ضرورت کو گتے کی بنی ہوئی دیاسلائی سے پورا کر سکیں گے۔ جنگلات کی کمی کو بھی پورا کیا جا رہا ہے۔ غلام محمد بیراج اور گدو بیراج کے علاقوں میں وسیع رقبے پر جنگل لگائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ صوبہ پنجاب میں بھی بہت سی جگہ رکھ یا مصنوعی جنگل لگائے گئے ہیں۔ ان جنگلات سے ہمیں

اپنی ضرورت کے لیے گندہ بیروزہ اور سریش بھی حاصل ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس کے دو کارخانے ہیں۔ سوات اور چھانگا مانگا کے جنگلوں سے شہتوت کی لکڑی حاصل ہوتی ہے، جس سے بہترین قسم کا کھیل کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ اس سامان کی باہر کے ملکوں میں بڑی مانگ ہے۔

کاغذ عام طور پر جنگل کی نرم لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جنگلات کی تو کمی ہے لیکن دوسرے خام مواد کی جس سے کاغذ تیار کیا جا سکتا ہے کثرت ہے۔ ہمارے ہاں کاغذ کے جو نئے کارخانے لگائے گئے ہیں وہ اس مقدار میں کاغذ تیار کر رہے ہیں کہ جس سے ہماری عام کاغذ کی ضرورت پوری ہو رہی ہے، اب نیوزپرنٹ بنانے کا کارخانہ بھی لگایا جا رہا ہے۔ اس طرح ہم لکڑی کی کمی کو بھی دوسرے خام مواد سے پورا کر رہے ہیں۔ اگر آپ کسی زیر تعمیر عمارت کا مشاہدہ کریں تو آپ کو اندازا ہوگا کہ آج کل عمارتی لکڑی کی بجائے لوہے اور ہارڈ بورڈ کا استعمال زیادہ کیا جا رہا ہے۔ ایسا خام مواد جس سے ہارڈ بورڈ بن سکتا ہے، ہمارے ہاں کثرت سے پایا جاتا ہے اور پاکستان میں اس کے تیار کرنے کے جو کارخانے لگائے جا رہے ہیں، وہ ہمیں ایک حد تک دوسرے ملکوں کی عمارتی لکڑی کی درآمد سے بے نیاز کر دیں گے۔

ریاست دیر، سوات اور چترال کے پاکستان میں شامل ہونے سے ہمارے جنگلات کا علاقہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس علاقے میں کوئی ۱۷۰۰ مربع میل میں پائن کے قسم کے جنگلات ہیں۔ ان جنگلوں کا ہوائی جہاز کے ذریعے سروے بھی کر لیا گیا ہے اور ان کی پیداوار کے صنعتی استعمال کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ دیر اور باجوڑ کے علاقے میں ہارڈ بورڈ کا ایک بڑا کارخانہ لگانے کی بھی تجویز ہے۔ وادی کاغان میں بھی جنگلات کا بہت بڑا علاقہ ہے۔ ہری پور کے گندہ بیروزہ کے کارخانے کے لیے خام مواد ان ہی جنگلات سے حاصل

کیا جاتا ہے -

مچھلی :

ہمارے ہاں قومی دولت کا ایک ذریعہ مچھلی بھی ہے، ہمارے ہاں سمندری مچھلی بھی ملتی ہے اور دریائی بھی - ہمارے ہاں کی مچھلی کی مشہور قسمیں سر مئی ، روہو اور جھینگا ہے - بحیرہ عرب میں شارک مچھلی بھی پائی جاتی ہے - اس کے پروں کا شوربا بنتا ہے - ان کی عرب ملکوں میں بہت مانگ ہے - پاکستان میں بہت عمدہ قسم کی مچھلی پائی جاتی ہے اور بحیرہ عرب کو دنیا میں اچھی قسم کی مچھلی کا سمندر تصور کیا جاتا ہے - یہاں کی جھینگا مچھلی دوسرے ملکوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے - ہم نے اس کے پکڑنے اور ڈبوں میں بند کرنے کے خاص انتظام کیے ہیں - ماہی گیری کے شعبے کی بہتری کے لیے حکومت بہت سے مفید اقدامات کر رہی ہے - ماہی گیروں کو انجمن امداد باہمی کے ذریعے موٹر بوٹ اور نائلون کے جال مہیا کیے جا رہے ہیں - مچھلی کو محفوظ رکھنے کے لیے سرد خانے قائم کیے جا رہے ہیں -

بحیرہ عرب میں شارک مچھلی بھی بہت ہوتی ہے - اس مچھلی سے بہت عمدہ تیل بنایا جاتا ہے - اب تک ہم کاڈ مچھلی کا تیل باہر سے منگواتے تھے - لیکن اب اس کی جگہ شارک مچھلی کا تیل استعمال کیا جائے گا ، جس سے ہم کافی زر مبادلہ بچا سکیں گے -

سوالات

۱ - ملکی اور قومی ترقی کے لیے تعلیم کیوں ضروری ہے ؟ وضاحت سے روشنی ڈالیے -

۲ - ترقی پذیر ملکوں کے طلبا کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے ؟ اس سلسلے میں پاکستان میں کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں ؟

۳ - حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ، ان کو تفصیل سے لکھیے -

۴ - ملک کو ترقی دینا ، ملک کی اولین ضرورت ہے - اس سلسلے میں اب تک ہماری حکومت نے کیا اقدامات کیے ہیں ؟

عملی کام

ا - جماعت کے طلبا اس موضوع پر ایک مجلس مباحثہ منعقد کریں کہ ملک کے لیے تعلیم بالغاں نہایت ضروری ہے -

ب - آپ اپنے محلے میں تعلیم بالغاں کا مدرسہ قائم کر کے شام کے وقت ناخواندہ لوگوں کو پڑھانے کا بند و بست کریں -

باب ۱۷

ہماری معدنی دولت اور صنعتیں

معدنیات

معدنیات پاکستان کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں ۔ پاکستان پرانے زمانے ہی سے معدنیات کے لیے مشہور ہے ۔ کھیوڑہ کی نمک کی کان دنیا کا دوسرا عظیم ترین ذخیرہ ہے ۔ یہاں سکندر اعظم کے حملے کے وقت سے پہلے بھی نمک نکالا جاتا رہا ہے اور اندازا لگایا گیا ہے کہ نمک کا یہ ذخیرہ پاکستان کے لیے آئندہ دو ہزار سال تک کے لیے کافی ہو گا ۔ سکندر اعظم کی فوج کے ہمراہ جو مؤرخ آئے ، انھوں نے بلوچستان میں سونے کی کانوں کے بڑے دلچسپ قصے لکھے ہیں ۔ گلگت کے علاقے میں آج بھی دریائے سندھ کی ریت سے سونا حاصل کیا جاتا ہے ۔ یہاں کے فولاد سے بنی ہوئی تلواریں ، پرانے زمانے میں بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں ۔ فولاد سازی کی صنعت کالا باغ اور کیمبل پور کے علاقے میں بہت فروغ پر تھی ۔ سندھ کا صوبہ انگریزوں کے زمانے تک شورے کی پیداوار کے لیے بہت مشہور رہا ہے ۔ انگریزوں کے تجارتی جہاز یہاں سے بھاری مقدار میں شورہ لے جاتے تھے اور اس سے بارود بناتے تھے ۔

انگریزی حکومت نے اس خطّے کی معدنی دولت کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا ۔ قیام پاکستان کے وقت سے معدنیات کی دریافت کا کام بہت زوروں سے شروع کیا گیا ۔ اس تلاش میں غیر ملکی کمپنیوں اور ان کے ماہرین سے بھی امداد لی گئی ہے ۔ آج کل معدنیات کی

تلاش میں نئے نئے آلات اور مشینوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ معدنی دریافت کے جدید طریقوں میں ترتیب کے لیے ارضیات کا ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اس علم کے شعبے قائم کیے گئے ہیں، تاکہ سائنس کے طالب علموں کو اس کام کی عملی تعلیم دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سی جگہ تیل، کوئلہ اور سنگ مرمر کی کانیں دریافت ہو گئی ہیں اور پچھلے دس سالوں میں ہماری کانوں کی پیداوار پہلے سے دوگنی ہو گئی ہے۔

پاکستان میں تقریباً بیس قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم قدرتی گیس اور تیل ہیں۔ جنوبی ایشیا میں سعودی عرب سے لے کر، خلیج فارس کی عرب مملکتوں اور ایران سے ہوتا ہوا ایک خطہ چلا گیا ہے، جس کی سطح کے نیچے تیل کا ایک بے پناہ سمندر لہریں مار رہا ہے۔ آج دنیا میں یہ علاقے تیل کی پیداوار میں نمایاں حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پاکستان بھی اس خطے میں شامل ہے۔ ہمارے ہاں ضلع کیمبل پور میں تیل اس صدی کے شروع سے ہی نکالا جا رہا ہے۔

نمک:

پاکستان میں معدنی نمک کی چھے کانیں ہیں۔ کھیوڑہ کی کان دنیا کی سب سے بڑی کانوں میں سے ہے۔ یہ نمک عمدہ قسم کا ہے۔ بھارت سے سکھ یاتری جب یہاں آتے ہیں تو وہ اسے تحفے کے طور پر لے جاتے ہیں کیونکہ بھارت میں کان کا نمک نہیں ہوتا۔

تھرپارکر (سندھ) کے علاقے میں میلوں تک ایسی زمین چلی گئی ہے، جس کی سطح کے چند فٹ نیچے نمک کی موٹی تہ موجود ہے۔ لیکن ابھی تک اس نمک کو نکالا نہیں گیا۔ کراچی کے قریب ماڑی پور میں سمندر کے پانی سے بڑی مقدار میں نمک تیار کیا جا رہا ہے۔

سمندری نمک :

علم ارضیات کے ماہر ، معدنیات کی تلاش میں پہاڑیوں اور وادیوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں ۔ انھیں پوٹھوار کی سطح مرتفع میں ایسے آثار ملے ہیں ، جن سے پتا چلتا ہے کہ ایک زمانے میں یہاں سمندر تھا ۔ وہ خشک ہوا تو زمین نکل آئی ۔ اس وادی میں کہیں کہیں سمندری نمک کے بڑے قیمتی ذخائر موجود ہیں ۔ ان میں سے دھریالہ ضلع جہلم میں ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا ہے ، جس میں اڑھائی کروڑ بیرل کے قریب سمندری نمک موجود ہے ۔ اس میں سوڈیم ، کیلشیم ، میگنیشیم اور پوٹاشیم جیسی قیمتی دھاتوں کے نمک بھی پائے جاتے ہیں ۔ اگر یہاں کیمیائی اشیا تیار کرنے کا ایک کارخانہ لگا دیا جائے تو اس سمندری نمک سے ہمیں بہت سی ایسی کارآمد اشیا دستیاب ہو سکتی ہیں جو ہم غیر ملکوں سے منگواتے ہیں ۔

جپسم :

پاکستان میں جپسم کے بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں ۔ یہ ذخیرے کوہستان نمک ، قبائلی علاقے اور لورالائی کے ضلع میں پائے جاتے ہیں ۔ جپسم کا پتھر اوپر کی سطح پر پایا جاتا ہے ۔ یہ کیمیائی لحاظ سے بڑی کارآمد چیز ہے ۔ ہمارے ہاں داؤد خیل کے کارخانوں میں اس سے سیمنٹ اور کھاد تیار کی جاتی ہے ۔ ابھی تک ہم اس معدنی پیداوار کو پورے طور پر اپنے کارخانوں میں استعمال نہیں کر سکے اور اس کی بڑی مقدار برآمد کی جا رہی ہے ۔ لیکن وہ دن دور نہیں ، جب ہم اسے خام صورت میں برآمد کرنے کی بجائے اس سے سیمنٹ اور کھاد بنا کر غیر ملکوں کو بھیجا کریں گے ۔

چونے کا پتھر :

ہمارے ہاں چُونے کا پتھر بھی بہت بڑی مقدار میں ملتا ہے ۔ قدیم زمانے سے اس کو کوئلے کے ساتھ جلا کر چونا بنایا جاتا ہے ۔

ہماری پرانی عمارتوں میں چونا ہی استعمال کیا جاتا تھا ۔ چونے کا پتھر بہت کارآمد چیز ہے ۔ اسے سوڈا ایش ، چینی ، کاغذ اور فولاد سازی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں اس کے ایسے بے شمار ذخائر ہیں ، جو ایک طویل مدت تک کام دے سکتے ہیں ۔

کرومائیٹ :

ہمارے ہاں کرومیم کا ایک مرکب پایا جاتا ہے ، جو ہندوباغ ، وزیرستان ، ژوب اور خاران کے علاقوں میں ملتا ہے ۔ کرومیم نہایت کارآمد دھات ہے ، جسے فولاد کو سخت بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس سے ہم ایسا فولاد تیار کر سکتے ہیں ، جو ملک کے لیے دفاعی سامان بنانے میں امداد دے سکے ۔ اس دھات سے بڑے عمدہ قسم کے رنگ بھی تیار کیے جاتے ہیں ۔ ابھی تک ہم کوئی ایسا کارخانہ نہیں لگا سکے ، جس سے ہم کرومائیٹ کا کیمیائی استعمال کر سکیں ، اس لیے ہمیں اس بیش بہا معدنی دولت کو خام صورت ہی میں دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتا ہے ۔

گندھک :

بلوچستان کے کوہ سلطان اور دوسرے حصوں میں گندھک کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں ۔ گندھک بارود کا ایک جزو ہے ، اس لیے ملکی دفاع کے لیے اس کی خاص اہمیت ہے ۔ اس کے علاوہ اس کی مدد سے گندھک کا تیزاب اور ایسی کیمیائی اشیا تیار ہو سکتی ہیں ، جو ہمارے ملک میں ایک کیمیائی اور صنعتی انقلاب لا سکتی ہیں ۔ ہمارے ہاں گندھک ناصاف حالت میں ملتی ہے ، لٰہذا ہمیں ایسے طریقے معلوم کرنے کی ضرورت ہے ، جن سے اس کا میل کچیل دور کر کے اس کو صاف کیا جا سکے ۔ ہمارے ماہرین اس پر کام کر رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں ، جب ہم اپنی ضرورت کے لیے گندھک خود تیار کر لیا کریں گے ۔

ہمارے ہاں سفید اور چینی مٹی بہت ملتی ہے۔ شروع میں ان سے جو برتن بنائے جاتے تھے، وہ اتنے خوبصورت نہیں ہوتے تھے، لیکن اب ہمارے ہاں اس مٹی سے بنے ہوئے برتنوں کا معیار بہت اونچا ہو گیا ہے۔

ہمارے ہاں شیشہ ریت بھی کافی مقدار میں ملتی ہے۔ اس کے ذخیرے کراچی کے نزدیک پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ زیارت، دادو، ڈیرہ اسماعیل خاں اور ہزارہ میں بڑی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اس سے جو شیشہ تیار ہوتا ہے، وہ ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

سوئی گیس :

بلوچستان میں تیل کی تلاش کرتے کرتے سوئی کے مقام پر تیل کی بجائے قدرتی گیس نکل آئی، جسے آگ دی گئی تو اس کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہمارے ہاں معدنیات کی تلاش میں سوئی گیس کی دریافت سب سے اہم ہے۔ اس گیس کو نلوں کے ذریعے ایک طرف تو کراچی تک پہنچا دیا گیا ہے اور شمال میں اس کے پائپ لاہور، لائل پور اسلام آباد اور پشاور تک پہنچ گئے ہیں۔ قدرتی گیس کا یہ ذخیرہ دنیا کے بڑے ذخیروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے کارخانے بھی چلائے جا رہے ہیں اور یہ گھروں میں ایندھن کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔

پاکستان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ اگر ہم اپنی زراعت کو ترقی دیں تو کسی چیز کے لیے بھی ہمیں دوسرے ملکوں کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں۔ زرعی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ کیمیائی کھاد کی ضرورت ہے۔ ملتان کے کھاد کے کارخانے میں سوئی گیس سے امونیم سلفیٹ تیار کی جا رہی ہے، جو نہایت عمدہ قسم کی کھاد ہے۔ ملتان کے ایک کارخانے میں اسی گیس سے

بجلی بھی تیار کی جا رہی ہے ۔ یہ بجلی بیسیوں شہروں اور قصبوں، ٹیوب ویل اور زرعی فارموں کو مہیا کی جا رہی ہے ۔ اس گیس سے اور بھی بیسیوں قسم کی کیمیائی اشیا اور مصنوعات بن سکتی ہیں ۔ ان پر تحقیقات ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں، جب ہم اپنی گیس کی تمام سپلائی کو کارآمد مصنوعات بنانے میں استعمال کر سکیں گے ۔

کوئلہ

پاکستان میں بلوچستان، پنجاب اور سندھ میں کئی جگہ کوئلہ پایا جاتا ہے اور دوسری کانوں کی تلاش جاری ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا، ڈیرہ غازی خان کے ضلع میں کوئلے کی کان دریافت ہوئی تھی، جس سے کوئلے کی برآمد بھی شروع ہو گئی ہے ۔ ہمارے ہاں کوئلہ خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے اور مکڑوال کی طرح بعض کانیں تو ایسی ہیں کہ ان کے اندر کوئلہ کھودنے کی سرنگیں ایک ایک میل تک چلی گئی ہیں، لیکن ابھی تک ہمارے ہاں اچھی قسم کا ایسا کوئلہ دریافت نہیں ہوا، جسے انجنوں میں استعمال کیا جاسکے ۔ اس کو زیادہ تر بھٹیوں اور اینٹیں پکانے والے بھٹوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ چونکہ یہ کوئلہ اکثر ٹھوس ڈلوں کی شکل میں نہیں، بلکہ بھربھرا ہوتا ہے، اس لیے اس کے ڈلے یا اینٹیں بنانے کے لیے کوئٹہ میں ایک کارخانہ لگایا گیا ہے ۔

اگرچہ پاکستان میں تیل اس صدی کے شروع سے ہی نکالا جا رہا ہے، لیکن کنوؤں کی دریافت میں جو ترقی پاکستان بننے کے بعد ہوئی، وہ یقیناً حیرت انگیز ہے ۔ پاکستان بننے کے بعد ہی بلکسر میں تیل کے نئے ذخائر دریافت کیے گئے ۔

۱۹۵۲ء میں سوئی گیس دریافت ہوئی تو اس کے بعد قدرتی گیس کے میدانوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ چنانچہ اس گیس کے دس اور ذخیرے دریافت کیے گئے ہیں ۔ ۱۹۶۹ء میں ڈھولیاں کے

مقام پر تیل کا ایک نیا کنواں دریافت کیا گیا ، جس میں سے روزانہ ۱۶۰۰ بیرل تیل نکالا جا رہا ہے ۔ اس طرح پوٹھوار کی سطح مرتفع میں میال کے مقام پر تیل کا ایک اور کنواں دریافت ہوا ہے ، جس سے روزانہ دو ہزار بیرل تیل نکلنے کی امید ہے ۔

سنگِ مرمر

آپ نے بعض عمارتوں میں سفید یا رنگین سنگ مرمر دیکھا ہوگا ۔ یہ رنگا رنگ قسم کا سنگ مرمر پاکستان کی کانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے ۔

پاکستان بننے کے بعد ہمارے ہاں سے کئی جگہوں پر سنگ مرمر کی دریافت ہوئی ہے ۔ اس کی کانیں پشاور اور بلوچستان کے علاقوں میں پائی جاتی ہیں ۔ سندھ کے ضلع دادو میں بھی اس کی ایک کان ہے ۔ اس سنگ مرمر کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں گونا گوں رنگوں کی خوبصورت لہریں پائی جاتی ہیں ۔ اس لیے اس کو دوسرے ملکوں میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں کے سنگ مرمر کے بڑے خریدار اٹلی اور جاپان ہیں ۔

صنعت و حرفت

پاکستان نے صنعت و حرفت میں جو نمایاں ترقی کی ہے، وہ کسی دوسرے شعبے میں کم ہوئی ہوگی ۔ انگریزی دورِ حکومت میں پاکستان صرف فوجی بھرتی اور انگلستان کے لیے گندم پیدا کرنے والا علاقہ تھا ۔ جب پاکستان بنا تو سارے پاکستان میں محض ۳۴ کارخانے تھے ، جن میں ۲۶ ہزار سے زیادہ مزدور کام نہیں کرتے تھے ۔ اگرچہ پاکستان بڑی مقدار میں کپاس پیدا کرتا تھا ، لیکن یہاں کپڑا بُننے کے صرف تین کارخانے تھے ۔ یہاں کی تمام کپاس انگلستان اور بھارت کے کارخانوں میں استعمال کی جاتی تھی ۔

۱۹۵۱ء تک پاکستان کی پیداوار کا ۹۵ فی صد خام شکل میں غیر ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا ، لیکن آج ہم صرف ۴۵ فی صد پیداوار برآمد کرتے ہیں اور باقی اپنے کارخانوں میں استعمال کرتے ہیں ، جس سے ہماری مصنوعات کی برآمد میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور ہم اس سے بھاری زرمبادلہ کما رہے ہیں ۔

ابتدا میں ہم گھریلو ضروریات کی چیزیں باہر کے ملکوں سے منگواتے تھے ۔ ہمارے کارخانوں نے پہلے پہل عام استعمال کی چیزیں تیار کرنا شروع کیں ، لیکن اب ہم کارخانوں میں ایسی چیزیں تیار کرنے لگے ہیں جن سے ہماری زراعت اور صنعت و حرفت کو ترقی ہو رہی ہے ۔ ان میں کیمیائی کھاد ، سیمنٹ ، کاغذ ، بجلی کے تار اور دوسرا سامان اور کیمیائی اشیا شامل ہیں ۔ ہم بھاری مشینیں اور فولادسازی پر خاص توجہ دے رہے ہیں ، جس سے ہم اس زرمبادلہ کو بچاسکیں گے ، جو ہم کارخانوں کی مشینیں خریدنے پر خرچ کر رہے تھے ۔

کپڑے کے کارخانے

پارچہ بافی ہمارے ملک کی سب سے بڑی صنعت ہے ۔ اس میں دو لاکھ کے قریب آدمی کام کرتے ہیں اور اس سے ہمیں صنعتی آمدنی کا ۳۰ فی صد حاصل ہوتا ہے ۔

اگرچہ قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کپڑے کے کارخانے بہت کم تھے، مگر اب ہمارے ہاں ۳۸ ہزار کرگھے ہیں ۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں ۷۵ کروڑ گز کے قریب کپڑا تیار کیا گیا ۔ اس کے علاوہ کوئی ۴۷ کروڑ پاؤنڈ سے زیادہ کا دھاگہ تیار کیا جاتا ہے ۔

پاکستان کا کپڑا دوسرے ملکوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی خریداری عرب ممالک اور افریقہ کے علاوہ

یورپی ممالک میں بھی ترقی کر رہی ہے - ہم آر - سی - ڈی ملکوں کے اشتراک سے کپڑے کے کارخانوں کی مشینوں کا کارخانہ لگا رہے ہیں - سعودی عرب کے ساتھ مل کر وہاں کپڑے کا کارخانہ لگانے کے منصوبے پر بھی کام ہو رہا ہے -

پاکستان میں پٹ سن تو پیدا نہیں ہوتی ، لیکن اسی قسم کا ایک اور ریشہ تمام نہری علاقوں میں پیدا ہوتا ہے - یہ سن اور سنکڑا ہے - سن کا ریشہ مضبوطی اور رنگ میں پٹ سن سے بالکل ملتا جلتا ہے اور اس سے وہ تمام چیزیں بن سکتی ہیں جو پٹ سن کے ریشے سے تیار کی جاتی ہیں - آج کل تقریباً ہر کسان اپنی ضروریات کے لیے سن پیدا کرلیتا ہے ، جس سے رسے اور چار پائیاں بننے کا بان وغیرہ بنائے جاتے ہیں - چونکہ پہلے پٹ سن کی بوریاں عام ملتی تھیں ، اس لیے اس سے اب تک بوریاں نہیں بنائی جاتی تھیں ، لیکن اب ہمارے ہاں اس ریشے کو بڑے پیمانے پر پیدا کرنے کے منصوبوں پر عمل کیا جا رہا ہے - ۱۹۷۲ء میں دو ہزار ایکڑ میں پٹ سن کی کاشت کی گئی - ۱۹۷۳ء میں دس ہزار ایکڑ زمین پر اس کی کاشت کی گئی ، جس سے بہت حد تک پٹ سن کی ضرورت پوری ہو جائے گی - لائل پور میں مصنوعی دھاگے سے بوریاں بنانے کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے - پٹ سن کی بوریوں کی جگہ موٹے کپڑے کے بوروں سے بھی کام لیا جا رہا ہے - یہ کام جس تیزی سے کیا جا رہا ہے - اس سے قوی امید ہے کہ آئندہ چل کر ہمیں باہر سے پٹ سن کی بوریاں برآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی -

کیمیائی کھاد

پاکستان ایک زرعی ملک ہے - ہمیں زراعت کی ترقی کے لیے کیمیائی کھاد کی بڑی ضرورت ہے - شروع میں ہمارے ہاں کیمیائی کھاد بنانے کا ایک کارخانہ بھی نہ تھا اور ہم اسے دوسرے ملکوں سے درآمد

کرتے تھے ، لیکن ہمارے ہاں جپسم اور سوئی گیس ایسی کارآمد معدنی پیداوار ہیں ، جن سے عمدہ قسم کی کھاد تیار ہو سکتی ہے ۔ داؤد خیل کے کارخانے میں جپسم سے کھاد بنائی جاتی ہے اور ملتان اور ماری کے کارخانوں میں سوئی گیس سے ۔ دھریالہ ضلع جہلم میں سمندری نمک کا جو نیا ذخیرہ دریافت ہوا ہے وہاں پوٹاش سے کھاد بنانے کا ایک کارخانہ بنایا جا رہا ہے ۔

پٹرول

ہمارے ہاں تیل کی اتنی پیداوار نہیں جو ملکی ضرورت کو پورا کرسکے ، اس لیے ہمیں ایران اور خلیج فارس کے ملکوں سے تیل منگوانا پڑتا ہے ۔ پہلے ہم باہر سے صاف تیل منگواتے تھے جو مہنگا پڑتا تھا ۔ اب ہم باہر سے ناصاف تیل منگواتے ہیں ، اسے صاف کرنے کے لیے ہمارے ہاں تین کارخانے ہیں ، دو کراچی میں اور ایک راولپنڈی میں ۔ اب ایک اور کارخانہ ملتان میں لگائے جانے کی توقع ہے ۔ اس سے ہمیں زرمبادلہ کی کافی بچت ہو گئی ہے ۔ پٹرول سے بہت سی دیگر کارآمد اشیا بھی بنتی ہیں ۔ پٹرول سے کیمیائی چیزیں بنانے کا ایک بڑا منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے ، جو کئی سال میں مکمل ہو گا ۔ ہمیں اس کارخانے کو لگانے میں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ دنیا کا ایک بڑا پٹرول پیدا کرنے والا ملک ایران آر ۔ سی ۔ ڈی کے ادارے کا رکن ہے ، اس کی وجہ سے ہمیں اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بہت آسانیاں ہوں گی ۔

سیمنٹ

ہماری معدنی پیداوار میں جپسم اور چونے کے پتھر کو خاصی اہمیت حاصل ہے ۔ ان سے سیمنٹ تیار کیا جاتا ہے ، اس لیے پاکستان میں سیمنٹ کے بہت سے کارخانے قائم کیے گئے ہیں ۔

۷۳-۱۹۷۲ء میں ہمارے ہاں تقریباً ۲۵ لاکھ ٹن سے زیادہ سیمنٹ تیار کیا گیا ۔ شروع شروع میں ہمیں اپنی ضرورت کے لیے سیمنٹ باہر سے منگوانا پڑتا تھا ۔ نئے کارخانے قائم کرنے پر بڑا خرچ ہوتا ہے ، اس لیے ہم پرانے کارخانوں میں ہی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اس وجہ سے اب بعض کارخانوں میں سیمنٹ دگنی بلکہ تگنی مقدار میں تیار ہو رہا ہے ۔ کچھ عرصے تک ہمیں سفید سیمنٹ جو پانی کی تہ کے نیچے بھی جم جاتا ہے باہر سے منگوانا پڑتا تھا ، مگر اب داؤد خیل میں اس کا کارخانہ قائم ہونے سے ہماری یہ ضرورت بھی پوری ہوگئی ہے ۔

کاغذ

پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہاں کاغذ کا کوئی کارخانہ نہیں تھا ۔ پاکستان میں جنگلات کی کمی تو ہے ، لیکن یہاں بعض ایسی اشیا دستیاب ہوتی ہیں، جن سے اعلیٰ قسم کا کاغذ تیار کیا جاتا ہے ۔ لاہور میں پیکیجز (Packages) کے کارخانے میں بھوسے سے بہت اچھا کاغذ تیار کیا جا رہا ہے ۔ نوشہرہ اور راہوالی کے کارخانوں میں گتا بنایا جا رہا ہے ۔ چارسدہ میں کاغذ سازی کا ایک نیا کارخانہ لگایا گیا ہے ، جس میں کاغذ بنانے کے لیے گنے کی کھوری یا چھلکے کو کام میں لایا جا رہا ہے ۔ اب تک چھلکا صرف جلانے کے کام آتا تھا ، لیکن اب ہم اس بیکار چیز کو کام میں لا کر پاکستان میں عام کاغذ کی ضرورت کو پورا کر سکیں گے ۔ اخباری کاغذ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حیدرآباد میں ایک کارخانہ بنایا جا رہا ہے ، جس میں گنے کا چھلکا استعمال کیا جائے گا ۔ یہ کارخانہ پاکستان میں اخباری کاغذ کی ضرورت کو مکمل طور پر پورا کرسکے گا ۔

چمڑے کی چیزیں

پاکستان میں چمڑا صاف کرنے کے ۸۰ سے زیادہ کارخانے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کام کو گھریلو دستکاری کے طور پر بھی کیا جاتا

ہے - ہمارے ہاں جوتا سازی کا معیار بہت بلند ہے اور ہمارے ہاں کے بنے ہوئے جوتوں کی عرب ممالک اور افریقہ میں بڑی مانگ ہے -

چینی

پاکستان کی آب و ہوا گنے کی پیداوار کے لیے نہایت موزوں ہے - ہمارے ہاں ملک کے طول و عرض میں چینی کے کئی کارخانے قائم ہوگئے ہیں اور پرانے کارخانوں کو توسیع دی جا رہی ہے - ان اقدامات کی وجہ سے ہم چینی میں خود کفیل ہو چکے ہیں -

ہمارے ہاں کے میوے اور سبزیاں دنیا کے بہترین پھلوں کا مقابلہ کرتی ہیں - لیکن اب تک ہم پھلوں کو ڈبوں میں محفوظ کرنے کی صنعت کو خاطر خواہ ترقی نہیں دے سکے ، تاہم ملک بھر میں چھوٹے بڑے دو سو کارخانے اس صنعت کا کام کر رہے ہیں -

بناسپتی گھی

پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہاں بناسپتی گھی تیار کرنے کے صرف دو کارخانے تھے - جن میں سالانہ نو ہزار ٹن گھی تیار ہوتا تھا ، لیکن اب ہمارے ہاں بہت سے کارخانے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲-۷۳ء میں بناسپتی گھی کی سالانہ پیداوار ایک لاکھ ۶۰ ہزار ٹن تک پہنچ گئی - بناسپتی گھی کی صنعت کو اب حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے -

کھیلوں کا سامان اور جہاز سازی

پاکستان میں جراحی اور کھیل کا سامان بھی عمدہ تیار ہوتا ہے - اس کا بڑا مرکز سیالکوٹ ہے - پاکستان نے ۱۹۷۳-۷۴ء میں ۱۸ کروڑ روپے سے زیادہ کا کھیلوں کا سامان اور تقریباً ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کا جراحی کا سامان برآمد کیا -

پاکستان نے اگرچہ صنعت و حرفت میں بڑی ترقی کی ہے، لیکن ابھی تک ہم کارخانوں کے لیے مشینیں باہر سے منگواتے رہے ہیں، جس پر بھاری زرمبادلہ صرف آتا رہا ہے۔ اب چین کی امداد سے ہم نے ٹیکسلا میں بھاری مشینیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا ہے جس میں کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس کارخانے میں چینی اور سیمنٹ کے کارخانوں کے لیے بھاری مشینیں بنائی جا رہی ہیں۔ یہاں سڑک کوٹنے والے انجن اور انجنوں کے بوائلر بھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح اگرچہ ہمارے ہاں بجلی کا چھوٹا سامان بنانے کے کارخانے موجود ہیں، لیکن اب تک ہمارے ہاں ایک کارخانہ بھی ایسا نہیں تھا، جس میں بجلی کی بڑی مشینیں بنائی جاسکیں۔ چین ہمیں ایسا کارخانہ بنانے میں بھی مدد دے رہا ہے۔

پاکستان نے جہاز سازی کی صنعت میں کافی ترقی کی ہے۔ کراچی کے شپ یارڈ میں ۱۳ ہزار ٹن تک کے تجارتی جہاز بن سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا اس کارخانے نے "العباس" نام کا ایک جہاز بنایا جو ۱۲۸۶۰ ٹن وزن اٹھا سکتا ہے۔ اب تیرہ ہزار ٹن کا جہاز "لالہ زار" تیار کیا گیا ہے۔ ایشیا میں اتنے بڑے جہاز سوائے جاپان کے کسی اور ملک میں تیار نہیں ہوتے۔ یہ شپ یارڈ نہ صرف ملکی ضروریات کے لیے، بلکہ دوسرے ملکوں کے لیے بھی جہاز تیار کرتا ہے۔ مثلاً یہاں ایران کے لیے ماہی گیری کی کشتیاں تیار ہو رہی ہیں۔ اس میں بھاپ سے چلنے والے تیل بردار جہاز، ۲۵۰ سواریاں لے جانے والی کشتیاں، بوجھ لادنے والے بجرے اور لانچیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہاں بوجھ اٹھانے والے اتنے بڑے کرین تیار کیے جاتے ہیں، جو ۳۰ سے ۴۰ ٹن تک کا وزن اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں چینی بنانے کے کارخانوں کے لیے مشینیں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ اب ایک غیر ملکی کمپنی کے اشتراک سے چھوٹے جہازوں کے لیے ڈیزل انجن بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ اس شپ یارڈ کو مسلسل توسیع

دی جا رہی ہے اور جب اس کا منصوبہ مکمل ہو گیا تو اس میں بیک وقت تین نئے جہاز بن سکیں گے اور تین سو جہازوں کی مرمت ہو سکے گی ۔

تمام کارخانے زیادہ تر صنعت کار خود قائم کرتے ہیں لیکن بعض کارخانے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے ، جسے صنعت کار فراہم نہیں کر سکتا ۔ بعض صنعتوں میں اتنی اعلٰی اور پیچیدہ قسم کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کہ تمام صنعت کار ایسے ماہرین کے خرچ کے متحمل نہیں ہوسکتے ۔ صنعت کار زیادہ سرمایہ ایسے کارخانوں میں لگاتے ہیں ، جن کی پیداوار میں منافع زیادہ ہوتا ہے اور ایسی صنعتوں میں جن میں زیادہ منافع کی امید نہیں ہوتی، سرمایہ لگانے سے ہچکچاتے ہیں ۔ پاکستان میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں ، جہاں صنعت کاروں کی ویسے ہی کمی ہے اور وہاں کارخانوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے ۔ حکومت نے ان کمیوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام (PIDC) یعنی پاکستان انڈسٹریل ڈیلوپلمنٹ کارپوریشن ہے ۔ اس ادارے کے تحت ۵۵ کارخانوں کے منصوبے مکمل ہو چکے ہیں ، اس کے کارخانوں میں ملتان کا کھاد کا کارخانہ ، داؤد خیل کا کھاد اور ادویات کا کارخانہ ، ٹیکسلا کی بھاری مشینوں کا کارخانہ ، کراچی کا مشینی اوزاروں کا کارخانہ ، کراچی کا جہازوں کا کارخانہ اور اس طرح کے بہت سے کارخانے ہیں ۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں ہزاروں لوگ گھریلو صنعتوں اور دستکاری کے ذریعہ ملکی پیداوار میں اضافہ کر رہے ہیں ۔ ان کی راہنمائی اور امداد کے لیے حکومت نے (PSIC) یعنی پاکستان سمال انڈسٹریز کارپوریشن کا ادارہ قائم کیا ہے۔یہ ادارہ ۸۰ سے زیادہ منصوبے چلا رہا ہے ۔ یہ ادارہ صنعتی پیداوار کی فروخت کے لیے دستکاری کی دکانیں قائم کرتا ہے ، نیز دستکاروں کو ڈیزائن اور دستکاری سکھانے

پاکستان نے اگرچہ صنعت و حرفت میں بڑی ترقی کی ہے، لیکن ابھی تک ہم کارخانوں کے لیے مشینیں باہر سے منگواتے رہے ہیں، جس پر بھاری زرمبادلہ صرف آتا رہا ہے۔ اب چین کی امداد سے ہم نے ٹیکسلا میں بھاری مشینیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا ہے جس میں کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس کارخانے میں چینی اور سیمنٹ کے کارخانوں کے لیے بھاری مشینیں بنائی جا رہی ہیں۔ یہاں سڑک کوٹنے والے انجن اور انجنوں کے بوائلر بھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح اگرچہ ہمارے ہاں بجلی کا چھوٹا سامان بنانے کے کارخانے موجود ہیں، لیکن اب تک ہمارے ہاں ایک کارخانہ بھی ایسا نہیں تھا، جس میں بجلی کی بڑی مشینیں بنائی جاسکیں۔ چین ہمیں ایسا کارخانہ بنانے میں بھی مدد دے رہا ہے۔

پاکستان نے جہاز سازی کی صنعت میں کافی ترقی کی ہے۔ کراچی کے شپ یارڈ میں ۱۳ ہزار ٹن تک کے تجارتی جہاز بن سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا اس کارخانے نے ''العباس'' نام کا ایک جہاز بنایا جو ۱۲۸۶۰ ٹن وزن اٹھا سکتا ہے۔ اب تیرہ ہزار ٹن کا جہاز ''لالہ زار'' تیار کیا گیا ہے۔ ایشیا میں اتنے بڑے جہاز سوائے جاپان کے کسی اور ملک میں تیار نہیں ہوتے۔ یہ شپ یارڈ نہ صرف ملکی ضروریات کے لیے، بلکہ دوسرے ملکوں کے لیے بھی جہاز تیار کرتا ہے۔ مثلاً یہاں ایران کے لیے ماہی‌گیری کی کشتیاں تیار ہو رہی ہیں۔ اس میں بھاپ سے چلنے والے تیل بردار جہاز، ۲۵۰ سواریاں لے جانے والی کشتیاں، بوجھ لادنے والے بجرے اور لانچیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہاں بوجھ اٹھانے والے اتنے بڑے کرین تیار کیے جاتے ہیں، جو ۳۰ سے ۴۰ ٹن تک کا وزن اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں چینی بنانے کے کارخانوں کے لیے مشینیں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ اب ایک غیر ملکی کمپنی کے اشتراک سے چھوٹے جہازوں کے لیے ڈیزل انجن بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ اس شپ یارڈ کو مسلسل توسیع

دی جا رہی ہے اور جب اس کا منصوبہ مکمل ہو گیا تو اس میں بیک وقت تین نئے جہاز بن سکیں گے اور تین سو جہازوں کی مرمت ہو سکے گی۔

تمام کارخانے زیادہ تر صنعت کار خود قائم کرتے ہیں لیکن بعض کارخانے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے صنعت کار فراہم نہیں کر سکتا۔ بعض صنعتوں میں اتنی اعلیٰ اور پیچیدہ قسم کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کہ تمام صنعت کار ایسے ماہرین کے خرچ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ صنعت کار زیادہ سرمایہ ایسے کارخانوں میں لگاتے ہیں، جن کی پیداوار میں منافع زیادہ ہوتا ہے اور ایسی صنعتوں میں جن میں زیادہ منافع کی امید نہیں ہوتی، سرمایہ لگانے سے ہچکچاتے ہیں۔ پاکستان میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں، جہاں صنعت کاروں کی ویسے ہی کمی ہے اور وہاں کارخانوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے۔ حکومت نے ان کمیوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام (PIDC) یعنی پاکستان انڈسٹریل ڈیلویلپمنٹ کارپوریشن ہے۔ اس ادارے کے تحت ۵۵ کارخانوں کے منصوبے مکمل ہو چکے ہیں، اس کے کارخانوں میں ملتان کا کھاد کا کارخانہ، داؤد خیل کا کھاد اور ادویات کا کارخانہ، ٹیکسلا کی بھاری مشینوں کا کارخانہ، کراچی کا مشینی اوزاروں کا کارخانہ، کراچی کا جہازوں کا کارخانہ اور اس طرح کے بہت سے کارخانے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں ہزاروں لوگ گھریلو صنعتوں اور دستکاری کے ذریعہ ملکی پیداوار میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کی راہنمائی اور امداد کے لیے حکومت نے (PSIC) یعنی پاکستان سمال انڈسٹریز کارپوریشن کا ادارہ قائم کیا ہے۔یہ ادارہ ۸۴ سے زیادہ منصوبے چلا رہا ہے۔ یہ ادارہ صنعتی پیداوار کی فروخت کے لیے دستکاری کی دکانیں قائم کرتا ہے، نیز دستکاروں کو ڈیزائن اور دستکاری سکھانے

کے مرکز بھی کھولتا ہے۔

PITAC یا پاکستان کا انڈسٹریل ٹریننگ کا امدادی سنٹر پیداواری طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ کارخانوں اور صنعت میں کام کرنے والوں کے لیے تربیت کی سہولت مہیا کرتا ہے۔

یہ مرکز زیادہ تر دھاتوں پر کام کرنے والے کارخانوں کے لیے تربیت فراہم کرتا ہے اور ان کے لیے مشینوں کے پرزوں کے ڈیزائن اور سانچے تیار کرتا ہے۔

سوالات

۱ - پاکستان میں کون کون سی معدنیات نکالی جاتی ہیں اور ان سے صنعت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟

۲ - چینی اور کپڑے کے کارخانے ہمارے ملک میں کیوں زیادہ لگائے گئے ہیں ؟

۳ - کاغذ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم نے کون کون سے وسائل اختیار کیے ہیں ؟

۴ - کارخانوں کو چلانے کے لیے توانائی اور طاقت کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کن کن ذرائع سے مہیا کر رہے ہیں ؟ وضاحت سے بیان کیجیے۔

باب ۱۸

سماجی بہبود

پاکستان ایک ایسی فلاحی مملکت ہے، جس کی بنیاد اسلام پر ہے - اسلام میں ہر شہری کے لیے سماجی تحفّظ کی ضمانت دی جاتی ہے - ہمارے ہاں بعض ایسے گروہ ہیں ، جنھیں سماجی تحفّظ کی خاص ضرورت ہے - ان میں سے سب سے اہم گروہ کارخانوں کے مزدوروں کا ہے - ان سے بھی بہت بڑا گروہ دیہی مزدوروں کا ہے ، جن کے پاس زمین نہیں - شہروں میں کم آمدنی والے طبقے ، بلکہ اوسط درجے کے طبقے کو بھی سماجی امداد کی ضرورت ہے - اس کام کے لیے ہر صوبے میں سماجی بہبود کا محکمہ قائم ہے اور پورے ملک میں اس کام کو منظم کرنے کے لیے مرکز میں سماجی بہبود کی ایک قومی کونسل بھی ہے - سماجی بہبود کے کام کو زیادہ تر رضاکار انجمنیں یا ادارے انجام دیتے ہیں - اس وقت ایسے اداروں کی مجموعی تعداد چار ہزار کے قریب ہے - ان کو حکومت سے بھی امداد ملتی ہے - حکومت کو اس کام کی اہمیت کا شدید احساس ہے - اسی لیے حکومت اس محکمے کے بجٹ میں برابر اضافہ کر رہی ہے -

سماجی بہبود کا کام زیادہ تر ایسے طبقوں میں کیا جاتا ہے جن کی اس کو خاص ضرورت ہو ، مثلاً ہماری سب سے اہم قومی ضرورت یہ ہے کہ ہم بچوں کی غور و پرداخت پر خاص توجہ دیں ، اس لیے بہبودی اطفال کی ایک کونسل قائم کی گئی ہے۔یہ کونسل اقوام متحدہ کے اس ادارے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے جسے یونی سیف

(Unicef) کہتے ہیں ۔ اس کونسل کی نگرانی میں بچوں کے لیے یتیم خانے کھولے جاتے ہیں جن میں ان کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی انتظام کیا جاتا ہے ۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے صدر مملکت کی جانب سے ہر سال کچھ انعام دیے جاتے ہیں ۔ یہ انعام ان بچوں کو ملتے ہیں جنھوں نے سال کے دوران کوئی جرأت مندانہ سماجی خدمت کی ہو یا کوئی اچھا مضمون یا تصویر تیار کی ہو ۔

ہمارے ہاں عورتوں کے طبقے میں سماجی بہبود کے کام کی اور بھی ضرورت ہے ۔ اس ضمن میں پاکستان میں ماں اور بچے کے تیس مرکزِ صحت قائم کیے گئے ہیں ۔ عورتوں کے لیے سلائی اور کشیدہ کاری کا کام سیکھنے کے مرکز اور نادار عورتوں کے لیے دارالخواتین قائم کیے گئے ہیں ۔ اس کام کو زیادہ تر اپوا (APWA) کی مختلف شاخیں کرتی ہیں ۔ پاکستان میں نوجوانوں کی تحریک سے بھی بہت دلچسپی لی جا رہی ہے ۔ اس کے تحت ان کے لیے تفریحی مرکز ، جسمانی تربیت یا کلچر کے ادارے اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مرکز قائم ہیں ۔ نوجوانوں میں کوہ پیمائی اور سیاحی کا شوق پیدا کرنے کے لیے پہاڑی علاقوں میں یوتھ ہوسٹل بنائے گئے ہیں ، جہاں ان کے قیام اور طعام کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ۔

ان کے علاوہ ملک میں بعض ادارے گدا گری اور نوخیز بچوں میں مجرمانہ رجحانات کے انسداد اور ان کی عمدہ تربیت کا کام کر رہے ہیں ۔ بہت سی رضا کار انجمنیں ، اندھے ، گونگے ، بہرے اور لنگڑے لُولے لوگوں کے لیے کام کر رہی ہیں ۔ کراچی میں اندھوں کے لیے کتابیں چھاپنے کا بریل پریس بھی قائم کیا گیا ہے ۔ معذور لوگوں کے لیے بہت سے شہروں میں ہاتھ کا کام سکھانے کے مرکز ہیں ، جن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دست و بازو سے روزی کمانے کی تربیت حاصل کرتے ہیں ، اور اس طرح آگے چل کر اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔ طلبا میں بوائے سکاؤٹ ایسوسی ایشن ، گرل گائڈز

اور ریڈ کراس کے ذریعے بھی سماجی خدمت کے جذبے کو تربیت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مزدوروں کی سماجی بہبود :

کارخانوں کے مزدور ملک کی صنعتی پیداوار میں اضافہ کر کے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں ، اس لیے ان کی سماجی بہبود اور فلاح پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ کارخانوں میں تیز رفتار مشینوں پر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس میں کبھی کبھی مزدور حادثے کے شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ایسی صورت میں مزدور کو معاوضہ تو دیا جاتا تھا ، لیکن اس معاوضہ کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اس معاوضے میں کافی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے مزدوروں کو بیماری کے دنوں کی چھٹی بغیر تنخواہ کے ملا کرتی تھی۔ اب انھیں یہ چھٹی با تنخواہ ملتی ہے ، اور اگر انھیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑے تو اس کا خرچ بھی کارخانے کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس طرح کام کرنے والی عورتوں کو طویل مدت کے لیے طبّی رخصت ملتی ہے ، پچھلے تین سال سے ہمارے ہاں مزدوروں کے لیے سماجی تحفّظ کی ایک سکیم جاری ہے ، جس کے تحت مزدوروں کر طبی امداد مہیا کرنے کے لیے ڈاکٹروں کا عملہ مقرر کیا گیا ہے اور اہم صنعتی شہروں میں دواخانے قائم کیے گئے ہیں۔ کراچی اور حیدر آباد میں مزدوروں کے لیے دو بڑے ہسپتال بھی تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ اس سکیم کے تحت صوبہ سندھ میں تین لاکھ ، پنجاب میں ایک لاکھ اور صوبہ سرحد میں ۲۵ ہزار مزدوروں کو طبی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ نئی پالیسی کے مطابق تمام مزدوروں کے لیے کم از کم تنخواہ کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ ہر کارخانے کی طرف سے مزدور کی زندگی کا بیمہ کرایا جائے گا اور اسے پنشن کی سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ مزدوروں کو کارخانے

کے منافع میں سے حصہ ملے گا اور انتظامیہ میں مزدوروں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کے لیے بھی، جو فوجی خدمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں، سماجی تحفظ کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

سوال

سماجی بہبود کی تنظیم کا کیا مقصد ہے اور وہ کیسے کام کرتی ہے ؟

عملی کام

کسی قریبی سماجی بہبود کے ادارے میں جا کر دیکھیں کہ یہ ادارہ کیسے کام کرتا ہے ؟ کون کون سے تربیتی پروگرام جاری ہیں اور تربیت پانے والوں کو ان سے کیا کیا فائدے پہنچنے کی توقع ہے ؟ ان کو ایک یاد داشت کی صورت میں مرتب کریں۔
آخر میں بتائیں کہ ان کو کس طرح بہتر اور مفید بنایا جا سکتا ہے ؟

باب ۱۹

بین الاقوامی تعلقات

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ چین اور اسلامی دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات تیزی سے بڑھ رہے ہیں - ان ملکوں کے ساتھ ہماری تجارت میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے - ہم ان کے ساتھ مل کر کئی ایک مشترکہ منصوبے بھی چلا رہے ہیں. ان سے ہمارے ثقافتی رابطے بھی گہرے ہوتے جا رہے ہیں - ان ملکوں کے ساتھ مل کر ہم بین الاقوامی سیاست میں ایک ایسی نئی قوت کی داغ بیل ڈال رہے ہیں ، جو چھوٹے ملکوں کے لیے امن و آشتی ، تحفظ اور سلامتی کا پیغام لا رہی ہے - پاکستان ، ایران اور ترکی نے آر-سی-ڈی قائم کرکے بین المملکتی تعاون کی ایسی مثال قائم کی ہے جو دوسرے ملکوں کے لیے بھی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے -

چین

چین کے ملک نے سیاست کے میدان میں ہی نہیں بلکہ اقتصادی اور صنعتی طور پر بھی ہماری امداد کی ہے، وہ دوسرے ملکوں کی امداد سے ممتاز ہے - چین نے ہمیں بہت بھاری قرضے بغیر سود کے دیے ہیں - اب تک ہم کارخانوں کی اور دوسری بھاری مشینیں باہر سے منگاتے رہے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی ملک اپنے کارخانوں کی مشینوں اور ان کے پرزوں کا دوسرے ملکوں کے لیے محتاج رہے گا وہ صنعتی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا - چین نے ہماری امداد کے لیے ٹیکسلا کا بھاری

مشینوں کا کارخانہ قائم کیا ہے اور اس کے لیے مالی امداد بھی دی ہے اور ماہرین کی خدمات بھی بہم پہنچائی ہیں ۔ اس کارخانے میں چینی کے کارخانوں کی مشینیں ، بڑے کرین ، سڑک کوٹنے والے انجن وغیرہ تیار ہوتے ہیں ۔ ٹیکسلا میں ایک کارخانہ بجلی کی بھاری مشینیں تیار کرنے کے لیے بھی لگ چکا ہے ۔ اس میں بجلی تیار کرنے والے بھاری ڈائنمو ، ٹرانسفارمر وغیرہ بنائے جائیں گے ۔

لیبیا :

افریقہ کے براعظم میں لیبیا کی مسلمان مملکت، مسلم دنیا میں ایک ممتاز حیثیت اختیار کر رہی ہے ۔ پچھلے دنوں تیل کی دریافت سے اس ملک کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور لیبیا کی حکومت، ملک کو صنعتی اور معاشرتی طور پر ترقی دینے کے لیے بڑے بڑے منصوبوں پر کام کر رہی ہے ۔ اس لیے حکومت لیبیا پاکستانی ماہرین سے کام لے رہی ہے اور انھیں تعمیرات ، طب اور دوسرے محکموں میں کام کے موقعے دے رہی ہے ۔

ہمارے اس ملک سے بہت گہرے تعلقات ہیں اور پاکستانی ماہرین نے اس ملک میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے ۔

لیبیا نے اقوام متحدہ میں بھی ہمارے موقف کی ہمیشہ پر زور تائید و حمایت کی ہے ۔

اس کے علاوہ افریقہ میں ہمارے ماہرین سوڈان ، صومالیہ وغیرہ میں بھی کام کر رہے ہیں ۔

پاکستان اقوام متحدہ کا رکن ہے ۔ اس ادارے میں دنیا کے ملک کئی ایک گروہوں میں تقسیم ہیں ۔ ایک گروہ بڑی طاقتوں اور ان کے حلیف ملکوں کا ہے ۔ دوسرا گروہ دولت مشترکہ کا ہے جس میں سلطنت برطانیہ اور اس کے ساتھی ملک شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ ایک گروہ مسلم ممالک اور ایسے چھوٹے ملکوں پر مشتمل ہے ، جو ہر قسم کے عدم تحفظ کا شکار ہیں ۔ پاکستان چونکہ دولت مشترکہ

سے علیحدہ ہو چکا ہے ، اس لیے اس کا شمار اس تیسرے گروہ میں ہی کیا جاتا ہے ۔ یہ گروہ قوموں کے مابین عدل و انصاف ، صلح و آشتی اور مشترکہ تحفظ کا علم بردار ہے ۔ اب تک اس گروہ کی آواز کا زیادہ اثر نہیں تھا ، لیکن جب سے چین اقوام متحدہ کا رکن بن گیا ہے اس گروہ میں ایک نئی خود اعتمادی کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے ۔

پاکستان نے اقوام متحدہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ پاکستان ہمیشہ نسلی منافرت اور استعمار کی مخالفت کرتا رہا ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا ، بہت سے مسلم ممالک استعماری سلطنتوں کے پنجے میں گرفتار تھے ۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر ان ممالک میں آزادی کی تحریکوں کی بھرپور حمایت کی ہے ۔ اس طرح آج کل جنوبی افریقہ اور روڈیشیا کی سفید فام حکومتیں ، وہاں کے افریقی باشندوں پر ہر قسم کی پابندیاں عاید کر رہی ہیں ۔ پاکستان نے اقوام متحدہ میں ان زیادتیوں کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے ۔

اقوام متحدہ نے جب کبھی عالمی امن کے لیے ٹھوس اقدامات کیے، پاکستان نے مکمل تعاون کا ثبوت دیا ۔ جب اقوام تحدہ نے کانگو میں امن قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی فوج کے دستے بھیجے تو ان میں پاکستان کی فوج بھی شامل تھی ۔ اس طرح پاکستان کے فوجی دستے نے انڈونیشیا کے جزیرے مغربی ایرین میں استصواب رائے کا انتظام کرنے میں امداد دی ۔

آج کل ایٹمی طاقتیں چھوٹے ملکوں کے لیے خطرے کا باعث بن گئی ہیں ۔ پاکستان نے دوسرے ملکوں کے تعاون سے غیر ایٹمی طاقتوں کی کانفرنس کی بنیاد ڈالی ، جس سے عالمی امن کے قیام میں بہت مدد مل سکتی ہے ۔ اگرچہ پاکستان نے ہر موقعے پر اقوام متحدہ کا ساتھ دیا ہے ، لیکن اب تک یہ ادارہ کشمیر میں استصواب رائے نہیں کرا سکا اور بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ مسئلہ ابھی تک

کھٹائی میں پڑا ہوا ہے ۔ بھارت نے پاکستان پر جو حملہ ۱۹۷۱ء میں کیا تھا اس معاملے میں بھی اقوام متحدہ نے قوت ارادہ اور قوت عمل کی کمزوری کا ایسا افسوس ناک مظاہرہ کیا ہے ، جس سے برصغیر ہی کا نہیں ، بلکہ پورے بحر ہند کے ملکوں کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے ۔

چین اور مسلم ممالک کے علاوہ ہمارے دوسرے ملکوں سے بھی اچھے تعلقات ہیں ۔ ان میں سرفہرست امریکہ کا نام آتا ہے ۔ امریکہ نے ہماری تمام ممالک سے زیادہ امداد کی ہے ۔ اس کے ساتھ ہم سینٹو کے معاہدے میں شریک ہیں ۔ امریکہ نے حال ہی میں ہمیں ۲۵ ملین ڈالر کی مالی امداد دی ہے اور مزید اقتصادی امداد دینے کا اعلان کیا ہے ۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہمارے تعلقات اور بھی گہرے ہو جائیں گے ۔ امریکہ عالمی بنک کے اس گروہ کا بھی رکن ہے جو پاکستان کو زر امداد مہیا کرتا ہے ۔ اس گروہ میں مغربی جرمنی ، جاپان ، کینیڈا وغیرہ کل دس ملک شامل ہیں ۔ ہمارے نئے منصوبوں کی تکمیل کے لیے امریکہ کے بعد ہمیں سب سے زیادہ امداد مغربی جرمنی ، کینیڈا اور جاپان سے ملی ہے ۔

فرانس بھی پاکستان کے امدادی ممالک میں شامل ہے ۔ اس ملک نے ہمیں فنی سہولتیں مہیا کی ہیں ۔ ہم نے مغربی جرمنی کی امداد سے سات منصوبوں کا آغاز کیا ہے ۔ کینیڈا کے تعاون سے ہم نے دریائے کابل پر وارسک بند بنایا ہے ۔ کینیڈا ہمیں تربیلا بند کی تکمیل میں بھی امداد دے رہا ہے ۔ سویڈن بھی ہمیں فنی امداد مہیا کر رہا ہے ۔ اس کی امداد سے ہم نے تین پولی ٹیکنیک سکول قائم کیے ہیں اور پاپولیشن پلاننگ کے کام کو ایک مستقل شکل دے دی ہے ۔ ہمیں صنعتی ترقی کے لیے جاپان نے بھی امداد دی ہے ۔

بحرہند کے بعض ملکوں مثلاً سری لنکا، ملائیشیا، ماریشس وغیرہ کے ساتھ بھی پاکستان نے بہترین تعاون کا ثبوت دیا ہے ۔ پاکستان نے جہاز سازی کے کام میں کافی ترقی کی ہے، اس لیے ۱۹۷۱ء میں سری لنکا کی قومی جہاز رانی کی کارپوریشن کے صدر اس غرض سے پاکستان آئے تھے کہ جہاز سازی اور جہاز رانی کے کام میں سری لنکا کے ساتھ مشترکہ طور پر کام کیا جا سکے۔ سری لنکا کے ساتھ ہمارے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے ہیں اور اس ملک کے ساتھ ہماری تجارت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے ۔

افریقہ کے ملک :

افریقہ کے مسلم ممالک کے علاوہ افریقہ کے دوسرے ممالک کے ساتھ بھی ہمارا گہرا رابطہ ہے ۔ پی ۔ آئی ۔ اے نے ایسٹ افریقین ائیرویز کے ساتھ معاہدہ کیا ہے، جس کی رو سے دونوں کمپنیاں ایک دوسرے کو خاص رعایتیں اور سہولتیں مہیا کرتی ہیں ۔ افریقہ کے ساتھ ہماری تجارت پاکستان کے لیے بہت منفعت بخش ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں ہم نے افریقی ملکوں کو ۲۵۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی اشیا برآمد کیں ۔ اس کے مقابلے میں ہم نے ان سے محض ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کی اشیا درآمد کیں ۔

افریقہ کے بہت سے ملکوں کے طلبا ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں ۔ ان میں سے اکثر کو حکومت پاکستان کی طرف سے وظائف بھی دیے جاتے ہیں ۔ نائیجیریا اور گھانا کے فوجی افسر ہمارے ہاں تربیت کے لیے آتے رہتے ہیں ۔ ہم نے تنزانیہ اور زیمبیا کو ٹیکنیکل امداد بھی دی ہے اور بعض ملکوں کے ساتھ مل کر مشترکہ صنعتی منصوبوں کو چلانے کی بھی تجویزیں زیر غور ہیں ۔ لیبیا کے ساتھ ہمارے تعلقات برادرانہ ہیں ۔

جنوبی امریکہ کے ملکوں کے ساتھ ہماری تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے اور پچھلے دس سالوں میں ان ملکوں کے لیے ہماری برآمدات

میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔

ہماری ہوائی کمپنی نے بھی بین الاقوامی تعلقات کو بڑھانے اور پھیلانے میں بڑی مدد دی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہم نے ہوائی سفر کی سہولتوں کو ترقی دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ ہمارے ہوا بازوں کا شمار دنیا کے بہترین ہوا بازوں میں ہوتا ہے۔ پی۔ آئی۔ اے (پاکستان انٹر نیشنل ایر لائنز) کے جہازوں نے پاکستان کو دور دور کے ملکوں سے ملا دیا ہے۔ اس کے جیٹ طیارے تہران، بیروت، اور روم ہوتے ہوئے لندن پہنچتے ہیں۔ خلیج فارس میں یہ طیارے کویت، بحرین، دوبئی اور ابوظہبی کو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے پہلے چین کے لیے کوئی سروس نہیں تھی۔ اس سال پی۔ آئی۔ اے نے پہلی مرتبہ چین کو ہوائی راستے کے ذریعے باہر کی دنیا سے ملا دیا۔ یہ جہاز کراچی سے رنگون اور بنکاک کے راستے کانٹن اور شنگھائی پہنچتے ہیں۔ اب پی۔ آئی۔ اے نے کانٹن اور نیویارک کے درمیان ایک نئی سروس کا آغاز کیا ہے جس سے امریکہ اور چین کے مابین ہوائی سفر کی آسانیاں ہو جائیں گی۔ ہمارے مشاق ہوا باز اسلام آباد سے سیدھے اڑان کر کے، قراقرم کے کوہستانی سلسلے کے اوپر سے چار پانچ گھنٹے میں پیکنگ پہنچ جاتے ہیں۔ چونکہ آر۔ سی۔ ڈی کے ادارے کی وجہ سے ہمارا ایران اور ترکی کے ساتھ بہت گہرا رابطہ ہے، اس لیے اسلام آباد اور انقرہ کے مابین بھی ایک خصوصی ہوائی سروس جاری ہے۔

چونکہ پاکستانی ہوا باز دنیا کے بہترین ہوا بازوں میں شمار ہوتے ہیں، اس لیے اکثر ممالک اپنے لوگوں کو ہوائی تربیت کے لیے ہمارے ہاں بھیجتے ہیں۔ ہمارے ہوا بازی کے تربیتی سکول میں چین، نیپال، ایران، نائیجیریا وغیرہ کے ہوا باز ٹریننگ کے لیے آتے رہے ہیں۔ ہم نے سعودی عرب اور اردن کو بھی ہوائی تربیت کی خاص سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ کراچی میں پی۔ آئی۔ اے کی ورکشاپ،

سیلون ائیرویز کے جہازوں کی صفائی اور مرمت کا کام بھی کرتی ہے۔

ہمارا بحری بیڑا بھی بین الاقوامی تعلقات کی نئی شاہ راہیں کھول رہا ہے۔ ہماری تجارت زیادہ تر سمندر کے راستے ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں تجارتی جہازوں کا بیڑا بنانا پڑا ہے۔ شروع میں ہمارے پاس صرف تین تجارتی جہاز تھے، جن کی مجموعی کھپت ساڑھے ۱۸ ہزار ٹن تھی۔ لیکن جوں جوں ہماری تجارت اور صنعت کو ترقی ہوتی گئی، ہمیں اپنے تجارتی بیڑے میں توسیع کرنی پڑی۔ اس وقت ہمارے پاس ۴۷ تجارتی جہاز ہیں، جو دور دراز ملکوں تک سامان تجارت لے جاتے اور وہاں سے ان ممالک کا مال اپنے ملک میں لاتے ہیں۔

ہمارے جہاز دنیا کے کونے کونے میں جاتے ہیں۔ وہ یورپ، امریکہ اور کینیڈا تک پہنچتے ہیں۔ مشرق میں سری لنکا، انڈونیشیا، چین اور جاپان تک جاتے ہیں۔ بحیرہ عرب میں وہ خلیج فارس، ایران اور سعودی عرب کی بندرگاہوں کا سفر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں غیر ملکی جہازوں کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا تھا، لیکن اب ہمارے تجارتی بیڑے کی وجہ سے ہمیں تجارت میں بڑی آسانیاں ہو گئی ہیں اور اس طرح ہمیں کوئی ۱۶ کروڑ روپے سالانہ زرمبادلہ کی بچت ہو رہی ہے۔

جہاز رانی کی ترقی کے لیے نیشنل شپنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ ہم جہاز رانی کے میدان میں .R.C.D کے تحت ایران اور ترکی سے اشتراک کر رہے ہیں۔ جہاز رانی کے اس ادارے کے دفاتر استنبول میں ہیں۔ اس ادارے کے بیڑے میں سب سے زیادہ جہاز ترکی کے ہیں اور اس کے بعد پاکستان کے۔ یہ جہاز زیادہ تر امریکہ جاتے اور ان تینوں ملکوں کا تجارتی مال امریکی بندرگاہوں پر پہنچاتے ہیں۔

چین اور پاکستان کے درمیان جہاز رانی کے لیے ہم چین کی جہاز ران کمپنی سے اشتراک کر رہے ہیں۔ امید ہے مستقبل قریب

میں چین اور پاکستان کے مابین سروس کو افریقہ تک توسیع دے دی جائے گی ۔

سوالات

١ - پاکستان نے بین الاقوامی تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے کیا کردار انجام دیا ہے ؟ وضاحت سے بیان کیجیے ۔

٢ - کن کن ممالک نے پاکستان کی ترقی میں مالی اور فنی امداد دی ہے ؟

٣ - مسلم ممالک سے ہمارے تعلقات کیسے ہیں ؟

٤ - پاکستان انٹر نیشنل ائیر لائنز (پی ۔ آئی ۔ اے) نے کیا خدمات انجام دی ہیں ؟

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ و منظور شدہ
بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن
لاہور، بموجب سرکار نمبر 3228—SE/G Dated 8/4/72
ملتان، بموجب سرکار نمبر SY (SSC)—3/ASG/72 Dated 1/4/72
سرگودھا، بموجب سرکار نمبر 1538—2138 Dated 8/4/72

قومی ترانہ

پاک سر زمین شاد باد کِشورِ حَسِین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سر زمین کا نظام قُوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت پایندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد اشاعت	قیمت
مارچ 1975	دوم	50,000	Rs. 4.90

کوڈ نمبر G 139 سیریل نمبر